پاکستان ورچوئل لائبریری کی پیشکش

عالمی شہرت یافتہ پاکستانی

# گلوکار اور گلوکارائیں

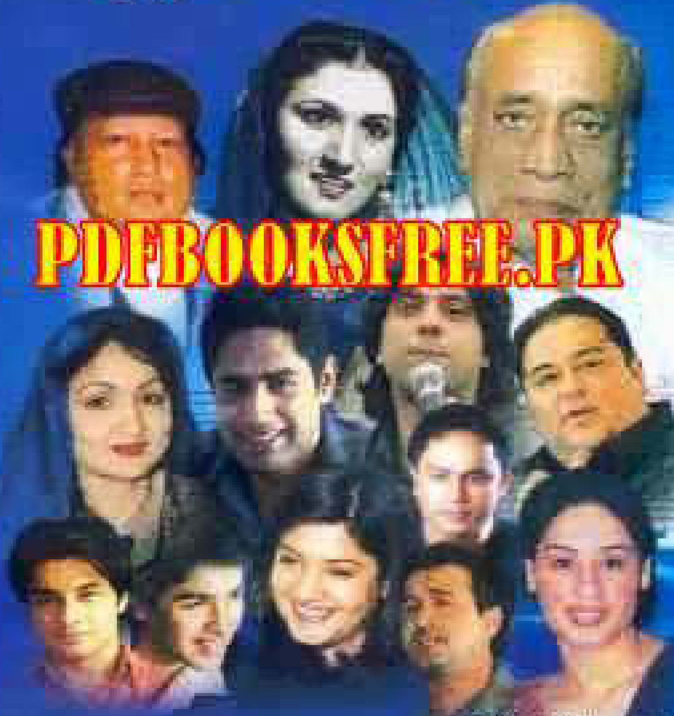

PDFBOOKSFREE.PK

تحریر، تحقیق و ترتیب
محمد اسلم لودھی

www.pdfbooksfree.pk

# عالمی شہرت یافتہ پاکستانی گلوکار اور گلوکارائیں

تحریر، تحقیق و ترتیب
محمد اسلم لودھی

وفا پبلی کیشنز
882\8-B مکہ کالونی گلبرگ لاہور 042-5759534
اور
کمرہ نمبر 15 سیکنڈ فلور جلال دین وقف (حبیب بینک) بلڈنگ
چوک اُردو بازار لاہور 042-7357017 /// 042-7353561
WWW. UrdubooksWafaPublications.Com
E-Mail: info@UrdubooksWafaPublications.Com
WafaPub@Yahoo.Com and Lodhi1954@hotmail.Com

# جملہ حقوق بحق مصنف و ادارہ محفوظ ہیں



| | |
|---|---|
| ناشر: | وفا پبلی کیشنز |
| نام کتاب: | عالمی شہرت یافتہ پاکستانی گلوکار اور گلوکارائیں |
| سن اشاعت: | 2006 |
| تعداد: | 1000 |
| پرنٹر: | شرکت پرنٹنگ پریس |
| قیمت: | -/250روپے |
| بیرون ملک قیمت | 10ڈالر |



## عشق کا شین

کتاب گھر پر **عشق کا عین** پیش کرنے کے بعد اب پیش کرتے ہیں **عشق کا شین** ۔ عشق مجازی کے ریگزاروں سے عشق حقیقی کے گلزاروں تک کے سفر کی روداد...... علیم الحق حقی کی لازوال تحریر۔ **عشق کا شین** کتاب گھر کے **معاشرتی رومانی ناول** سیکشن میں پڑھا جا سکے گا۔

# فہرست مضامین


| | | |
|---|---|---|
| 1 | انتساب نازیہ حسن اور زوہیب حسن کے نام | 5 |
| 2 | تمہید | 7 |
| 3 | اسلامی تعلیمات اور موسیقی | 9 |
| 4 | موسیقی روح کی غذا یا روح کی سزا | 12 |
| 5 | جدید موسیقی اور ہماری تہذیب وثقافت | 14 |
| 6 | کلاسیکل موسیقی کی روایت دم توڑ رہی ہے۔ | 18 |
| 7 | نامور کلاسیکل گائیک اُستاد سلامت علی خاں | 22 |
| 8 | برصغیر پاک وہند کے عظیم گلوکار مہدی حسن | 25 |
| 9 | مایہ ناز لوک گلوکار عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی | 32 |
| 10 | صوفیانہ طرز کا منفرد گلوکار شوکت علی | 40 |
| 11 | عظیم غزل گو غلام علی | 46 |
| 12 | جدید گائیکی کا معمار نصرت فتح علی خاں | 52 |
| 13 | پرائیڈ آف فارمنس گلوکار اور انجینئر ڈاکٹر امجد پرویز | 56 |
| 14 | اے نیر | 60 |
| 15 | سلمان علوی | 62 |
| 16 | مجیب الرحمٰن | 66 |


## ہر دلعزیز پاکستانی پاپ گلوکار


| | | |
|---|---|---|
| 17 | سلمان احمد | 74 |
| 18 | ابرار الحق | 77 |
| 19 | جواد احمد | 91 |
| 20 | علی ظفر | 102 |
| 21 | ہارون | 109 |
| 22 | شہزاد رائے | 111 |

| | | |
|---|---|---|
| 23 | عدنان سمیع | 114 |
| 24 | رحیم شاہ | 117 |
| 25 | فاخر محمود | 119 |
| 26 | سجاد علی | 125 |
| 27 | عاطف اسلم | 131 |
| 28 | رفاقت علی خان | 133 |
| 29 | وارث بیگ | 138 |
| 30 | جنید جمشید | 140 |
| 31 | سلیم جاوید | 146 |
| 32 | نجم شیراز | 149 |
| 433 | عامر سلیم | 157 |
| 34 | شیراز اپل | 160 |
| 35 | شارق روحی | 163 |
| 36 | عدیل برکی | 167 |
| 37 | ناصر سلمان | 169 |


## عالمی شہرت یافتہ پاکستانی گلوکارائیں


| | | |
|---|---|---|
| 38 | ملکہ ترنم نور جہاں | 172 |
| 39 | زبیدہ خانم | 188 |
| 40 | نازیہ حسن | 190 |
| 41 | حمیرا ارشد | 192 |
| 42 | فریحہ پرویز | 202 |
| 43 | شبنم مجید | 204 |
| 44 | شازیہ خشک | 206 |
| 45 | عابدہ پروین | 212 |
| 46 | حمیرا چنا | 215 |
| 47 | شاہدہ منی | 222 |
| 48 | استفادہ | 225 |

# انتساب

## پہلی پاپ سنگر نازیہ حسن کے نام

اگر یہ کہا جائے کہ۔

پاپ میوزک کو پاکستان میں متعارف کروانے کا سہرا بلا شبہ نازیہ حسن اور اُن کے بھائی زوہیب حسن کے سر ہے تو یہ غلط نہ ہوگا۔
کالے بالوں اور براؤن آنکھوں والی گلوکارہ نازیہ حسن نے انتہائی مختصر عرصے میں موسیقی کی دنیا میں جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی وہ بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے۔ نازیہ اور زوہیب نے نہ صرف پاکستان بلکہ بھارت میں بھی پاپ میوزک کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

نازیہ حسن 3 اپریل 1963ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں اور لندن میں تعلیم حاصل کی۔ سائنس میں گریجوایشن اور بار ایٹ لاء کرنے کے بعد اقوام متحدہ کے ایک ادارے میں سیاسی تجزیہ نگار کے عہدے پر فائز تھیں۔ نازیہ حسن انتہائی قابل اور ذہین تھیں۔ تعلیم کا میدان ہو شعبہ گلوکاری یا اقوام متحدہ کی ملازمت نازیہ نے ہر جگہ خود کو منوایا۔ جب تک وہ تعلیم کے حصول کے لئے سرگرداں رہیں ہر امتحان میں اچھے نمبروں اور اعلیٰ پوزیشن کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ نازیہ حسن نے جب گلوکاری کے میدان میں قدم رکھا تو ایسی دھوم مچائی کہ نہ صرف پاکستان بلکہ بھارت اور انگلینڈ میں اپنے چاہنے والوں کی ایک بڑی تعداد پیدا کر لی اور جب اقوام متحدہ کی ملازمت کی تو منفرد کارنامے انجام دیے۔

وہ لاکھوں افراد کی پسندیدہ گلوکارہ اور پاکستان میں بلا شبہ پاپ سنگنگ کی بلا شرکت غیرے ملکہ تھیں۔ نازیہ حسن کو اس جہاں سے رخصت ہوئے 5 سال بیت چکے ہیں مگر وہ اپنی خوبصورت آواز اور گیتوں کی بدولت آج بھی اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ نازیہ حسن گلوکاری کے میدان میں کوئی منصوبہ بندی کر کے نہیں آئی تھیں۔ انہوں نے گلوکاری شوقیہ طور پر سیکھی مگر 1978ء میں ہونے والی ایک تقریب کے دوران بھارتی اداکارہ فیروز خان سے ہونے والی ملاقات انہیں پروفیشنل گلوکاری کی طرف سے آئی۔ جن کی فلم ''قربانی'' کے لئے نازیہ نے اپنا مشہور گیت ''آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے تو بات بن جائے'' ریکارڈ کروایا۔ یہ گیت جب ریلیز ہوا تو اس نے ہر طرف دھوم مچا دی اس گیت کو گانے والی یہ نوعمر لڑکی دیکھتے ہی دیکھتے شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ نازیہ نے جب یہ گیت گایا تو ان کی عمر 15 برس تھیں۔

1984 میں نازیہ حسن کا ایک البم بوم بوم ریلیز ہوا جس نے نازیہ کی شہرت اور مقبولیت میں حد درجہ اضافہ کر دیا۔ یہ البم مشرق و مغرب کے کلچر کا حسین امتزاج تھا۔ اس کے بعد گیارہ سال بعد 1995 میں انڈین چینل ایم ٹی وی پر نازیہ کا دوسرا البم ریلیز ہوا۔ نازیہ کے ساتھ پاکستانی کمپوزر اللہ دتہ نے بھی کام کیا جبکہ ارشد محمود نے کول کول کمپوز کیا۔ یہ دونوں گیت میوزک کی دنیا میں اس قدر مقبول ہوئے کہ ان کا تقابل آج کے کسی بھی البم سے نہیں کیا جا سکتا۔ نازیہ حسن کا آخری گیت ''ٹاہلی دے تھلے بہہ کے'' تھا جو آج بھی ہمارے کانوں میں رس گھول رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نازیہ حسن پاکستانی میوزک کا بہت بڑا اثاثہ تھیں۔ نازیہ کی ان کامیابیوں میں ان کے بھائی زوہیب حسن کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ دوسرے

لفظوں میں ان دونوں موسیقی کی دنیا میں ایک رجحان ساز گلوکار کی حیثیت سے اہم کارنامے سرانجام دیئے۔ جو اس شعبے میں آنے والے نئے گلوکاروں کے لئے درست راہوں کا تعین کرتے رہیں گے۔

لیکن بہن نازیہ حسن کے مرنے کے بعد زوہیب حسن بھی گائیکی کی دنیا میں مزید کوئی سنگ میل طے نہیں کر سکے بلکہ زوہیب نے بہن کی رحلت کے بعد ہمیشہ کے لئے میوزک سے ناطہ توڑ لیا۔ اب وہ گائیکی کی دنیا میں اپنا کریئر بنانے کی بجائے انگلینڈ کی معروف تعمیراتی فرم میں اپنے والد اور بھائی کے ساتھ مصروف عمل ہے۔ زوہیب کا سب سے مشہور البم "قسمت" کے نام سے مقبول ہوا۔

اس کے باوجود کہ نازیہ حسن اب اس دنیا میں نہیں اور زوہیب حسن پاپ موسیقی کی دنیا کو عملی طور پر خیر باد کہہ چکے ہیں۔ پاپ میوزک کے لئے ان کی گراں قدر خدمات کو کسی بھی صورت میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ میری ذاتی رائے میں یہیں دونوں بہن بھائی پاکستان میں پاپ میوزک کے بانی تصور کئے جائیں گے۔ ان کی انہی خدمات کے حوالے سے اس کتاب کا انتساب نازیہ حسن اور زوہیب حسن کے نام کیا جا رہا ہے۔ جو آج بھی ہر پاکستانی کے دلوں میں زندہ ہیں۔


# کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجیے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ http://kitaabghar.com کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچایئے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجیے۔

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

# تمہید

جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی طرح ثقافتی سرحدوں کے محافظ بھی ہر ملک میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ان ثقافتی سفیروں میں ایسے گلوکار اور گلوکارائیں بھی شامل ہوتی ہیں جو اپنے فن سے نہ صرف اپنے ملک کی تہذیب' کلچر اور ثقافت کی کما حقہ نمائندگی کرتے ہیں بلکہ موسیقی کا سہارا لے کر اپنے ہم وطنوں کے کانوں میں رس گھول کر ان کے دلوں میں صدیوں تک راج کرتے ہیں۔ ایسے ہی گلوکاروں میں مہدی حسن' نصرت فتح علی خاں۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی، غلام علی' شوکت علی، عابدہ پروین شامل ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ملکہ ترنم نور جہاں، زبیدہ خانم، نسیم بیگم، مالا، مسرت نذیر، مسعود رانا، احمد رشدی، مجیب عالم جیسے گلوکار موسیقی کی دنیا پر چھائے رہے جن کے آنے والے ہر نئے گانے کو شائقین نے گراموفون پر سنا۔ آج جس طرح ریڈیو، ٹی وی اور ٹیپ اور سی ڈیز ریکارڈر پر باسانی من پسند گانے سنے جاسکتے ہیں۔ آزادی کے ابتدائی تیس سالوں تک یہ سہولت موسیقی کے شائقین کو ہرگز حاصل نہ تھی۔ بلکہ من پسند گانا سننے کے لیے کسی کسی گھر میں گراموفون نامی ریکارڈ بجانے والی مشین ہوا کرتی تھی۔ پھر اس مشین پر گھوم کر آواز نکالنے والے ''توا'' نما ریکارڈ خریدے جاتے۔ اس کے علاوہ سوئیوں سے بھری ہوئی ایک ڈبی خریدی جاتی' اس ڈبی پر عموماً کتے کی تصویر بنی ہوتی۔ ایک سوئی سون بکس کے آخری حصے میں نصب کر کے چابی سے پہلے اسے گھومایا جاتا۔ جب ریکارڈ تیزی سے گھومنے لگتا تو سون بکس پر نصب سوئی کو نہایت آہستگی کے ساتھ ریکارڈ کے ابتدائی حصے پر رکھ دیا جاتا۔ تب گانے کی آواز کانوں میں رس گھولنے لگتی۔ اگر کسی گلوکار یا گلوکارہ کا ریکارڈ بازار میں نیا آتا تو پہلے سے لوگوں میں اس کی دھوم مچ جاتی اور لوگ انتہائی کم آمدنی کے باوجود نیا ریکارڈ اور سوئیوں کی ڈبی ضرور خریدتے تاکہ فرصت کے لمحات میں موسیقی سے لطف اندوز ہوا جاسکے۔

بہرکیف بعدازاں جب بھارت میں محمد رفیع' لتا، آشا بھوسلے، کشور کمار کی آواز کا جادو سروں پر چڑھ کر بولنے لگا تو پاکستانی گھروں، ہوٹلوں، بسوں، ٹرکوں، حتیٰ کہ ہر میوزک شاپس پر بھارتی گلوکاروں کے گائے ہوئے گانے نہایت شوق اور ذوق سے سنے جانے لگے۔ اس کے باوجود کہ ہم بھارت سے 1965ء اور 1971ء کی جنگیں لڑ چکے تھے شکست دینے اور شکست کھانے کی لذت سے آشنا ہو چکے تھے۔ دلوں میں بھارت کے خلاف سخت نفرت کے باوجود ہر گھر میں موجود ریڈیو سے آل انڈیا ریڈیو پر نشر ہونے والے بھارتی گانوں کے پروگرام بڑے شوق سے سنے جاتے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ رات کو انڈین ریڈیو پر یادش بخیر نامی موسیقی کا پروگرام نشر ہوا کرتا تھا۔ ہم باقاعدگی سے ایک بینڈ کے ریڈیو پر اس پروگرام میں نشر ہونے والے پرانے گانے سن کر سویا کرتے تھے۔ حالانکہ انڈین گانے بالخصوص محمد رفیع اور لتا کے تقریباً سبھی گانے مجھے بے حد پسند تھے لیکن ایک چیز مجھے اکثر پریشان کرتی کہ ایک طرف ہم بھارت کو اپنا دشمن نمبرون قرار دیتے ہیں اور اس میں شک بھی کوئی نہیں کیونکہ جب بھی بھارت کو موقع ملا اس نے پاکستان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی دوسری طرف ہمارے گھروں' بازاروں' ہوٹلوں حتیٰ کہ سڑکوں پر دوڑنے والی بسوں اور ٹرکوں سے انڈین گانے ہی اکثر سنائی دیتے ہیں۔ بار بار دل میں احساس ابھرتا کہ بھارتی موسیقی اور گلوکاروں کا یہ طلسم آخر کب ٹوٹے گا اور کونسے گلوکار پاکستانیوں کے دلوں پر لگنے والی بھارتی گلوکاروں کی چھاپ ختم کرنے کی جستجو کریں گے۔

پھر اچانک موسیقی کی دنیا میں جنبش پیدا ہوئی۔ نازیہ حسن اور زوہیب حسن نے 1978ء کے عشرے میں پاپ موسیقی کی دنیا کا ایک نیا گانا ریکارڈ کرایا جس کے بول تھے '' آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے تو بات بن جائے''

منفرد میوزک کے حامل اس گانے نے موسیقی کے شائقین کو اپنی طرف زبردستی راغب کیا۔ بات اگر یہیں رک جاتی تو ختم ہو جاتی لیکن اچانک ایچی سن کالج کا ایک خوبرو نوجوان ٹیچر' موسیقی کی دنیا میں حادثاتی طور پر آ دھمکا اس نے انتہائی منفرد انداز میں ایک ایسا پنجابی طرز کا فوک گانا ریکارڈ کروایا جس کے بول تھے'' کنے کنے جاناں ایں بلو دے گھر '' اس گانے نے موسیقی کی دنیا میں تہلکہ مچا کے رکھ دیا۔ جوں جوں منفرد اور خوبرو گلوکار ابرار الحق موسیقی کی دنیا میں آگے بڑھتا رہا۔ پاکستانیوں کے دلوں پر بھارتی موسیقی کا طلسم کم سے کم ہوتا چلا گیا۔ اور لوگ ابرار الحق کے گانے

اتنے شوق اور ذوق سے سننے لگے جیسے انہیں سننے کے لیے کسی مقدس کتاب میں تاکید کی گئی ہو۔

بھارتی ثقافتی سرحدوں پر یلغار کرنے والا ابرارالحق کا حوصلہ اس وقت اور بڑھا جب جواد احمد، شہزاد رائے، علی ظفر، وارث بیگ، فاخر محمود، سجاد علی، رحیم شاہ، جنید جمشید، نجم شیراز، ہارون اور خواتین میں حمیرا ارشد، فریحہ پرویز، شبنم مجید، شازیہ منظور، شازیہ خشک، حدیقہ کیانی، سائرہ نسیم جیسی گلوکارائیں بھی موسیقی کے میدان میں اپنی اپنی منفرد آوازوں سے فن کا جادو جگانے لگیں۔

بے شک میں بھی دلوں پر اثر کرنے والے ان گلوکاروں اور گلوکاروں کو بڑے شوق سے سنتا ہوں لیکن مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ اب ہمارے گھروں، ہوٹلوں، میوزک شاپس، سڑکوں پر دوڑنے والی بسوں اور ٹرکوں میں بھارتی گلوکاروں کے گانے گونجنے کی بجائے کہیں ابرارالحق کو سنا جا رہا ہے کہیں جواد احمد کے دیوانے اس کی مدھر آواز سے انجوائے کر رہے ہوتے ہیں۔ کہیں شہزاد رائے اپنی آواز کا جادو جگا رہا ہوتا ہے۔ کہیں رحیم شاہ اپنے خوبصورت گیتوں سے لوگوں کو مسحور کر رہا ہے کہیں حمیرا ارشد، ڈھولنا ڈھولنا جدوں پیار کے نال پائی دا'' گا کر اپنی خوبصورت جسمانی ساکھ اور آواز سے دلوں میں گھر کر رہی ہوتی ہے تو کہیں فریحہ پرویز پتنگ باز سجناں سے مخاطب ہو کر انہیں پتنگیں اڑانے پر آمادہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ (عام رائے کے مطابق پتنگ بازی کے فروغ کے نتیجے میں جتنے بھی انسانوں کی گردنیں کٹیں اُن کا عذاب فریحہ پرویز کے سر ہے کیونکہ نوجوان نسل کو بگاڑنے اور پتنگ بازی کی طرف لانے کے ضمن میں اُس کی آواز اداؤں اور گیت کا بہت عمل دخل رہا ہے۔)

کہیں حدیقہ کیانی ''بوھے باریاں'' کا خوبصورت گیت گا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے تو کہیں شبنم مجید کی پرکیف آواز لذت کے نئے جہانوں آشنا کر رہی ہوتی ہے شازیہ منظور کی آواز تو اتنی اچھی ہے کہ اس کے گائے ہوئے گانے غم کے ڈوبے ہوئے سمندر میں بھی انسان کو خوشیاں اور سکون فراہم کرتے ہیں۔ اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ڈاکٹر ندیم الحسن گیلانی' جواد احمد' میجر اسرارالحق' حمیرا ارشد' محمد عارف' محمد عامر' شہزاد رائے' ہارون' عاصم نثار' محمد اشرف لودھی' محمد ارشد لودھی' محمد شاہد لودھی اور محمد زاہد لودھی کا گراں قدر تعاون حاصل رہا جبکہ اس کتاب کی خوبصورت کمپوزنگ عاصم اور عظیم نے کی۔

یہ کتاب شاید میں مرتب نہ کرتا کیونکہ دین اسلام میں موسیقی کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے اور میرا موقف بھی یہی ہے لیکن عام لوگ اسے روح کی غذا بھی قرار دیتے ہیں۔ جنید جمشید جس کو اللہ تعالیٰ نے موت کی گھڑی آنے سے پہلے ہدایت کی روشنی مرحمت فرمائی ہے اس نے بہت خوب کہا کہ موسیقی کی بجائے اللہ تعالیٰ کا ذکر روح کی غذا ہے میری رائے میں یہی سچ ہے جس سے ہم مختلف حیلے بہانوں سے اپنا پہلو بچاتے آئے ہیں اور اب بھی بچا رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب ترتیب دینے پر خدائے بزرگ و برتر سے دل کی گہرائیوں سے معافی مانگتا ہوں اور دست بستہ التجا کرتا ہوں کہ اے خالق کائنات اگر یہ تخلیقی اور تحقیقی کام بُرا لگے تو میرے اس فعل کو اپنی رحمت کے وسیلے سے معاف کر دینا۔ کیونکہ مجھے ہر وہ شخص اچھا لگتا ہے جو میرے ملک کی نظریاتی جغرافیائی اور ثقافتی سرحدوں کی حفاظت کے لیے خلوص دل سے کاوشیں کرتا ہے میں نے یہ تحقیقی کام وطن کی محبت میں ڈوب کر کیا ہے۔ تو غفور و رحیم ہے میں تجھ سے تیری رحمت اور سرپرستی کی آرزو رکھتا ہوں۔

بے شک تو جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے اور جسے چاہتا ہے برائیوں کے سمندر میں دھکیل دیتا ہے۔ میں اس شر سے تیری پناہ کا طلب گار ہوں کیونکہ مجھے ایک نہ ایک دن تیرے روبرو حاضر ہونا ہے۔ اس لیے میں کوئی ایسا کام کرتا ہوا ڈرتا ہوں جو تجھے ناگوار گزرے۔ میں دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنے تمام گناہوں کی معافی کا خواستگار ہوں۔ مجھے نبی کریم ﷺ اور میری ماں کی دعاؤں کے وسیلے سے معاف کر دینا۔

ناچیز
تحقیق کار محمد اسلم لودھی

# اسلامی تعلیمات اور موسیقی

(موسیقی شیطان کا ہتھیار ہے جس کے ذریعے وہ انسان کو سیدھی راہ سے بھٹکانے کا کام لیتا ہے)

استفزز منِ استطعت منھم بصوتک۔(بنی اسرائیل آیت 64)

امام مجاہد فرماتے ہیں: (بصوتک) یعنی الغناء والمزامیر

صوت سے مراد گانا اور مزامیر ہے۔

ابن عباس فرماتے ہیں:

صوتہ دعاء کل داع الی معصیۃ اللہ یعنی ہر وہ پکار جو انسان کو گناہ اور نافرمانی کی طرف بلائے۔(الطبری 15\118 ال بغوی 3\128، القرطبی 10\187، روح المعانی 15\111)

(البحر المحیط 6\58، رازی 21\6)

ان دونوں اقوال سے مراد ہے کہ گناہ کی طرف بلانے والی چیزوں میں سب سے بڑھ کر گانا ہے۔ یہ شیطان کا ہتھیار ہے جس کے ذریعہ وہ نوع انسانی کو سیدھے راستے سے بھٹکانے کا کام لیتا ہے۔ گویا آواز سے مراد پُر فریب دعوت، یا گانے موسیقی اور لہو ولعب کے دیگر آلات ہیں جن کے ذریعہ شیطان بکثرت لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے اور قرآن کریم نے شیطان کے رستوں کی پیروی سے روکا ہے۔ اب اس حقیقت کو ماہرین نفسیات نے بھی تسلیم کیا ہے کہ انسان کے جنسی جذبات کو ابھارنے میں آواز اہم کردار ادا کرتی ہے۔

ہیولاک ایلس لکھتا ہے: ''انسان کے جنسی جذبات کو بیدار کرنے میں آواز نیز موسیقی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس موضوع پر موٹ (Moot) کی رائے سے اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ قوت سامعہ کے ذریعے جنسی اکساؤ جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ واقع ہوتا رہتا ہے''۔(عبدالماجد دریا آبادی: انگریزی تفسیر جلد 2، ص: 272)

## 3- عباد الرحمٰن کی صفت:

لا یشھدون الزود (الفرقان آیت: 72) وہ بے ہودہ باتوں میں شریک نہیں ہوتے۔

قال محمد بن الحنفیۃ: لا یشھدون الزود الھو والخناء

محمد بن الحنفیہ نے الزور سے مراد غناء لیا ہے۔(الوسیط جلد 3، ص: 54)

امام مجاہد نے اس کی تفسیر غناء سے کی ہے (قرطبی جلد 7۔ص 54

امام ابن جریر ''الزود'' کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''آیت کی تفسیر میں اولی اور زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ عام معنی مراد لیے جائیں اور کہا جائے کہ عباد الرحمٰن کسی بھی قسم کے باطل کام میں شریک نہیں ہوتے خواہ وہ شرک ہو یا غناء یا کوئی اور کام جس پر ''الزود'' کا اطلاق کیا جاسکے۔(جلد 19، ص: 29) امام قرطبی نے ایسے اشعار جس میں

خوبصورت شکلوں اور شراب وغیرہ کی تعریف کی جائے کو بھی اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

4- افمن هذالحدیث تعجبون ٭ ولا تبکون ٭ وانتم سامدون. (سورة النجم آیت ۵۹ تا ۶۱)

سمود گانے کو کہتے ہیں۔علامہ ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

روی عن ابن عباس انه قال السمود الغناء لغة حمیر یقال اسمدی لنا غنی لنا ویقال لمخنیة اسمدینا ای الهینا بالغناء۔

یعنی حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ سمود کے معنی گانا ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ یہ حمیری لغت ہے چنانچہ "اسمدی لنا" کے معنی ہیں غنی لنا اور جب کسی گانے والی سے کہا جاتا ہے اسمدینا تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ہمیں گانا سنا کر مست کردو۔(لسان العرب جلد 4،ص:204)

## احادیث:

نبی کریم ﷺ نے بھی غناء کے اثرات سے اپنی امت کو آگاہ فرمایا ہے۔اس سلسلہ میں آپ کے چند ارشادات عالیہ درج ذیل ہیں:

1- عنقریب میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو زنا، ریشم، شراب اور باجوں کو حلال سمجھیں گے۔(صحیح بخاری)

2- حضرت نافعؒ سے مروی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے ایک مرتبہ ایک چرواہے کی بانسری کی آواز سنی تو اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ڈال لیں اور رستے سے دور ہٹ گئے پھر کہنے لگے نافع آواز آرہی ہے؟ میں نے عرض کیا جی، آپ چلتے رہے حتی کہ میں نے عرض کیا کہ اب آواز نہیں آرہی، تو آپ نے اپنے کانوں سے ہاتھ اٹھالیے پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ C کو دیکھا کہ آپ نے چرواہے کی بانسری کی آواز سن کر ایسا ہی کیا تھا۔(ابوداؤد، ابن ماجہ، مسند احمد)

3- حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالی نے شراب، جوئے اور طبل کو حرام کیا ہے نیز ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔(ابوداؤد، ابن حبان، بیہقی)

غناء کے نقصانات: روحانی، مادی، فکری، سیاسی اور طبی حوالہ سے گانے بجانے کے نہایت دوررس اثرات ہیں۔ان نقصانات کا ایک اجمالی جائزہ درج ذیل ہے۔

1- گانے بجانے کا تعلق فحاشی سے ہے اور اس کو اللہ تعالی نے حرام قرار دیا ہے۔

**قل انما حرم ربی الفواحش ما ظهر و مابطن**۔(الاعراف آیت:33)

فرمادیجیے میرے رب نے ان تمام فحش باتوں کو حرام کیا ہے جو علانیہ اور پوشیدہ ہیں۔

جو لوگ فحاشی کے پھیلنے کو پسند کرتے ہیں سورۃ النور میں ان کو یہ وعید سنائی گئی:

**ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشة فی الذین امنو لهم عذاب الیم فی الدنیا والآخر** (آیت: 19)

جو لوگ ایمان والوں میں بے حیائی کے پھیلنے کو پسند کرتے ہیں تو ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

2- غناء کے نقصانات میں سے یہ بھی ہے کہ یہ انسان کو فکر آخرت سے غافل کر دیتا ہے۔شاہ ولی اللہ اسی نقصان کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"نبی کریم ﷺ نے عجمیوں کی عادات پر نظر ڈالی اور دیکھا کہ وہ دنیاوی لذتوں میں منہمک ہونے میں ان تکلفات کا کس درجہ خیال رکھتے ہیں۔ان میں جو اصل اور بنیادی چیزیں تھیں ان کو حرام کیا جو ان سے کم درجہ کے تکلفات ہیں ان کو مکروہ کہا اس لیے کہ یہ چیزیں آخرت کو بھلانے والی ہیں اور ان سے دنیا کی طلب میں اضافہ ہوتا ہے"۔(ص:228) اس اصول کے ذکر کے بعد آپ نے متعدد چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

"......یہ ایسی چیزیں ہیں جو نفس کو دنیا و آخرت سے بے فکر کر دیتی ہیں اور وقت برباد ہوجاتا ہے مثلاً باجے، شطرنج، کبوتر بازی اور جانوروں کو لڑانا"۔(حجۃ اللہ البالغہ اردو ترجمہ ص:672)

اسی وجہ سے آلات موسیقی کو عربی میں ''ملاہی'' یعنی غافل کر دینے والی چیزیں کہا گیا ہے۔

3- جس بھی کسی قوم نے رقص وسرود میں دلچسپی کا مظاہرہ کیا اس سے اقتدار چھن گیا۔ بغداد کی تباہی اس کی زندہ مثال ہے۔ اندلس میں مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی لیکن حکمران جب رقص وسرور میں محو ہوئے تو اندلس بھی ہاتھ سے چھن گیا۔ مغلوں میں جب محمد شاہ رنگیلے جیسے حکمران آئے اور محلات کو عیش گاہوں میں تبدیل کر دیا تو انگریز آ دھمکے۔

4- عصر حاضر میں موسیقی نے ہمارے آئیڈلز (Ideals) بدل دیئے ہیں کسی وقت خالد بن ولید اور طارق بن زیاد جیسے سپوت نوجوانوں کے لیے نمونہ تھے اور بچیوں کے لیے سیدہ فاطمہ لیکن نظریات کے ساتھ ساتھ ہمارے ہیرو بھی بدل چکے ہیں۔


# نقش جیلانی

حیات وتعلیمات شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ پر ایک مستند کتاب، جسے آپ تک پہنچایا ہے محمد یوسف جاوید (قلمی نام محمد ابوخلدون) نے۔ پہلے باب میں حضرت شیخ کی پیدائش سے لے کر ان کے سفر بغداد کے حالات کا ذکر ہے۔ دوسرا باب ان حالات کا جائزہ ہے جن سے حضرت شیخ سے پہلے اور ان کی زندگی میں امت مسلمہ گزر رہی تھی۔ تیسرا باب حضرت شیخ کی دینی تعلیم اور اس کے بعد حضرت حماد بن مسلم کی مجلس میں حاضری اور ان کی صحبت میں راہ طریقت طے کرنے کے بارے میں ہے۔ چوتھا باب حضرت کی زندگی کے دیگر حالات اور بعض اکابر امت کے ان کے بارے میں تاثرات پر مبنی ہے۔ پانچواں باب تصوف یا تزکیہ باطن کا ایک عمومی تعارف ہے اور ساتھ ہی اس بارے میں حضرت شیخ کی بعض تعلیمات بھی آگئی ہیں۔ چھٹا باب حضرت شیخ کی تصنیفات کا ایک مختصر جائزہ ہے۔ ساتواں باب حضرت شیخ کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ یہی باب اس کتاب کا مرکزی باب ہے۔ اس میں عقائد، معاملات، معاشرت اور اخلاقیات پر حضرت شیخ کے اقوال ان کی تصنیفات سے پیش کیے گئے ہیں۔ **نقش جیلانی** ، کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **تحقیق و تالیف** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

# موسیقی روح کی غذا یا روح کو سزا

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

**الا بذکر اللہ تطمئن القلوب:**

خبردار دلوں کا سکون اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہے

جمہور صحابہ و تابعین اور عام مفسرین کے نزدیک لہوالحدیث عام ہے تمام ان چیزوں کے لیے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت سے غفلت میں ڈالیں۔

بیہقی نے اپنی سنن میں اور امام بخاری نے اپنی کتاب الادب المفرد میں فرمایا:

(لھوالحدیث ھوالغناء واشباھہ) یعنی لہوالحدیث سے مراد گانا اور اس کے مشابہ دوسری چیزیں ہیں۔

چند صحابہ کرام نے تو ''لہوالحدیث'' کی تفسیر گانے بجانے سے کی ہے۔ اور دوسرے حضرات نے اگرچہ تفسیر عام قرار دی ہے ہر ایسے کھیل کو جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کرے ''لہوالحدیث'' ہے مگر ان کے نزدیک بھی گانا بجانا اس میں داخل ہے۔

قرآن کریم ایک دوسری آیت میں: لایشھدون الزور میں امام ابوحنیفہ مجاہد اور محمد بن الحنفیہ وغیرہ نے زور کی تفسیر غنا (گانے بجانے) سے کی ہے۔

اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ برائی کو ہمیشہ جڑ سے ختم کرو۔ موسیقی کئی برائیوں کا پیش خیمہ ہے۔ اس لیے اسلام میں اسے نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ جسم کی غذا کے احکام حلال و حرام کے بارے میں وضاحت سے بیان ہوتے ہیں۔ تو روح کی غذا جس کی اہمیت شاید جسم سے زیادہ ہے اس کے بارے میں موسیقی سے اجتناب کا حکم ہے بلکہ روح کی غذا عبادت کو قرار فرمایا گیا۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ نے سنن میں اور ابن حبان نے اپنی کتاب صحیح میں حضرت ابو مالک اشعری سے روایت کیا ہے کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا: میری امت کے کچھ لوگ شراب کا نام بدل کر پئیں گے ان کے سامنے معازف و مزامیر کے ساتھ عورتوں کا گانا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان کو زمین میں خسف کر دے گا اور بعض کی صورتیں مسخ کر کے بندر اور سور بنا دے گا۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے:

اور انسانوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام دلفریب خرید کر لاتا ہے۔ تاکہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے راستہ سے علم کے بغیر بھٹکا دے۔

لہوالحدیث کا ایک تو مطلب یہ ہے کہ ایسی بات جو آدمی کو اپنے اندر مشغول کر کے ہر دوسری چیز سے غافل کو دے۔

دوسرا لہوالحدیث خریدنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حدیث حق کو چھوڑ کر حدیث باطل کو اختیار کرے۔

اس آیت کے نزول کی وجہ یہ تھی کہ نضر بن حارث نے قریش کے لوگوں سے کہا کہ جس طرح تم اس شخص کا مقابلہ کر رہے ہو اس طرح کام نہیں چلے گا۔ یہ شخص تمہارے درمیان ہی اس عمر تک پہنچا ہے آج تک اور اپنے اخلاق میں تم سب سے بہتر ہے۔ سب سے زیادہ سچا اور سب سے بڑھ کر امانت دار ہے۔ اب تم کہتے ہو کہ کاہن ہے ساحر ہے، شاعر ہے، مجنوں ہے، آخر ان باتوں کو کون باور کرے گا۔ کیا تم لوگ ساحروں کو نہیں

جانتے کہ وہ کس قسم کی جھاڑ پھونک کرتے ہیں۔ کس قسم کی باتیں بناتے ہیں۔ کیا لوگ شعروشاعری سے واقف نہیں، لوگوں کو کیا جنون کی کیفیات کا علم نہیں؟ آخر ان الزامات سے کون سا الزام محمد C پر چسپاں ہوتا ہے۔ وہاں موجود لوگوں میں ایک شخص بولا ٹھہرو! اس کا علاج میں کرتا ہوں۔ اس کے بعد عراق سے شاہان عجم کے قصے اور اسفندیار کی داستانیں لا کر اس نے قصہ گوئی کی محفلیں برپا کرنی شروع کر دیں تا کہ لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹے اور لوگ اس میں کم ہو جائیں۔ پھر اس مقصد کے لیے اس نے گانے والی لونڈیاں خریدیں جن کے متعلق کہ وہ سنتا وہ حضورC کی باتوں سے متاثر ہو رہا ہے اس پر لونڈی مسلط کر دیتا۔ یہ قریب قریب چال تھی جس میں قوموں کے اکابر مجرمین ہر زمانے میں کام لیتے رہے ہیں۔ وہ عوام کو کھیل تماشوں اور رقص و سرود میں غرق کر دینے کی کوشش کرتے تا کہ انہیں زندگی کے سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ دینے کا ہوش نہ رہے۔ اور اس عالم میں ان کو یہ معلوم ہی نہ ہو سکے کہ انہیں کس طرح تباہی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے طہارت پر زور دیا۔ حلال و حرام میں فرق بیان فرمایا کہ یہ کھاؤ، یہ حلال ہے۔ یہ مت کھاؤ یہ حرام ہے۔ تعجب ہے کہ جس چیز سے منع فرمایا گیا ہے وہ چیز ہماری روح کی غذا بن گئی۔ اور جس کی تاکید فرمائی گئی اس کی طرف سے غفلت برتی جاتی ہے۔ روح کی غذا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ سیدنا عبداللہ مسعود سے پوچھا گیا کہ اس آیت میں ''لہوالحدیث'' سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے تین مرتبہ زور دے کر فرمایا: ھواللہ الغناء

اللہ کی قسم اس سے مراد گانا ہے' ایسے ہی ملتے جلتے اقوال سیدنا عبداللہ بن عباس، مجاہد عکرمہ، جابر بن عبداللہ، سعید بن جبیر حسن بصری سے مروی ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

جو شخص گانے والی لونڈی کی مجلس میں بیٹھ کر اس کا گانا سنے گا قیامت کے روز اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور ساتھ ہی اس کے لیے انواع اقسام کی چیزیں پیدا کیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ جب تک انسان زندہ رہے گا اسے خوراک کی ضرورت رہے گی۔ تو نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ جسم کی ضروریات پوری کرنے کے لیے تو پھل سبزیاں وغیرہ پیدا کیں اور روح کو بھوکا رہنے دیا۔ روح کی غذا مقرر فرمائی اور وہ اپنی عبادت' اس بات کا تعین تو ہم مسلمانوں نے کرنا ہے کہ روح کے لیے کون سی غذا ہوگی۔ عبادت (حلال) یا موسیقی (حرام)۔ (ابوداؤد اور ابن ماجہ) سیدنا ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب جوئے اور طبلہ وسارنگی سے منع فرمایا ہے سیدنا ابو ہریرہ سے روایت ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب مال غنیمت کو شخصی دولت بنا لیا جائے اور جب لوگوں کی امانت کو مال غنیمت سمجھ لیا جائے اور جب زکوٰۃ کو تاوان سمجھا جانے لگے اور جب علم دین کو دنیا کی طلبی کے لیے سیکھا جانے لگے اور جب مرد اپنی بیوی کی اطاعت اور ماں کی نافرمانی کرنے لگے اور دوست کو قریب کرنے اور باپ کو دور رکھے اور مسجدوں میں شور و غل ہونے لگے اور قبیلہ کا سرداران میں ارذل بدترین ہو جائے اور جب شریر آدمیوں کی عزت ان کے شر کے خوف سے کی جانے لگے اور جب گانے والی عورتوں اور باجوں گاجوں کا رواج عام ہو جائے اور جب شرابیں پی جانے لگیں تو اس وقت تم انتظار کرو ایک سرخ آندھی کا اور زلزلہ کا اور زمین خسف ہو جانے اور صورتیں مسخ ہو جانے کا اور قیامت کی ایسی نشانیوں کو جو یکے بعد دیگرے اس طرح آئیں گی جیسے کسی ہار کی لڑی ٹوٹ جائے اور اس کے دانے بیک وقت بکھر جائیں۔

# جدید موسیقی اور ہماری تہذیب وثقافت

اسلام میں موسیقی جائز ہے یا حرام اور اگر جائز ہے تو کس قدر اور کن شرائط کے ساتھ؟ ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ اسلام میں موسیقی حرام ہے اور اسے اپنانا ناجائز اور گناہ ہے۔ جب کہ دوسرا نقطہ نظریہ ہے کہ اسلام میں موسیقی حرام نہیں ہے بلکہ مباح ہے۔ میں دوسرے نقطہ نظر کا قائل ہوں۔ اگر جائز نیت اور مقصد کے لئے موسیقی کو اپنایا جائے تو اس کو اجازت ہے اور یہ گناہ نہیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے دنیائے اسلام کے بیسویں صدی کے شہرہ آفاق اور نہایت بلند پایہ اسلامی سکالر، محقق اور عالم دین تھے۔ انہوں نے یورپ میں پچاس سال سے زائد عرصہ' اسلام کی تبلیغ اور اسلامی لٹریچر کی اشاعت کا فریضہ نہایت احسن اور موثر طور پر سرانجام دیا جس کے نتیجہ میں وہاں لاتعداد غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ انہوں نے اسلام کے تمام پہلوؤں اور اسلامی تعلیمات کے تمام گوشوں کے بارے میں فرانسیسی، جرمنی، انگریزی، اطالوی، ترکی اور عربی زبانوں میں درجنوں کتابیں لکھیں اور شائع کروائیں اور مختلف یورپی اخبارات اور جرائد میں سینکڑوں مضامین لکھے۔ چند سال قبل وہ پاکستان تشریف لائے تو انہوں نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے زیر اہتمام اسلام کے بارے میں 12 لیکچر دیئے۔ ان کے سامعین میں یونیورسٹی کے طلباء، پروفیسر، ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے دانشور، سکالر اور مذہبی عالم شامل تھے۔ ہر لیکچر کے بعد وہ سامعین کے سوالات کا جواب دیتے تھے۔ جو کتابی شکل میں انگریزی اور اردو زبانوں میں خطبات بہاولپور کے عنوان سے ادارہ تحقیقات اسلامی انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد نے ہزاروں کی تعداد میں شائع کیے ہیں۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ موسیقی اور آلات موسیقی کے بارے میں ان سے جو سوالات پوچھے گئے اور انہوں نے جو جوابات دیئے ان کے پیش نظر موسیقی کے بارے میں ان کا یہ نظریہ سامنے آتا ہے کہ موسیقی فی نفسہ حرام نہیں ہے۔ جس موسیقی سے فحش کاری کی طرف میلان نہیں ہوتا اور جس موسیقی سے ہمارے مذہبی فرائض میں خلل پیدا نہیں ہوتا وہ ممنوع نہیں۔ موسیقی بطور موسیقی کے ایک علم ہے۔ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً شادی، بیاہ اور خوشی کے دیگر مواقع پر، بگر شرعی اخلاقی حدود کے اندر۔ اس کی جنگ کے سلسلہ میں بھی ضرورت پیش آتی ہے۔

اسلام فطرت اور بین الاقوامی دائرے کا دین ہے۔ رونا اور گانا ہر انسان کی فطرت میں ہے۔ انسانی آواز اور آلات کی آواز کا حسن موسیقی ہے۔ اسلام سے قبل موسیقی عربوں کی تہذیب کا حصہ تھی اور اب بھی ہے۔ کچھ یہی صورت حال دیگر ملکوں کی ثقافت کی بھی ہے۔ اسلام جہاں پہنچا اس نے وہاں کی تہذیب وثقافت کی وہ چیزیں جو اسلام کے بنیادی عقائد، اصولوں اور تعلیمات سے متصادم نہیں تھیں اور انسانی مزاج اور جائز فطری قلبی اور ذہنی ضرورتوں کا احاطہ کرتی تھیں، انہیں شرعی حدود کے اندر اپنایا۔ یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ برصغیر میں اسلام، اولیائے کرام کے پاکیزہ کردار، اخلاق اور ان کے حکیمانہ طریقہ تبلیغ وتربیت سے پھیلا۔ اس عظیم مقصد کے لئے پہلے حضرت عثمان علی ہجویریؒ (المعروف داتا گنج بخش) برصغیر تشریف لائے اور لاہور کو اپنا مستقل مستقر بنایا۔ پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ تشریف لائے اور انہوں نے تبلیغ کا مرکز اجمیر کو بنایا۔ اس وقت ہندوستان میں پرتھوی راج چوہان کی حکمرانی تھی۔ ہندوؤں میں گانے بجانے کے ذریعہ تبلیغ کا رواج تھا چنانچہ انہوں نے اللہ کی وحدانیت اور حقیقت رسول اللہ کی رسالت اور عظمت کی تبلیغ مروجہ طریقہ سے کرنے کے لئے قوالی کا ذریعہ استعمال کیا۔ جسے ان کے خلفا اور پیروکاروں نے موسیقی کی نئی ترکیبیں اور آلات ایجاد کر کے جاری وساری رکھا۔ یہ طریقہ ہندوستانی معاشرہ میں نہایت موثر ثابت ہوا۔

اچھی اور پاکیزہ موسیقی دماغ، دل اور روح کو خوش کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ دل تو محض گوشت کا لوتھڑہ ہے اور دماغ بھی جسمانی حصہ۔ اصل چیز روح ہے۔ نکل جاوے تو دل اور دماغ بھی بند ہو جاتے ہیں۔ موسیقی پاکیزہ ہو تو روح افزا ہو سکتی ہے۔ صوفیاء کے نزدیک موسیقی کی جائز حدود اور مقاصد کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ وہ ناجائز نیت اور مقاصد کے لئے' سفلی اور شہوانی جذبات ابھارنے کے لئے موسیقی کا استعمال حرام سمجھتے ہیں۔

**پاک موسیقی** کے ذریعہ کئی بزرگوں نے درویشی اور قرب الٰہی کی منازل طے کرنے میں مدد لی۔ پاکیزہ موسیقی عشق کو جلا دینے والی ہوتی ہے اور صوفیا (جو کہ راہ عشق خداوندی کے راہی ہوتے ہیں) کے لئے اس عشق حقیقی کی منزلیں طے کرنے میں موسیقی بھی مددگار ہوتی ہے۔ اس کے لئے پاکیزہ موسیقی سننے کا اہل ہونا چاہئے۔ موسیقی اور کلام کی سمجھ ہونا بھی ضروری ہے۔ جس جملے پر حال پڑ جائے (یعنی مرید یا صوفی حال میں غرق ہو۔ یعنی فنافی الشیخ ہو) اس جملہ پر قوال زور دیتے اور دھراتے ہیں۔ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ (جو حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ کے خلیفہ تھے) کو مندرجہ ذیل شعر پر حال پڑا اور اسی حال میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

کشتگان خنجر تسلیم را۔ ہر زماں از غیب جان دیگر است

صوفیا اور اولیا اللہ کے علاوہ برصغیر میں دیگر کئی مشاہیر کا بھی موسیقی سے لگاؤ رہا ہے۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی شامل ہیں جو کہ ایک معتبر اور بلند پایہ عالم دین تھے۔ ان کے اپنے دوست مولانا حبیب الرحمان شیروانی کے نام لکھے گئے خطوط کا مجموعہ "غبار خاطر" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ موسیقی کے بارے میں ایک خط میں لکھتے ہیں" میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے۔ میں زندگی کی احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آگرہ کے سفر کا اتفاق ہوا میں نے خاص طور پر کوشش کر کے ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ رات کو ستار لے کر تاج محل چلا جاتا اور اس کی چھت پر جمنا کے رخ بیٹھ جاتا۔ پھر جونہی چاندنی پھیلنے لگتی ستار پر کوئی گیت چھیڑ دیتا اور اس میں محو ہو جاتا۔ کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریب تخیل کے کیسے کیسے جلوے اپنی آنکھوں کے آگے گزر چکے ہیں۔ اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے اور ہوا کی لہروں پر تیرنے لگتے۔ تاج محل کی برجیاں بارہا اپنی جگہ سے ہل گئیں۔ منارے اپنے کندھوں کو جنبش سے نہ روک سکے۔ آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے۔ مولانا کی اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ بیوی کی یاد میں حزن وملال کی تصویر بنے ہوئے تھے اور موسیقی سے اپنا دل بہلاتے تھے۔

ویسے تو دنیا کی تمام اقوام میں موسیقی کسی نہ کسی مقامی رنگ و آہنگ میں موجود ہے مگر جو موسیقی ہماری موسیقی پر تھوڑا بہت اثر انداز ہوئی ہے اس میں عربی موسیقی اور مغربی موسیقی شامل ہے۔

## عربی موسیقی

عربی موسیقی میں انسانوں کی خوبصورت آوازوں اور موسیقی کے آلات کے علاوہ اعلیٰ شاعری کا بڑا دخل ہے اس لئے یہ دلوں کو موہ لینے اور مسحور کرنے کے علاوہ دلوں کو گرمانے اور جوش وولولہ پیدا کرنے کے اوصاف سے بھی مزین ہے۔ ہمارے موسیقاروں نے اس سے وقتاً فوقتاً استفادہ کیا ہے۔ ہمارے ہاں اسے اپنانے اور اس سے استفادہ کرنے کی بہت گنجائش ہے۔ عربی موسیقی میں شادی بیاہ کے موقعہ کی موسیقی۔ قومی تقریبات پر مل جل کر کورس کی شکل میں پیش کی جانے والی موسیقی اور سماجی مجالس خصوصاً قہوہ خانوں کی موسیقی مشہور ہے۔

## مغربی موسیقی

مغرب کی راک ان رول (Rock in Rol) موسیقی سے قبل ہمارے ہاں عوامی سطح پر مغربی موسیقی سے کسی کو دلچسپی نہ تھی۔ ایلوس پریسلے (Elvis Presley) اور اس کے ساتھیوں کا اچھل کود سے بھرپور موسیقی کا یہ تیز اور پرجوش آہنگ ہمارے ہاں بھی نوجوانوں کے ایک طبقہ

میں مقبول ہوا۔اس کی وفات کے بعد یہ موسیقی اپنی قہر سامانیوں کے ساتھ نئے نئے انداز اختیار کرتی گئی۔ بالآخر پاپ میوزک کی شکل اختیار کر گئی جو جنگل کی آگ کی طرح دنیا میں پھیل رہی ہے اور اس نے پاکستان میں بھی خوشحال گھرانوں کی نئی نسل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ پاپ ہندی میں گناہ کو کہتے ہیں اور یہ موسیقی خالص مغربی لوازمات اور انداز میں گناہ سے کم نہیں۔ مغربی تہذیب میں سوسائٹی کو جنگل کے جانوروں کی سی آزادی ہے جس میں نر اور مادہ کا بے ہنگم، بلا جھجک شرم وحیا کھلم کھلا اختلاط جائز ہے۔اس میں عورتیں اور مرد، نوجوان لڑکے اور لڑکیاں سفلی جذبات ابھارنے والی تک بند شاعری اور بولیوں کو بے تکی دھنوں اور بینڈوں کے دھوم دھڑے پر گاتے اور اکٹھے اچھل کود کرتے ہیں۔ ہمارے سرکاری اور پرائیویٹ ٹی وی چینل بھی اس کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ ہمیں اسے من وعن نہیں اپنانا چاہئے بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ اس میں کون سی بات ہماری تہذیب اور اقدار کے منافی ہے۔ہمیں اس موسیقی کو پاکستانی رنگ اور سانچے میں ڈھالنا چاہیے تا کہ اس میں جو اشعار اور بولیاں گائی جائیں۔ وہ مہذب اور شاعری کے اصولوں پر پوری اترتی ہوں اور سفلی جذبات ابھارنے والی ننگی تک بندیاں اور بولیاں نہ ہوں۔ گانوں کے لئے باضابطہ اچھی دھنیں ترتیب دی جائیں جن میں تیزی، جوش ولولہ اور ردھم (Rhythm) ہو۔ گانے والے بے سرے نہ ہوں اور سریلی آواز رکھتے ہوں اور گانے کی باضابطہ تربیت حاصل کریں اور سٹیج پراوٹ پٹانگ اور بے ہنگم چیخ وپکار نہ کریں۔ مرد حضرات صرف مردانہ مخصوص محفلوں میں گانا بجانا اور اچھل کود کریں اور فحش حرکات اور اشاروں سے پرہیز کریں۔ اسی طرح عورتیں اور لڑکیاں اپنی علیحدہ مخصوص محفلوں اور مجلسوں میں مشرقی تہذیب کے دائرے میں رہ کر اپنا شوق موسیقی پورا کر سکتی ہیں کیونکہ اسلام میں مردوں اور عورتوں کا مل کر مخلوط مجالس میں حیا سوز حرکتیں کرنا اور اخلاق باختہ گانے گانا ناجائز اور حرام ہے۔

## برصغیر کی موسیقی

برصغیر جنوبی ایشیا میں موسیقی مسلمانوں کی آمد سے قبل ہی سماجی زندگی اور مذہبی رسومات کا اہم حصہ تھا۔ اولیا اللہ نے اسے پاکیزہ شکل میں قوالی کی صورت میں صرف تبلیغ اور روحانی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ جہاں تک مسلمان حکمرانوں اور روسا کا تعلق ہے انہوں نے موسیقی کے فن کی سرپرستی کی اور اسے ہمہ جہت ترقی سے ہمکنار کیا۔ خاص کر کلاسیکل موسیقی ان کی توجہ کا مرکز رہی۔ مسلمان موسیقاروں نے نئے نئے راگ، راگنیاں ایجاد کیں۔ موسیقی کو پسندیدہ اور سکون آور بنایا۔ مگر بدقسمتی سے کچھ عیاش اور گم کردہ راہ روسا اور نوابوں نے موسیقی کو سفلی جذبات کی تسکین اور عیش و طرب کا ذریعہ بنایا۔ جس سے موسیقی کا دلکش فن اور اس کا تشخص خراب ہوا۔ برصغیر میں فلمی دور شروع ہوا تو اس میں بھی دونوں مقاصد کے لئے موسیقی کو استعمال کیا گیا۔ یعنی سفلی جذبات کی تسکین کے لئے بھی اور صاف ستھری تفریح کے لئے بھی۔ مگر کئی صورتوں میں موسیقی کی بطور فن کے بہت ترقی ہوئی۔ خاص کر پچھلی صدی کی ساتویں دہائی تک فلمی موسیقی عروج پر رہی۔ اچھے معیار کی شاعری اچھے معیار کی دھنیں، اچھے معیار کی آلاتی موسیقی اور اچھے معیار کی سریلی آوازیں اس موسیقی کی خصوصیات تھیں۔ اس دور کے اکثر صاف ستھرے گانے اب بھی دل کو موہ لیتے اور انسان کو ڈیپریشن، پریشانی اور غم کو دور کرنے اور اسے اچھی تفریح فراہم کرنے کا اثر رکھتے ہیں۔

تقسیم سے قبل دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح موسیقی کے مختلف شعبوں میں بھی مسلمانوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ مگر بھارت والے اسے اپنے کھاتے میں ڈالتے ہیں۔ حالانکہ تقسیم برصغیر سے قبل زندگی کے مختلف شعبوں میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے گئے وہ بھارت اور پاکستان دونوں کا ورثہ ہیں۔ صرف بھارت کا نہیں۔ خاص کر مسلمانوں کے اچھے فنی کمالات سے ہمیں دستبردار نہیں ہونا چاہئے۔ موسیقی کے شعبہ میں چند نامور مسلمانوں کے نام حسب ذیل ہیں۔ جن کے صاف ستھرے اچھے گانوں اور اچھی موسیقی کے بارے میں ہمارے ٹی وی چینلز کو مختلف پروگرام پیش کرنے چاہئیں۔ ☆

## موسیقار

(1) نوشاد علی (2) ماسٹر غلام حیدر (جنہوں نے لتا منگیشکر کو فلموں میں بطور گلوکارہ متعارف کرایا اس بات کا لتا نے خود اعتراف کیا ہے) (3) خواجہ خورشید انور (جنہوں نے فلم پروانہ (ٹوٹ گئے سب سپنے میرے (سہگل) کی موسیقی پر بمبئی میں ایوارڈ حاصل کیا (4) رفیق غزنوی (5) سجاد حسین (فلم سیاں اور سنگدل (وہ تو چلے گئے اے دل) کے موسیقار (لتا نے بمبئی میں ایک تقریب میں فلم سیاں کا گانا (کالی کالی رات لیکن بڑا ستائے) گاتے وقت سجاد حسین کی بہت تعریف کی (6) ماسٹر جھنڈے خان (7) فیروز نظامی (8) جی اے چشتی (9) ماسٹر عنایت حسین (10) ناشاد (11) نثار بزمی (12) غلام محمد (جن کی پاکیزہ میں موسیقی بہت بے مثال ہے) (13) رشید عطرے (14) ظفر خورشید وغیرہ۔

## نغمہ گار

(1) جوش ملیح آبادی (2) ساحر لدھیانوی (3) شکیل بدایونی (4) قتیل شفائی وغیرہ

## گلوکار اور گلوکارائیں

(1) نور جہاں (2) محمد رفیع (3) طلعت محمود (4) ثریا (5) شمشاد بیگم (6) خورشید بیگم (تان سین فہیم) (7) امیر بائی کرناٹکی (8) روشن آرا بیگم (9) خان مستانہ (10) اختری بائی فیض آبادی اور مہدی حسن وغیرہ۔

## کلاسیکل موسیقی

موسیقی کی ماں دراصل کلاسیکل موسیقی ہے۔ اس موسیقی کو پروان چڑھانے میں کئی مسلمان گھرانوں اور موسیقاروں نے شاندار خدمات سرانجام دیں۔ یہ موسیقی سکون پرور، وجد آفریں اور قلب وذہن کو تسکین وفرحت پہنچانے والی ہے۔ اس موسیقی نے کئی نامور مسلمان پیدا کئے جن میں استاد بڑے غلام علی خان جیسے لوگ شامل ہیں۔

# کلاسیکل موسیقی کی روایت دم توڑ رہی ہے

موسیقی کو روح کی غذا کہا جاتا ہے، اسی طرح محبت کی آبیاری بھی اسی لطیف شے سے ہوتی ہے۔ جس طرح ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی ہوتا ہے۔ اسی طرح مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہوتا ہے۔ تلخ حقائق سے لبریز دنیا میں غموں کا مداوا بھی اسی دوا سے ہوتا ہے۔ ہوا کے دوش پر لہراتے ہوئے نغمے مژدہ جانفزا لے کر کانوں کے راستے دل کی گہرائیوں میں اتر کر حیات نو بخشتے ہیں۔ انسان سوچنے پر مجبور ہے کہ اگر دنیا میں یہ تریاق نہ ہوتا تو پھر زندگی کیسے کٹتی، تاریک طویل سفر کیسے طے ہوتا۔ حسن کی آرائش کے لئے موسیقی نہ ہوتی تو کونسا زیور میسر ہوتا؟ چہرے کا ناپائیدار حسن جلد مرجھا جاتا ہے جبکہ گلے کا حسن اس حسن سے زیادہ پائیدار رہتا ہے۔

سُر اس کائنات کی ایسی سچائی ہے جو ہر جاندار شے پر اپنا اثر رکھتی ہے اور گانا ہر جاندار کی سرشت میں شامل ہے۔ رجز خوانی سپاہی کا حوصلہ بڑھاتی ہے۔ مشقت کرنے والی عورت گا کر اپنی محنت کو خوشگوار بناتی ہے۔ بینڈ کے سروں اور تال وسم پر فوجیں مارچ کر کے اپنی منزل کو آسان بناتی ہیں۔ ماں بیٹے کی نعش پر بین ڈال کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہے۔ عاشق گا کر غزل سرائی سے اپنا غم غلط کرتا ہے۔ بچہ ماں کی لوری سے سوجاتا ہے۔ اونٹ ساربان کے نغمہ سے مست خرامی کرتا ہے۔ گھوڑا سیٹی کی آواز پر پانی پیتا ہے۔ سانپ بین کی آواز پر جھومنے لگتا ہے۔ بعض پہاڑی پرندے اتنے خوش الحان ہوتے ہیں کہ ان کے سریلے نغموں سے انسان بیخود ہو جاتا ہے۔

کلاسیکل موسیقی اور غزل گائیکی زمانہ قدیم سے ایک مقبول صنف رہی ہے۔ اس مقبول صنف میں برصغیر کے مسلمانوں کی اجتماعی خوشبو شامل ہے۔ یہ صنف سات سو سال سے زائد عرصہ سے ہمارے درمیان موجود ہے۔ پاکستان میں ''غزل سرائی'' نے ایک جاندار صنف ادب کی حیثیت سے ترقی کے مدارج طے کئے ہیں۔ مسلمان بادشاہوں نے برصغیر میں جس موسیقی کو روشناس کرایا تھا وہ آج کلاسیکل موسیقی کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہندو مورخین نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ موسیقی کا موجودہ نظام مسلمانوں نے ہی برصغیر میں متعارف کرایا اور اسے قائم کیا۔ حضرت امیر خسرو کا نام موسیقی کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ دنیائے موسیقی ان کے احسانات کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتی۔ ستار بھی ان کی ایجادات میں شامل ہے حضرت امیر خسرو نے کلاسیکل موسیقی کو بام عروج تک پہنچایا بعد ازاں مسلم فنکاروں نے اسے نئی جہت بخشی اور یوں فن موسیقی نے بے پناہ وسعت پائی۔ والی اودھ نواب آصف الدولہ نے ٹپے اور نواب واجد علی شاہ نے ٹھمری ایجاد کی۔ کلاسیکل موسیقی کی ان نئی ایجادات نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ زمانہ قدیم میں سربراہان مملکت، نواب اور امراء اس فن کی سرپرستی کرتے رہے اور عوام کی کلاسیکی موسیقی میں دلچسپی فنکاروں کا حوصلہ بڑھاتی رہی۔ مقبول عام لوگوں سے شائقین ساری ساری رات فرش پر بیٹھ کر ایک ہی راگ سنتے رہتے تھے اور انہیں وقت گزرنے کا گماں تک نہ ہوتا اور نہ ہی وہ کسی اکتاہٹ اور بیزاری کا شکار ہوتے۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں کلاسیکل موسیقی کا دامن استاد بڑے غلام علی خان، ماسٹر غلام محمد، غلام حیدر، جوتھیکا رائے، پارل گھوش، جگ موہن، کھیم چندر پرکاش، امیر بائی کرناٹکی، زہرہ بائی (انبالے والی) سجاد حیدر، شام سندر، پنڈت گووند رام، نوشاد، آرسی گورال، نور جہاں اور انل بسواس جیسے ستاروں سے جگمگاتا رہا۔ یہ انہی لوگوں کی محنت کا ثمر ہے کہ آج برصغیر کی فلمی موسیقی اپنے بدلتے ہوئے رجحانات کے ساتھ نہ صرف زندہ بلکہ مقبول عام ہے۔ ان لوگوں نے کلاسیکل موسیقی کو ہلکے پھلکے انداز میں فلمی موسیقی میں شامل کر کے لوگوں کے دلوں کو لبھایا اور اسے عام فہم صنف

کی شکل دی۔ کلاسیکل موسیقی کے بے تاج بادشاہ استاد بڑے غلام علی خان (جن سے نور جہاں نے بھی ابتدائی دور میں تعلیم حاصل کی) نے عمر بھر بھی کسی فلم کے لئے کوئی گیت نہیں گایا۔ شہرہ آفاق فلم مغل اعظم میں ان کے دو کلاسیکل گیت شامل ہیں۔ جن کی شمولیت کا حال موسیقار اعظم نوشاد کی زبانی سنتے ہیں۔

''جب پہلی مرتبہ ان سے درخواست کی گئی کہ وہ فلم ''مغل اعظم'' کے لئے گانا گائیں تو انہوں نے بڑی حقارت سے اسے ٹھکرا دیا۔ جس کے بعد میں اور کے۔ آصف بڑے خان صاحب کے پاس یہ پیشکش لے کر گئے تو انہوں نے ہم سے جان چھڑانے کے لئے جو معاوضہ بتایا بظاہر اس کی ادائیگی ناممکن تھی۔ انہوں نے ایک گانے کے لئے 25 ہزار روپے کا مطالبہ کیا۔ وہ اس گمان میں تھے کہ وہ بڑی صفائی سے اپنا دامن بچا گئے ہیں۔ اور فلم والے اتنی بڑی رقم کا سن کر یقیناً ان سے جان چھڑا ئیں گے۔ لیکن دوسری طرف بھی کے آصف تھے جو بخوبی جانتے تھے کہ ناممکن کو ممکن کیسے بنانا ہے۔ اس کا اندازہ جلد ہی بڑے خان صاحب کو بھی ہو گیا۔ جب آصف نے ان کے اس مطالبہ پر پریشان ہوئے اور ماتھے پر کوئی شکن ڈالے بغیر بڑی عقیدت سے کہا'' خان صاحب آپ انمول ہستی ہیں۔ کیا آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ آپ نے معاوضہ بہت زیادہ بتایا ہے؟ ان کے عقیدت بھرے جذبات سے بڑے خان صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ مزید کچھ کہے اس فلم کے لئے حامی بھر لی کہ وہ تان سین کے گانے کے منظر کے لئے پلے بیک گلوکاری کریں گے۔ ان کے حامی بھرتے ہی آصف آگے بڑھا اور اسی وقت ان کی ہتھیلی پر 25 ہزار روپے رکھ دیئے۔ یہ وہ دور تھا جب بڑے سے بڑا پلے بیک سنگر ایک گانے کا تین سے پانچ ہزار روپے معاوضہ لیتا تھا۔

پاکستان میں گزشتہ پانچ دہائیوں میں فن موسیقی اور خاص کر ''غزل سرائی'' نے جو ترقی کی ہے کہ وہ فن موسیقی سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے لئے ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ غزل سرائی کے میدان میں مختار بیگم، ملکہ موسیقی روشن آراء، نور جہاں، ملکہ پکھراج، مہدی حسین، فریدہ خانم، اقبال بانو، نسیم بیگم، غلام علی، شوق علی خان، اسد امانت علی خان، طاہرہ سید، مہناز اور استاد نصرت فتح علی خان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان فنکاروں کی غزل سرائی قدیم وجدید کا خوبصورت امتزاج ہے جو

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

کا صحیح مظہر نظر آتا ہے۔ یہ وہ فنکار ہیں جن پر پاکستان کو بجا طور پر فخر ہے۔

لیکن آج یہی کلاسیکل موسیقی دم توڑتی نظر آتی ہے۔ آج اس کا کوئی پرسان حال نہیں۔ ہمارے دلوں میں اس صنف سے وابستہ فنکاروں کی عزت تو موجود ہے لیکن اسے سننے اور اس فن کی خدمت کرنے کی کوئی لگن یا جذبہ موجود نہیں۔ بلکہ نئی نسل تو اپنے دور کی اس مقبول صنف کا مذاق اڑاتی اور اسے وقت کا ضیاع گردانتی نظر آتی ہے۔ اس سلسلہ میں کلاسیکل موسیقی اور غزل سے وابستہ نامور افراد کی رائے لی گئی ہے جو قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش خدمت ہے۔

پاکستان کے مایہ ناز کلاسیکل فنکار گلوکار حامد علی خان نے اس سلسلہ میں کہا کہ اس وقت کلاسیکل موسیقی اور غزل دونوں کی پوزیشن خراب ہے۔ خاص طور پر غزل کا وجود خطرے میں پڑ چکا ہے۔ اگرچہ سننے والے موجود ہیں اور وہ ہمیں بلاتے اور سنتے بھی ہیں لیکن اس کی رفتار کم اور ڈانوا ڈول ہے۔ سر اور لے کو پہنچانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں یہ بہت مشکل فن ہے۔ حامد علی خان نے کہا کہ کلاسیکل موسیقی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس سے سوجھ بوجھ آتی ہے اور ذہانت تیز ہوتی ہے۔ اس موسیقی سے کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

حامد علی خان نے مزید کہا کہ بعض فنکار کلاسیکل کا نام تو لیتے ہیں لیکن ان کا گایا ہوا کلاسیکل نہیں ہوتا۔ ایسی صورتحال میں جو شوقیہ غزل یا کلاسیکل گا رہے ہیں ان کا وجود غنیمت ہے۔ اس فیلڈ میں نوجوان گلوکار عدیل برکی بہت اچھا گا رہے ہیں۔ انہیں جہاں سر اور لے کی سدھ بدھ ہے وہاں وہ محفل پر چھانے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ کلاسیکل موسیقی پر کسی کی اجارہ داری نہیں زیادہ سے زیادہ نوجوانوں کو اس فیلڈ میں آنا چاہئے۔

حامد علی خان نے کہا کہ سابقہ دور میں پی ٹی وی پر کلاسیکل پروگرام بالکل بند کر دیے گئے ہیں۔ اب پی ٹی وی نے جو نئے پروگرام شروع کئے ہیں انہیں جاری رہنا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ ان کے صاحبزادوں نے اپنا گروپ بنایا ہے۔ نایاب علی خان اور انعام علی خان کلاسیکل گاتے ہیں جبکہ قاسم علی خان ویسٹرن گا رہے ہیں۔ قاسم علی خان کمپوزر بھی ہیں وہ میرا بھی والیم بنا رہے ہیں۔ قاسم نے مغربی موسیقی میں کلاسیکل موسیقی کو استعمال کیا ہے۔ ہمیں زمانے کے ساتھ چلنا چاہئے۔

حامد علی خان نے کہا کہ 1979ء میں وہ مہدی حسن اور اسد امانت علی خان کے ساتھ دہلی گئے تھے۔ تقریب میں اندرا گاندھی، واجپائی (منسٹر) دلیپ کمار، سائرہ بانو اور بھارت کی صف اول کی شخصیات موجود تھیں۔ جب میں نے اور اسد نے پرفارم کیا۔ تو تمام ہال جھوم اٹھا۔ اندرا گاندھی نے ہمیں زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں سمجھتی ہوں کہ جیسے آج آسمان سے رام اور لکشمن کی جوڑی اتر آئی ہے۔ انہوں نے ہمیں مستقل انڈیا میں رہنے کی آفر بھی کی۔ حامد علی خان نے کہا کہ پی ٹی وی پاپ موسیقی کو بھی چلائے لیکن بیلنس رکھے۔ آج روپے میں 14 آنے پاپ موسیقی اور دو آنے کلاسیکل موسیقی کو ملتا ہے اس فرق کو ختم ہونا چاہئے اور کلاسیکل موسیقی اور غزل کو اس کا مقام، مرتبہ اور وقت برابر ملنا چاہئے۔

معروف گلوکارہ فریدہ خانم کلاسیکل موسیقی اور غزل کے مستقبل کے بارے میں خاصی فکرمند ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اب بھی وقت ہے کہ حکومتی عہدیدار، ریڈیو، ٹی وی کے اعلیٰ افسر، سینئر پروڈیوسرز اور بچے کھچے کلاسیکل فنکار سر جوڑ کر بیٹھیں۔ اس کی بقا کے لئے سوچیں، اس لائحہ عمل کی روشنی میں جدوجہد کی جائے تاکہ کلاسیکل موسیقی اور غزل کے لئے ماحول اور راستہ بنے۔ فریدہ خانم نے کہا کہ ہم نے باقاعدگی سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ اچھے استادوں سے رابطہ کیا۔ وہ استاد نہ صرف اچھے بلکہ نیک نیت بھی تھے۔ اب تو سب کچھ بدل گیا ہے اور کمرشل ہو گیا ہے۔ ہم نے کام شوق سے کیا پیسے کو کبھی اہمیت نہ دی، سکھانے والے بھی دعا دیتے تھے۔

فریدہ خانم نے کہا کہ لائٹ میوزک بالکل ہی "لائٹ" ہو گیا ہے۔ ایک شور شرابہ ہے۔ وہ آرٹسٹ جنہیں راتوں رات شہرت مل گئی ہے وہ غزل یا کلاسیکل موسیقی کو کیوں اہمیت دیں گے۔ یہ افسوسناک سانحہ ہے۔ کلاسیکل موسیقی کو تو آپ اب ختم ہی سمجھیں۔ سجاد علی یا عدیل برکی جیسے آرٹسٹ جو اسے شوق اور محنت کے بل بوتے پر لے کر چل رہے ہیں۔ وہ اکیلے کیا کریں گے جب تک اعلیٰ سطح پر ان کا ساتھ نہیں دیا جائے گا' بات نہیں بنے گی۔

فریدہ خانم نے کہا کہ جو گانا گایا جا رہا ہے کہ آپ بھی سن رہے ہیں اور یہ شرمناک ہے کوئی امریکہ چلا گیا ہے اور کوئی لندن۔ اچھی موسیقی پائیدار ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ آواز اچھی ہے تو گانا گا لیا اور محفل میں بیٹھ کر رونق جما لی۔ فوک کا بھی اپنا رنگ ہے۔ پنجاب کی اپنی ثقافت اور پہچان ہے۔ اسے بھی پکے طریقے سے کیا جائے تو وہ پائیدار ہو گا۔ اسی طرح صوفیانہ کلام کا زبردست لگاؤ ہے اسے بھی اگر اس کے مزاج اور اصل رنگ کے مطابق پیش کیا جائے تو سننے والوں پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ فریدہ خانم نے کہا کہ وہ جلد ہی غزل، ٹھمری، دادرا اور دیگر آئٹم پر اپنی البم شروع کر رہی ہیں۔

معروف کلاسیکل گلوکار اسد امانت علی خان کلاسیکل موسیقی کی موجودہ صورتحال سے خاصے دلبرداشتہ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ریڈیو، ٹی وی اور الحمرا میں وہ فنکار چھا گئے ہیں جنہیں موسیقی کی ابجد کا بھی علم نہیں۔ ہم اگر کسی گانے میں زیر کی جگہ زبر پڑھ جاتے تھے تو ہفتہ بھر کی محنت ضائع ہو جاتی تھی اور وہ گانا دوبارہ ریکارڈ کرانا پڑتا تھا۔ اب ٹی وی پر کمپیئرنگ سن کر دل خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ پی ٹی وی کے پروگرام "میری پسند" میں کسی آرٹسٹ کے مقبول عام پسندیدہ گیت سنائے جاتے ہیں لیکن اس پروگرام میں کیسٹ پر فنکار ہونٹ ہلا کر چلے جاتے ہیں جبکہ وہ گانا بھی کسی اور فنکار کا ہوتا ہے۔ اسد امانت علی خان نے کہا کہ اس سے بڑا المیہ کیا ہو گا کہ پی ٹی

وی کے سٹیج پروگرامز میں گھروں سے بال بچوں کے ساتھ آنے والے شائقین کو کیسٹ سننا پڑتی ہے۔ وہ یہی کیسٹ گھر بیٹھے بھی تو سن سکتے ہیں۔ محفل سجائی گئی ہے تو اس میں فنکار کو لائیو گانا چاہئے ورنہ وہ گھر بیٹھ جائے۔

اسد امانت علی خان نے کہا کہ موسیقی کے انسٹرومنٹ ختم ہو گئے ہیں۔ اسی صورتحال سے بددل ہو کر استادوں نے اپنے بچوں کو خراد اور سلائی کڑھائی کا کام سکھا دیا ہے کہ کم از کم ان کے بچے ان کی طرح فاقہ کشی کا شکار تو نہیں ہوں گے۔ اس طرح کلاسیکل موسیقی کا فن رفتہ رفتہ زندہ دفن ہو رہا ہے۔ ہم اپنا اور خاندان کا نام بچانے کے لئے اس فن سے وابستہ ہیں۔ یہ سب دیکھ کر انتہائی دکھ اور افسوس ہوتا ہے۔

اسد امانت علی خان نے کہا کہ نااہل لوگوں کو ایوارڈز سے نوازا جاتا ہے جنہیں ان کے پڑوس والے بھی نہیں جانتے۔ معروف آرٹسٹ بھی ٹی وی پر آکر کہتے ہیں کہ ہم نے کسی سے نہیں سیکھا اور ہمارا کوئی استاد نہیں۔ تو ان کے فین تو یہی سیکھیں گے کہ اگر یہ بغیر سیکھے سپر سٹار بن سکتا ہے تو ہمیں اس فیلڈ میں سیکھنے اور محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ سو سال قبل پوری دنیا میں 12 سروں کے لئے 34848 راگ، راگنیاں ترتیب دی گئی تھیں۔ لیکن کوئی بھی فنکار ان میں سے سوڈیڑھ سو بھی سیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ کہتے ہیں کہ راگوں میں کیا رکھا ہے۔ انسٹرومنٹ پر ایک سیکنڈ میں 10 طرزیں بن جاتی ہیں۔

اسد امانت علی خان نے کہا کہ اب غزل کی حالت بھی حوصلہ افزا نہیں۔ اب غزل کا نام بھی صرف دھوم دھڑ کا رہ گیا ہے۔ غزل کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ ٹھیکا اور تال دیکھا جاتا ہے کہ اس راگ میں اس کی چلن اچھی اور بھلی لگے گی۔ حکومت کو اس فن کی سرپرستی کرنی چاہئے ورنہ حالات اسی طرح رہے تو ہم اپنے بچوں کو بھی نہیں سکھا پائیں گے۔

تین مرتبہ نیشنل ایوارڈ حاصل کرنے والی معروف گلوکارہ سائرہ نسیم غزل کے مستقبل سے خاصی پر امید ہیں۔ سائرہ نسیم نے کہا کہ نوجوانوں میں غزلیں سننے کا شوق واپس آ رہا ہے۔ مختلف پروگرامز میں پرفارمنس کے دوران کالجز کے بیشتر لڑکے اور لڑکیاں غزل کی ہی فرمائش کرتے نظر آتے ہیں۔

سائرہ نسیم نے کہا کہ کچھ عرصہ پیشتر فرخ بشیر نے "راگ مالا" پروگرام شروع کیا تھا۔ جس میں غزل، گیت، ٹھمری وغیرہ شامل تھیں۔ اس طرح کے پروگرام زیادہ سے زیادہ نئے فنکاروں کی کھیپ تیار کرنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ جبکہ عوام کا زیادہ رجحان پاپ موسیقی کی طرف ہے۔ ابرار الحق اور جواد وغیرہ بھی اسی سمت تیزی سے گامزن ہیں۔

گزشتہ 22 سال سے فن موسیقی کی خدمت کرنے والے انور رفیع نے کہا کہ کلاسیکل موسیقی زوال پذیر ہے۔ چند لوگ باقی رہ گئے ہیں۔ کچھ فنکار صورتحال سے بددل ہو کر گھروں میں بیٹھ گئے ہیں۔ جبکہ کئی نے کام ہی چھوڑ دیا ہے۔ اس پر سونے پر سہاگہ پی ٹی وی رات بارہ بجے جب تمام دنیا سو چکی ہوتی ہے کلاسیکل موسیقی کا پروگرام چلا دیتا ہے جو سراسر زیادتی ہے۔

# نامور کلاسیکل گائیک اُستاد سلامت علی خان

سوال: اپنے اور خاندانی پس منظر پر روشنی ڈالیں؟

سلامت علی خان: ہمارا تعلق شام چوراسی گھرانے سے ہے اور یہ ایک گاؤں کا نام ہے۔ جو انڈیا کے ضلع ہوشیار پور سے دس میل اور جالندھر سے پندرہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہمارے گھرانے کے دو بزرگ چاند خان اور سورج خان دربار اکبری میں مستقل طور پر بحیثیت گائیک ملازم تھے ان کے بعد میاں شمس علی خان، میاں لال خان، میاں مولا بخش خان، میاں ہدایت علی خان، میاں محمد خان، میاں مصر خان، میاں کریم بخش خان، میاں عنایت خان، میاں خیر الدین خان، میرے تایا استاد رحمت علی خان، اور میرے والد استاد ہدایت علی خان ہمارے گھرانے کے مشہور گویے ہوئے ہیں اور یہی ہمارے خاندان کا پس منظر اور پہچان ہیں۔

سوال: آپ نے کلاسیکل موسیقی کی تعلیم کس سے اور کہاں سے حاصل کی؟

سلامت علی خان: میری عمر پانچ سال کی تھی جب میرے والد استاد ہدایت علی خان نے مجھے گانے کی تعلیم دینا شروع کی اور میرے بڑے بھائی استاد نزاکت علی خان کی عمر دس سال کی تھی ہمارے والد صاحب نے دو سال تک موسیقی کے بہت سارے اسرار و رموز سے آشنائی کروادی اور ساتھ ساتھ گانے کی عملی ریاضت بھی کرواتے تھے۔ دو سال کی تعلیم کے بعد جالندھر شہر میں ہر سال ہر بلب کا بہت بڑا میلہ جو آج بھی لگتا ہے اور سارے ہندوستان سے گانے بجانے والے اس میں باقاعدگی سے شرکت کرتے اور مختلف تقریبات میں حصہ لیتے لہٰذا ہمارے والد گرامی نے ہم دونوں بھائیوں کو فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے میلے میں لے گئے بڑے فنکشن میں گانے کے لیے ہمیں بھی وقت دے دیا گیا اور وقت مقررہ پر ہم نے فن کا مظاہرہ کیا اور ایک گھنٹہ پورا گائے تو لوگ ششدر رہ گئے کہ اتنی کم عمری میں ایسا سر اور تال ایسے مرکی پھندے۔ ایسے زمرے اور ٹکنیکس ہندوستان کے نامور گویوں کے علاوہ فلم آرٹسٹوں نے بھی ہمیں بہت داد دی جہاں سے ہماری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ یہیں سے گانے کی ابتدا ہوئی تھی۔

سوال: اس کے بعد کیا ہوا؟

سلامت علی خان: اس کے بعد ہم نے ملتان شہر آ کر مستقل رہائش اختیار کر لی پھر ملتان کے علاوہ دیگر بزرگون دین کے عروس اور میلوں پر حاضری کے لیے جایا کرتے تھے اور لوگ ہمارے گانے کے منتظر رہتے اور ہم دونوں بھائی عارفانہ کلام کلاسیکی رنگ میں پیش کرتے عوام ہماری بڑی حوصلہ افزائی کرتے پھر ہم دونوں بھائی حضرت میاں علی محمد صاحب بسی شریف والوں کی بیعت ہو گئے اور انہوں نے ہمارے سر پر ہاتھ رکھا اور دعائیں دیں اور ہم نے اولیاء اللہ کے درباروں پر باقاعدگی سے حاضری دینی شروع کر دی۔ جن میں حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت خواجہ غلام فرید کوٹ مٹھن، گولڑہ شریف، حضرت داتا گنج بخشؒ لاہور اور دیگر ولیوں کی دعاؤں کی طفیل ہمارے نام اور شہرت میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اسی دوران ریڈیو پاکستان لاہور پر

پروگرام کرنے کا موقعہ فراہم ہوا تو ہم نے اسی محنت اور لگن سے فارم کیا چونکہ اس وقت یہاں ٹی وی نہیں آیا تھا۔ ریڈیو پاکستان کی بڑی اہمیت تھی اور لوگ ریڈیو ہی زیادہ سنتے تھے۔ ریڈیو پروگراموں کی وجہ سے ہماری شہرت میں مزید اضافہ ہوتا گیا اور آج اللہ کے فضل سے ریڈیو پاکستان کے ہر سٹیشن کی آواز لائبریری میں ہماری ریکارڈنگ موجود ہے ریڈیو ہی کی وجہ سے اس وقت کی واحد ریکارڈنگ کمپنی نے ہمارے چھوٹے بلیک چھ ایل پی بنائے اور جو انڈیا میں بھی بہت مشہور ہوئے۔ جنگ 1965ء سے پہلے ہم انڈیا بہت آتے جاتے تھے اور ہندوستان میں جہاں بھی ہماری محفل ہوتی جو رات گئے تک جاری رہتی انڈیا کے نامور گویئوں فلم کے میوزک ڈائریکٹروں اور ایکٹروں سے ہال بھرا ہوتا لتا بائی اور محمد رفیع صاحب ضرور تشریف لاتے اور وہاں کے ریڈیو ٹی وی اور پرائیویٹ اداروں کے پاس ہماری بے شمار ریکارڈنگ موجود ہیں گانا چونکہ ہندوؤں کے مذہب کا حصہ ہے اس لیے وہاں ہماری بہت پذیرائی ہوتی۔ استادان فن ہمیں جدید دور کا تان سین کہتے اور دوسرے ادارے ہمیں موسیقی کا بے تاج بادشاہ پکارتے۔ گانے کی محفلوں اور الیکٹرونک میڈیا میں اتنے چانسز ملے ہیں کہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہم اتنے مصروف ہو جائیں گے۔ ان سب باتوں کے علاوہ ہم نے محنت اور ریاضت کے ساتھ ساتھ نئے انداز بھی اپنائے جن کی وجہ سے ہم موسیقی کے شیدائی لوگوں کی نظروں میں محترم ہو گئے اور سرکار دو عالم ﷺ کے صدقے میں برصغیر تو کیا ساری دنیا میں نیک نام اور مقام بنایا ہے۔ اسی شہرت اور عزت کو دیکھتے ہوئے حکومت پاکستان نے دو مرتبہ ہمیں تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا ہے۔

سوال: آپ نے دنیا کے کون کون سے ممالک میں فن کا جادو جگایا ہے اور کون سا ملک کو اس فن کے لیے بہتر پایا ہے؟

سلامت علی خان: آپ تو جانتے ہیں کہ وطن ایمان ہوتا ہے لہذا پاکستان ہماری پہچان، جان، آن، شان، اور ایمان ہے اور ساری دنیا گھومنے کے بعد لاہور کو نہیں بھولتے کیونکہ "لاہور...... لاہور اے" اور اب لاہور میں ہم نے مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ رہی بات کہاں کہاں گئے اور گھومے تو انڈیا پاکستان کے علاوہ جرمن، فرانس، کینیڈا، امریکہ، ہانگ کانگ، بنگلہ دیش، افغانستان یہاں ہمیں سابق شاہ ہر سال دعوت پر بلایا کرتے تھے انگلینڈ، دوبئ، ابوظہبی، مسقط، اور دیگر کئی ملک شامل ہیں۔

سوال: آپ کے اس فن اور انداز گلوکاری سے متاثر ہو کر کتنے لوگ ہوں گے جو آپ سے اس کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں آپ کے شاگردوں کی تعداد کتنی ہوگی؟

سلامت علی خان: ملک صاحب ہمارے گانے اور انداز ذرا مشکل ہیں اور کلاسیکل کے لیے تو باقاعدہ وقت اور محنت درکار ہوتی ہے۔ لہٰذا اس وقت ہمارے شاگردوں کی تعداد کوئی پانچ سو کے قریب ہے لاہور میں حسین بخش گلو، تاج ملتانی، عاشق ملتانی، سیاں چودھری، صبیحہ خانم وغیرہ شامل ہیں۔ یورپ میں تو الیکٹرونک میڈیا صبح دوپہر سہ پہر شام اور رات تک مختلف پروگرام جاری رکھتا ہے اور خصوصی پروگراموں کی تشہیر ایک ایک ہفتہ قبل شروع کر دیتا ہے اور ہر روز نت نئے پروگرام آن ائیر جا رہے ہوتے ہیں۔ لیکن پاکستان پی ٹی وی ہمارے پروگرام رات گیارہ بجے کے بعد ٹیلی کاسٹ کرتا ہے۔ جن کو ہم خود نہیں دیکھ پاتے۔ دوسروں کی بات چھوڑیں یہ سراسر زیادتی ہے۔ اور ان کی ایسی حرکتوں سے پی ٹی وی کے پروگراموں کی لنگ دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ کیونکہ یہاں کا ہر پیش کار اپنے آپ کو عقل کل تصور کرتا ہے اور کسی شریف آدمی سے مشورہ کرنا بھی اپنی توہین سمجھتا ہے۔ جس کی وجہ سے سارا قومی پریس اور عوام ٹی وی کے پروگراموں سے ناخوش ہیں۔

سوال: آپ کو لندن یا امریکہ جانے کا خیال کیونکر اور کیسے آیا؟

سلامت علی خان: اللہ ہی بڑا سبب پیدا کرنے والا ہے لہٰذا ہمیں ایک پروموٹر مل گیا جو ہمیں لندن لے گیا اور وہاں ہم نے مختلف شہروں میں تیس سے زیادہ سولو سٹیج شو میں حصہ لیا جو بڑے کامیاب رہے وہاں کے عوام نے ہمارے انداز گلوکاری کو پہلی بار سنا اور بہت پسند کیا بس یہاں سے سلسلہ چل نکلا پھر ہمیں وہاں سے ایک تو کیا کئی لوگ مل گئے جنھوں نے مجبور کیا کہ یہاں لندن میں ایک میوزک اکیڈمی استاد سلامت علی خان کے نام ہونی چاہیے لہٰذا لوگوں کے اسرار پر وہاں اکیڈمی بنادی گئی جو آج بھی بڑی کامیابی سے شائقین کو فن موسیقی سے آگاہی حاصل کروارہی ہے۔ دوسرے بچوں نے امریکہ میں میرے ہی نام کو میوزک کالج بنا رکھا ہے جو بڑی کامیابی سے چل رہا ہے۔

سوال اپنی زندگی کا کوئی ایسا اہم واقعہ سنائیں جو آپ کو آج تک نہیں بھولا؟

سلامت علی خان: واقعات تو بہت ہیں لیکن میں آپ کو ہالینڈ کا ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں جب ہم 1970ء میں ہالینڈ گئے تو وہاں اکثر گانے کے پروگرام رات کو ہی ہوتے ہیں اور وہاں کے آرگنائزر نے کہا جس کا نام وکیل تھا کہ خان صاحب آپ جب بھی تشریف لاتے ہیں تو یہاں شعر و نغمہ کی محفل میں رات ہی راگ گاتے ہیں میں نے کہا یہ فنکشن ہی رات کو ہوتے ہیں لہٰذا ہمیں قاعدے اور اصول کے مطابق ہی راگ گانے چاہئیں۔ تو پروموٹر نے کہا کہ اگر ہم صبح کا پروگرام بنالیں تو پھر...... میں نے کہا کہ تو پھر ہم صبح کے راگ گائیں گے آرگنائزر نے کہا صبح کے راگ کون کون سے ہوتے ہیں میں نے کہا للت، بیراگی بھیرویں، بھبھاس، آہیر بھیروں، بھیرویں، یہ سب راگ راگنیاں رات اڑھائی بجے سے شروع ہوتے ہیں۔

❁❁❁


# اردو ادب کے مشہور افسانے

کتاب **اردو ادب کے مشہور افسانے** بھی کتاب گھر پر دستیاب ہے جس میں درج ذیل افسانے شامل ہیں۔ (آخری آدمی، پسماندگان، انتظار حسین)؛ (آپا، ممتاز مفتی)؛ (آنندی، غلام عباس)؛ (اپنے دُکھ مجھے دے دو، وہ بڈھا، راجندر سنگھ بیدی)؛ (بلاؤز، کالی شلوار، سعادت حسن منٹو)؛ (عیدگاہ، کفن، شکوہ شکایت، منشی پریم چند)؛ (گڈریا، اشفاق احمد)؛ (توبہ شکن، بانو قدسیہ)، (گنڈاسا، احمد ندیم قاسمی)؛ (حرام جادی، محمد حسن عسکری)؛ (جینی، شفیق الرحمن)؛ (لحاف، عصمت چغتائی)؛ (لوہے کا کمربند، رام لعل)؛ (ماں جی، قدرت اللہ شہاب)؛ (مٹی کی مونا لیزا، اے۔حمید)؛ (اوورکوٹ، غلام عباس)؛ (مہالکشمی کا پل، کرشن چندر)؛ (ٹیلی گرام، جوگندر پال)؛ (تیسرا آدمی، شوکت صدیقی) اور (ستاروں سے آگے، قرۃ العین حیدر)۔

یہ کتاب **افسانے** سیکشن میں پڑھی جاسکتی ہے۔

# پرائیڈ آف فارمنس ہولڈر

# برصغیر پاک و ہند کے عظیم گلوکار مہدی حسن

دنیائے موسیقی کے حوالے سے برصغیر پاک و ہند میں دو نام بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔ ان میں ایک نام تھا ملکہ ترنم نور جہاں کا جبکہ دوسرا نام شہنشاہ غزل مہدی حسن کا ہے۔ مہدی حسن بھارت کے صوبے راجستھان کی ڈسٹرکٹ جھونجرو کے گاؤں بونا میں 1933ء کو مقبول گائک گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عظیم خان شاہی دربار میں اہم مقام رکھتے تھے۔ مہدی حسن کلاسیکی موسیقی کے حوالے سے اپنی نسل میں سولہویں نمبر پر ہیں۔ 1946ء میں پاکستان کے علاقے چیچہ وطنی میں آ کر آباد ہو گئے۔ یوں تو زندگی کے کسی بھی شعبے میں باکمال، باوقار ہونا اس صاحب فن کی شوکت عظمت کی دلیل ہوتی ہے لیکن بعض شخصیات اپنے حسن و کمال فن شہرت اور ہمہ گیر مقبولیت کی بنا پر عہد آفرین دکھائی دیتی ہیں۔ وطن عزیز پاکستان کے مقبول اور باکمال فنکار مہدی حسن خاں اب تک 60 ہزار گانے فلموں کے لیے گا چکے ہیں۔ انہوں نے 1952ء میں فلم شکار کے لیے پہلا گانا ''میرے خیال و خواب کی دنیا لیے ہوئے'' گایا تھا۔ آج جبکہ خاں صاحب اپنی دوسری اہلیہ کے انتقال کے بعد فالج کی وجہ سے خاصے بیمار ہیں، ان کے پرستاروں کا بڑا حلقہ ان کی درازی عمر اور صحت کاملہ کے لیے دعا گو ہے کہ سنگیت کا یہ آفتاب پوری آب و تاب سے سروں کی روشنی پھیلاتا رہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور معاشرے میں پیدا ہونے والی نت نئی تبدیلیوں کے باعث، جنہوں نے ہماری سماجی اور ثقافتی اقدار کے ساتھ ہی ہماری موسیقی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور پھر جدیدیت کے ان تقاضوں نے دیرینہ مشرقی روایات کے حسن کو بھی بڑی حد تک بدل ڈالا ہے، خان صاحب مہدی حسن نے بھی ان دنوں نامور فنکاروں کی طرح گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ پچاس کی دہائی کے اختتام تک برصغیر میں خالصتاً غزل کی گائیگی کے حوالے سے فلموں میں ایک نام بڑا محترم رہا وہ نام طلعت محمود کا تھا۔ طلعت محمود بھی بھارتی فلمی ماحول میں تبدیلیوں کے پیش نظر پس منظر میں چلے گئے اور دیار غیر میں جا بسے۔ پھر جب وطن عزیز میں مہدی حسن کی آواز کا جادو چلا تو لوگ یہ بھی بھول گئے کہ پچاس کی دہائی تک برصغیر میں طلعت محمود نام کا ایک گلوکار بھی تھا۔ مہدی حسن پاکستان آنے کے کافی عرصے بعد تک بھی فلمی صنعت سے دور رہے۔ یہاں تک کہ پنجاب میں سرگودھا اور خوشاب میں موٹر میکینک کے پیشے کو سلسلہ روز و شب بنائے رکھا لیکن ان کے اندر جو فنکار چھپا بیٹھا تھا اسے بہر حال ایک نہ ایک دن تو منظر عام پر آنا ہی تھا۔ خاں صاحب مہدی حسن کے بھائی غلام علی پنڈت حالانکہ ریڈیو پاکستان کراچی میں معروف کمپوزر بھی تھے۔ کراچی منتقل ہونے کے بعد انہوں نے آواز کی دنیا سے وابستگی اختیار کرنے میں عملی دلچسپی لینا شروع کی۔ کراچی میں بننے والی فلم ''شکار'' میں پہلی بار نغمہ ریکارڈ کروایا، پھر ان کی اپنی ہی کمپوز کی ہوئی فیض احمد فیض کی غزل ''گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے'' نے انہیں شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ پھر اس غزل کو مہدی حسن کی آواز میں موسیقار رشید عطرے نے ریاض شاہد کی ہدایت میں بننے والی فلم فرنگی میں اداکار علاؤالدین پر فلمایا گیا جس کے بعد ریاض شاہد مرحوم کی بحیثیت ہدایت کار پہلی فلم ''سسرال'' میں موسیقار حسن لطیف نے مہدی حسن کی آواز میں ایک نغمہ ''جس نے میرے دل کو درد دیا'' ریکارڈ کیا، جو بے حد مقبول ہوا، پھر اس دور میں موسیقار خورشید انور نے اپنی ہی تحریر کردہ کہانی پر ایک فلم گھونگھٹ ڈائریکٹ کی، جس کا

بنیادی تعلیم ہی سنگیت تھا۔ اس میں مہدی حسن کی آواز میں یہ نغمہ "مجھ کو آواز دے تو کہاں ہے" ہر زبان پر عام تھا اور یوں مہدی حسن اپنے اس فنی سفر پر تزک احتشام سے رواں دواں رہے۔ شہرت، دولت، عزت اور ہمہ گیر مقبولیت ان کے قدم چومتی رہی۔ مہدی حسن کی آواز میں سوز گداز اور دلفریب سوچ ہے، جو نغمے کو ایک حسن سحر انگیز عطا کرتا ہے۔ یہی منفرد انداز اور رچاؤ انہیں دوسرے گلوکاروں سے ممتاز بنا دیتا ہے۔ ان کے اسی انداز کو کسی حد تک اپناتے ہوئے بھارتی گلوکار جگجیت سنگھ نے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ فن کسی بھی مذہب، عقیدہ، مسلک یا مخصوص نظریاتی گروہی اور لسانی فکر و نظر سے ماورا ہوتا ہے۔ وہ صرف اور صرف فن اور بس فن ہوتا ہے۔ کبھی وہ سہگل کے روپ میں، کبھی محمد رفیع کی صورت میں، کبھی مکیش، کشور اور مہدی حسن کے منفرد اسلوب میں دکھائی دیتا ہے اور حسن زا اور ترنم خیزیوں سے لاکھوں عوام کی دھڑکنوں میں بس جاتا ہے۔ بھارت کیا پوری دنیا میں جہاں اردو اور ہندی بلکہ مشرقی موسیقی کو سنا اور سمجھا جاتا ہے لتا منگیشکر کو ایک مہان (یعنی بڑی) گلوکارہ مانا جاتا ہے۔ ساز و آواز ہی کی اس دیوی کی فنکارانہ عظمتوں سے فرار کسی بھی صاحب فرد کے لیے ممکن نہیں۔ گیتوں کی یہی دیوی لتا منگیشکر کہتی ہے "مہدی حسن جی مہاراج کے گلے میں بھگوان بولتا ہے" وہی بمبئی میں ان کے قیام کے دوران ننگے پاؤں قیام گاہ تک پہنچ کر ان کے قدموں کو چھوتی ہے۔ ایک فنکارہ کا انداز عقیدت و محبت دوسرے فنکار کے لیے بہت بڑی بات ہے۔ یوں تو خان صاحب مہدی حسن نے بے شمار گیت، غزلیں اور نغمے گائے چند ایسے جنھوں نے مہدی حسن کو بام عروج بخشا۔ گلوں میں رنگ بھرے (فرنگی)، تم ضد تو کر رہے ہو (داغ)، رنجش ہی سہی (محبت)، ہمیں کوئی غم نہیں تھا غم زندگی سے پہلے (شب زنجیر)، یوں تو زندگی کی راہ میں (آگ)، زندگی میں سبھی پیار کیا کرتے ہیں (عصمت)، دل ویراں ہے (آئینہ)، مجھے تم نظر سے گرا رہے ہو (دوراہا)، اب کے ہم بچھڑے تو (انگارے)، تمہیں دیکھوں تمہارے چاہنے والوں کی محفل میں (پیا ملن کی آس)، ایک حسن کی دیوی سے مجھے پیار ہوا تھا (میری زندگی ہے نغمہ)، یہ پھول جیسے چہرے (دیور بھابی)، سمیت دیگر بے شمار غزلیں شامل ہیں۔

مہدی حسن صرف ایک شخصیت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا نام ہے جو اپنی ہستی میں پوری اکیڈمی سموئے ہوئے ہیں۔ گزرتے وقت نے مہدی حسن سے صحت کی قربانی لی ہے لیکن ان کے فن کا جادو اب بھی اپنے پورے عروج پر ہے آیئے ان سے ان کے فنی زندگی کے حوالے سے گفتگو کریں۔

سوال: کسی طبیعت ہے؟

مہدی حسن: فالج کا اٹیک ہوا تھا، اس کی فزیوتھراپی چل رہی تھی۔ یہ اکثر گانے بجانے والوں کو ہو جاتا ہے۔

سوال: ہم آپ کی زندگی کے بارے میں جاننا چاہیں گے؟

مہدی حسن: میری زندگی کا کوئی بھی گوشہ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے، لوگوں کو خوشبو کی طرح میری زندگی کی ہر بات سے واقفیت ہے۔ کلاونت گھرانے سے میرا تعلق ہے۔ میرے بزرگ بہت پرانے موسیقاروں کی صف میں آتے ہیں۔ میں ان کی سولہویں پشت میں سے ہوں اور میری اولاد سترہویں پشت ہے جو اس فن سے وابستہ ہے۔ آٹھ سال کی عمر میں مہاراجہ بڑودا کے سامنے پہلی بار 1942ء میں کلاسیکل گا کر گانے کی ابتداء کی تھی۔ میرے والد عظیم خاں، چچا اسماعیل خاں، بڑے بھائی غلام قادر خاں نے میری تربیت کی۔

سوال: کچھ یاد ہے کہ آپ کی پہلی مشہور غزل کون سی تھی؟

مہدی حسن: میری پہلی غزل جو مشہور ہوئی وہ "میرے خیال و خواب کی دنیا لئے ہوئے پھر آ گیا کوئی رخ زیبا لئے ہوئے"۔ 1953ء میں یہ غزل موسیقار غلام حیدر، افضل علی، محمد حسین نے فلم "شکار" کے لئے مرتب کی تھی۔

سوال: آج کل آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟

مہدی حسن: ریکارڈنگز وغیرہ کروا رہا ہوں اور فکر معاش میں مبتلا ہوں۔

سوال: آپ کے صاحبزادوں میں صرف آصف حسن گا رہے ہیں، وہ کیسا گا رہے ہیں؟

مہدی حسن: اب آصف حسن بہت اچھا گانے لگے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے باقاعدہ تربیت حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ میرے بیٹے شہزاد حسن بھی گائیکی کی طرف آ رہے ہیں۔ میرے ایک بیٹے عارف حسن بہت اچھا طبلہ بجاتے ہیں۔

سوال: اب تک اندازاً کتنی غزلیں گائی ہیں؟

مہدی حسن: میرا خیال ہے کہ گیت اور غزلوں کو ملا کر مجموعی تعداد 60 ہزار بنتی ہے۔

سوال: کلاسیکل چھوڑ کر غزلوں کی طرف آنے کی وجہ؟

مہدی حسن: دل میں بہت کچھ کر دکھانے کی خواہش تھی۔ کلاسیکل کے ساتھ کچھ مختلف کرنا چاہتا تھا اس لئے میں نے غزلوں کی جانب دھیان دیا، ویسے یہ بات بھی تھی کہ میری آواز کلاسیکل کے لیے موزوں نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ کچھ نیا کیا جائے یہی سوچ کر میں نے غزلوں کو بچانے کے لئے اسے راگوں کی چاشنی میں ڈھال دیا۔ غزلوں کو راگوں میں کمپوز کیا تو ان کی شکل نکھر گئی اور یہ سلسلہ کچھ اتنا پسند کیا گیا کہ بعد ازاں میری تمام غزلیں راگوں میں کمپوز ہوئیں۔ جس وقت کا راگ تھا اسی وقت میں اسے کمپوز کیا، اس کی طرزیں بنیں اس لیے وہ بہت موزوں رہیں۔

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

بہت نفیس راگ ہے جھنجوٹی۔ اس سے بہتر اور کوئی راگ نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ بھوپالی پہاڑی، بھیروی ٹاٹھ وغیرہ کو بھی میں نے غزلوں میں آزمایا۔ مشہور غزل

دیکھ تو دل کے جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

یا پھر

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

یا

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تیرے محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

بھی انہی راگوں میں ہیں۔ ان راگوں کے ذریعے میں نے غزلوں کو زندہ رکھنے کی سعی کی ہے

سوال: حکومتی سطح پر آپ کے فن کی پذیرائی کس انداز میں ہوئی؟

مہدی حسن: ایوب خان نے مجھے پرائیڈ آف پرفارمنس دیا، اس کے علاوہ تمغۂ امتیاز اور بے شمار نگار ایوارڈ مل چکے ہیں۔ سینکڑوں شہروں میں میری تاج پوشی کی جا چکی ہے۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ موسیقی روح کی غذا ہے اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

مہدی حسن: یہ بات بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔ راگوں میں جادوئی تاثیر ہوتی ہے، راگ تو وہ ہیں جن کو سن کر لوگ سو جاتے تھے، بعض راگ ایسے ہیں جس کی وجہ سے دھاتیں بن جاتی ہیں۔

سوال: آج موسیقی اپنا سابقہ مقام نہیں رکھتی اس کی وجہ؟

مہدی حسن: ہمارے دور میں اگر موسیقی کامیاب تھی تو اس کا سبب یہ تھا کہ ہم اپنے فن کا بہت زیادہ احترام کیا کرتے تھے۔ ہمارے بزرگوں کی ہمیں ہدایت تھی کہ بغیر وضو کے سازوں کو ہاتھ مت لگانا، صاف ستھرے کپڑے پہننے کی ہدایت تھی۔ راگوں کی بے حرمتی نہیں ہونے دی۔ پاکیزگی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا، بے وقت گانے کا بھی حکم نہیں تھا ہر راگ کا، ہر توڑی کا وقت مخصوص ہے۔ 18,20 توڑیاں ہیں جنہیں الگ الگ وقت میں گایا جاتا ہے۔ لیکن اب اسے لوگوں نے خراب کر دیا۔

سوال: فن موسیقی میں غزل کیا مقام رکھتی ہے؟

مہدی حسن: غزل گانے سے، راگ گانے سے برتن ٹوٹ سکتے ہیں۔ غزل کا بہت بڑا مقام ہے، گلاس تو میرے گانے سے بھی ٹوٹے ہیں، برتن ٹوٹ گئے ہیں۔ ایسے بزرگوں نے پتا نہیں کیا، کیا کچھ کیا ہے کہ فن کو یہ درجہ عروج ملا ہے کہ پانی میں آگ لگ جائے، بارش ہو جائے یا برتن ٹوٹ جائے لیکن آج وہ کام نہیں ہو رہا۔

سوال: کیا غزل کے مقام سے آپ مطمئن ہیں؟

مہدی حسن: نہیں میں مطمئن نہیں ہوں، بہت غلط ہو رہا ہے، آج کل جو کام ہو رہا ہے اس سے غزل تنزلی کی طرف جا رہی ہے۔

سوال: پاپ میوزک سے موسیقی پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں؟

مہدی حسن: مجھے آگے بہت تاریکی نظر آ رہی ہے۔ میڈیا پر راگوں کا قتل عام ہو رہا ہے، باہر سے آنے والے بے تکی پاپ میوزک کے آگے ٹی وی، فلم سب نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں، پاپ میوزک سے راگوں کی بے حرمتی ہوئی ہے، راگوں کا قتل ہوا ہے، اس سے فن موسیقی کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ پاپ میوزک بے معنی چیز ہے، بے ہنگم اچھل کود کو شعر و شاعری یا موسیقی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، یہ ہمارے معاشرے کے بالکل خلاف ہے۔ ہماری ثقافت کو جس موسیقی نے زندہ رکھا ہوا ہے وہ معیاری شاعری ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ پاپ میوزک کی آڑ میں راگوں اور اس میں سموئی ہوئی غزلوں اچھی اور معیاری شاعری کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب فن قتل ہو گا تو فنکار کیسے زندہ رہے گا۔

سوال: پاکستان میں کلاسیکل موسیقی کا کیا حال ہے؟

مہدی حسن: کوئی حال نہیں ہے، پاکستان میں کلاسیکل موسیقی بے حال ہے، دم توڑ رہی ہے کیونکہ لوگ اب اسے سمجھتے نہیں ہیں۔ اس وقت کلاسیکل گھرانوں کے نمائندگان بھی پاپ میوزک کی طرف آ رہے ہیں جسے دیکھ کر میں کلاسیکل موسیقی کی طرف سے مایوس ہو چلا ہوں، خوفزدہ ہوں کہ کیا ہو گا۔

سوال: تنزلی کی وجہ کیا ہے؟

مہدی حسن: موسیقی کو صحیح انداز میں پیش نہیں کیا جا رہا جس کی وجہ سے موسیقی ترقی نہیں کر رہی بلکہ اس کی صورتحال ناگفتہ بہ ہے۔

سوال: کلاسیکل موسیقی اور غزل کا رجحان نوجوان نسل میں کم کیوں ہے؟

مہدی حسن: بور ہو کر بھاگ جاتے ہیں۔ عوام کے رجحانات بدل رہے ہیں۔

سوال: کیا اس طرح کلاسیکل موسیقی ختم نہیں ہو جائے گی؟

مہدی حسن: نہیں، کلاسیکل موسیقی ختم نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ کچھ اور ہے۔ اب بھی ایک حلقہ ایسا ہے جو کلاسیکل موسیقی کو سمجھتے ہیں وہ اس کو نہایت باریک بینی سے دیکھتے ہیں۔

سوال: کس چیز نے کلاسیکل موسیقی کی روح کو ختم کیا ہے؟

مہدی حسن: کمرشلزم نے۔ کلاسیکل موسیقاروں کی اب وقعت نہیں ہے فکر معاش سے مجبور ہو کر لوگ دوسری طرف رخ کر رہے ہیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم غلط میوزک اور غلط شاعری نہیں سن سکتے۔ ہم جن پروگراموں کو ٹی وی پر دیکھنا چاہتے ہیں وہ راگ موسیقی کی اصل روح ہیں۔ ان راگوں کو ٹی وی سے دور کر دیا گیا ہے۔

سوال: کچھ اندازہ ہے کہ کتنے شاگرد ہیں؟

مہدی حسن: کچھ یاد نہیں، سب ہی نے مجھ سے کچھ نہ کچھ سیکھا ہے۔ پرویز مہدی، غلام عباس، جگجیت سنگھ جیسے گانے والے میرے شاگرد ہیں۔

سوال: آپ پاکستان اور ہندوستان کے کن گلوکاروں کو پسند کرتے ہیں؟

مہدی حسن: سلامت علی خان، بڑے غلام علی خان کو بہت سنا ہے، ان کے بھائی برکت علی خان کی ٹھمریاں سنی ہیں۔ بھارت میں لتا منگیشکر، رفیع کو سنتا ہوں۔

سوال: پاکستان میں موسیقی کی ترویج کے لئے کون سے ادارے فعال ہیں؟

مہدی حسن: آرٹس کونسل موسیقی کی ترویج میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ مگر جہاں پیسے خرچ کرنے کی بات آتی ہے وہاں یہ پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور فنکاروں کو خود ہی اپنے لئے کام تلاش کرنا پڑتا ہے۔

سوال: کیا آپ کے زیر نگرانی کوئی میوزک اکیڈمی قائم ہے؟

مہدی حسن: ایک نہیں کئی اکیڈمیاں ہیں جو میرے زیر نگرانی ہی کام کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ امریکہ کے شہروں کیلی فورنیا، لاس اینجلس، راڈو وغیرہ میں میوزیکل سکول بنائے گئے ہیں جہاں پاکستانیوں، ہندوستانیوں اور امریکیوں کو موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے۔

سوال: بہت سے گلوکار آپ کی پیروڈی کرتے ہیں آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟

مہدی حسن: تکلیف بھی ہوتی ہے اور خوشی بھی۔ جو صحیح معنوں میں نقل کرتے ہیں اس کی خوشی ہوتی ہے۔ کہ چلو یونہی سہی مگر جو لوگ نقل بھی ڈھنگ سے نہیں کر پاتے ان کو دیکھ کر اور سن کر بہت تکلیف ہوتی ہے۔

سوال: کیا آپ نے کبھی سوچا کہ آپ اپنے پرانے گانوں کے وڈیوز دوبارہ تیار کرائیں جیسا کہ دیگر اس طرح سے کر کے لاکھوں روپے کما رہے ہیں؟

مہدی حسن: اگر ہم بنا کر بھیجتے ہیں تو وہ چوری ہو جاتے ہیں۔ چوری در چوری ہو رہی ہے کوئی کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

سوال: آپ کے خیال میں کاپی رائٹ کے قوانین میں سختی کی جانی چاہئے؟

مہدی حسن: جی ہاں، جب قوانین موجود ہیں تو ان پر سختی سے عملدرآمد ہونا چاہئے تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہو، کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔

سوال: حکومتی سطح پر کیا سہولیات حاصل ہیں؟

مہدی حسن: ایوارڈ وغیرہ دے دیئے جاتے ہیں۔ مالی اعانت نہیں کی جاتی۔ ہمارے لئے اعلان کئے جاتے ہیں مگر اس ضمن میں ہمیں ہی

اندھیرے میں رکھا جاتا ہے، کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم منتظر ہیں کہ ہمیں کب کیا دیتے ہیں۔

سوال: کیا اس ضمن میں آپ نے کچھ اقدامات کئے ہیں؟

مہدی حسن: ہم صبر کر کے بیٹھے ہیں۔ اللہ مالک ہے، ہم کچھ نہیں کر سکتے کیوں کہ ہماری سنی نہیں جائے گی، اب تو ہم عوام اور میڈیا کے رحم و کرم پر ہیں۔ اگر میڈیا اپنا کردار ادا کرے تو شاید سینئر فنکاروں کا کچھ بھلا ہو جائے۔

سوال: ہمارے ہاں فنکاروں کی زندگی میں ان کے فن کی قدر نہیں کی جاتی، ان کے مرنے کے بعد انہیں پوجا جاتا ہے۔ یہ رجحان فنکاروں کو کس طرف لے جا رہا ہے؟

مہدی حسن: ایسے اقدامات فنکاروں کو ختم کر رہے ہیں۔ اگر زندگی میں فنکاروں کی قدر کر لی جائے تو شاید وہ زیادہ بہتر انداز میں زندگی گزارتے ہوئے فن کی خدمت کر سکیں اور کچھ عرصہ اور زندہ رہ سکیں۔

سوال: آپ دیگر ممالک اور پاکستان کے سینئر فنکاروں میں کیا فرق پاتے ہیں؟

مہدی حسن: دیگر ممالک کے سینئر فنکار بہت عزت و آرام کی زندگی گزار رہے ہیں جب کہ ہمارے ہاں جب فنکار سینئر ہو جائے تو اسے بیکار تصور کیا جاتا ہے، سینئر فنکاروں کی بالکل قدر نہیں ہے۔ میں نے اس فن کو پوری زندگی دی ہے مگر ہمیں کوئی سہولت حاصل نہیں ہے۔ جب کہ دیگر ممالک میں کلاسیکل فنکاروں کی قدر ہے۔ میں ٹورنٹو میں تھا، لتا منگیشکر جو وہاں آئی ہوئی تھیں اپنی بہن مینا منگیشکر کے ہمراہ مجھ سے ملنے آئیں۔ میں نے دیکھا کہ ان کے پاؤں ننگے تھے، میں نے اس کی وجہ دریافت کی تو ان کی بہن نے کہا کہ یہ آپ کے احترام میں ننگے پاؤں آپ سے ملنے آئی ہیں۔ پھر لتا منگیشکر نے جو الفاظ میرے بارے میں کہے وہ سب کو ہی معلوم ہیں۔ بھارت کے کئی شہروں میں مجھے بھگوان کا اوتار تو کہیں دیوتا قرار دیا گیا۔ بنگلہ دیش میں بعض لوگوں میرے پاؤں کو بوسہ دینے کی کوشش کرتے رہے۔ میں نے اسرائیل کو چھوڑ کر ساری دنیا کا دورہ کیا ہے۔ نیپال میں میری پذیرائی 21 توپوں کی سلامی سے کی گئی، بھارت میں مجھے پہلا سہگل ایوارڈ دیا گیا۔ میں نے پاکستان افغانستان دوستی میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ عزت میرے رب نے مجھے دی ہے مگر ہمارے ملک میں سینئر فنکاروں کا کوئی حال نہیں ہے۔ ہمیں مسلسل نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

سوال: پاک بھارت دوستی کے موسیقی پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟

مہدی حسن: پاک بھارت دوستی سے موسیقی پر یقیناً مثبت اثرات مرتب ہوں گے، ترقی کی راہیں کھلیں گی۔ کہ ایک مرتبہ بھارتی دورے کے دوران سابق بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی نے مجھے آفر کی تھی کہ آپ بھارتی شہریت لے لیں آپ کو حکومت کی جانب سے ایک عالیشان گھر اور شاپنگ سینٹر دیا جائے گا لیکن میں نے ان سے معذرت کر لی۔ اس کے علاوہ سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے بھی مجھے سندھ کا گورنر بنانے کی پیشکش کی تھی اور اسی طرح بے نظیر بھٹو بھی مجھے آفر کر چکی ہیں لیکن ہر بار میں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ عوام حکمرانوں کو اس وقت یاد رکھتے ہیں جب تک وہ کرسی پر ہوتے ہیں جبکہ میرے پاس ایسا فن ہے کہ مجھے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے فلم انڈسٹری سے کسی قسم کا کوئی گلہ شکوہ نہیں ہے۔ موجودہ گلوکار جیسا بھی گا رہے ہیں صحیح گا رہے ہیں کیونکہ انہیں عوام پسند کر رہے ہیں، جب انہیں عوام پسند نہیں کریں گے تو وہ خود بخود شوبز کی دنیا سے آؤٹ ہو جائیں گے۔ میرے پاس ساری دنیا سے دوستوں اور پرستاروں کے فون آتے رہتے ہیں۔ بھارت سے دلیپ کمار، لتا منگیشکر، آشا بھوسلے اور دیگر کے فون آتے رہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے پورے کیریئر کے

دوران کھویا کچھ نہیں ہے صرف پایا ہی پایا ہے۔

سوال: ملکہ ترنم نور جہاں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

مہدی حسن: ملکہ ترنم نور جہاں بہت بڑی گلوکارہ تھیں، ایسی آواز صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ مجھے آج بھی یہ یقین نہیں آتا کہ ملکہ ترنم نور جہاں اس دنیا میں نہیں ہیں۔

سوال: نئی نسل کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

مہدی حسن: میں نئی نسل سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ کرو سوچ سمجھ کر کرو، ایمانداری سے چلو، بے ایمانی، چوری مت کرو اس سے تمہارا فن مر جائے گا۔ اس میں خود کو بھی نقصان ہے اور فن کے ساتھ بھی زیادتی ہے۔

❁❁❁


# اردو ادب کے مشہور افسانے ۲

**اردو ادب کے مشہور افسانے** (جلد دوم) بھی کتاب گھر پر دستیاب ہے جس میں شامل افسانے ہیں:
(کالی بلا شوکت صدیقی)؛ (قیدی، ابراہیم جلیس)؛ (اخروٹ جھا چوہا بھیس، ممتاز مفتی)؛ (سیب کا درخت، بوتل کا جن اے۔حمید)؛ (فاصلہ، واجدہ تبسم)؛ (ادھا، گلزار)؛ (مجید کا ماضی، پوجا پھڈے باز، سعادت حسن منٹو)؛ (مادرزاد، خواجہ احمد عباس (بدام رنگی، بلونت سنگھ)؛ (بیہودہ خاوند، کنہیا لال کپور)؛ (عجیب قتل، ش۔م۔جمیل)؛ (اوپر گوری کا مکان، آغا بابر)؛ (لاٹری، منشی پریم چند)؛ (صاحباں مرزا، علی حیدر ملک)؛ (دل ہی تو ہے، بھنور، گوندنی، غلام عباس)؛ (مولوی مہرباں علی، ابن انشاء) (لیمن جوس، چترسین)؛ (غیر قانونی مشورہ، لوحِ مزار، موپاساں)؛ (سوتی سالگرہ، اشفاق احمد)؛ (ایک تھی فاختہ، محمد منشاء یاد)۔
یہ کتاب **افسانے** سیکشن میں پڑھی جا سکتی ہے۔

# گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ ہولڈر

# مایہ ناز لوک گلوکار عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی

لوک گیت کسی بھی دھرتی کی پہچان' ثقافت' تہذیب اور داستانوں کا سریلا وسیلہ ہوتے ہیں اور لوک گیت گانے والا گلوکار یعنی فوک سنگر سریلا داستان گو بلکہ صحیح طور پر ثقافت کا سفیر ہوتا ہے۔ جس کا لباس' زبان' گیت' اس کی شاعری' سرحتیٰ کہ گانوں کے ویڈیو بھی اس کی وطن سے محبت کا ثبوت ہوتے ہیں۔ ایسا ہی سریلا داستان گو اور محب وطن گلوکار عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی بھی ہے جس نے تقریباً تیس برس پہلے فوک گانا شروع کیا اور آج تک اس کے گیتوں سے محبت کم نہ ہوئی۔ وطن سے محبت اس کے گیتوں میں رچی بسی ہے۔ وہ 19 اگست 1951 کو عیسیٰ خیل (میانوالی) میں پیدا ہوئے۔ اب تک ان کے 401 آڈیو البم مارکیٹ میں آ چکے ہیں۔ وہ ایک سیدھے سادھے انسان ہیں' بناوٹ اور مصنوعی پن پسند نہیں کرتے' منافقت سے نفرت کرتے ہیں اور ہر بات دوٹوک انداز میں کرنے کے عادی ہیں۔ لوگوں کی مدد کرتے ہیں مگر اس کی تشہیر پسند نہیں کرتے۔ شاید اُن کی انہی اچھائیوں اور فن سے جنون کی حد تک محبت نے اسے اُنہیں اس قابل کر دیا ہے کہ آج ان کا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں پچھلے پچیس برس سے لگاتار سب سے زیادہ گیت گانے والوں کے ساتھ لکھا چلا آ رہا ہے۔ کیونکہ ہر تین' چار ماہ کے وقفہ کے بعد وہ اپنا البم مارکیٹ میں لاتے ہیں اور ان کے پرستار ہر البم کو اسی طرح خوش آمدید کہتے ہیں جیسے یہ پہلا البم ہو یا طویل وقفہ کے بعد آیا ہو۔ آیئے ان سے فنی زندگی کے حوالے سے بات کریں۔

سوال: آج کل آپ کہاں ہوتے ہیں؟

عطاءاللہ: دراصل بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں مستقل سکونت انگلینڈ میں اختیار کر لی ہے۔ آنا جانا لگا رہتا ہے۔ بس ریکارڈنگ کرا کے واپس چلا جاتا ہوں۔

سوال: باہر کیوں شفٹ ہو گئے' کیا پاکستان پسند نہیں آیا؟

عطاءاللہ: ایسی بات تو ہو ہی نہیں سکتی' پاکستان کی تو کیا بات ہے۔ اس جیسی سرزمین تو کہیں نہیں۔ بلکہ میں تو اتنا آتا جاتا رہتا ہوں کہ لگتا ہی نہیں کہ میں یہاں نہیں ہوں۔ ویسے بھی میں نے بتایا نا کہ بچوں کی تعلیم کی وجہ سے انگلینڈ جانا پڑا۔

سوال: تعلیم کے لئے بچوں کو وہاں کیوں لے گئے کیا پاکستانی نظام تعلیم سے آپ مطمئن نہیں؟

عطاءاللہ: میں تو چاہتا تھا کہ بچے کم از کم میٹرک تک پاکستان میں پڑھیں لیکن سانول (بڑا بیٹا) نے کہا کہ میں باہر جا کر انفارمیشن ٹیکنالوجی پڑھنا چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ اگر آپ کے پاس وسائل ہوں تو بچوں کی جائز خواہشات پوری کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔

سوال: تو کیا اب ہمیشہ وہیں رہنے کا ارادہ ہے؟

عطاءاللہ: نہیں' بچوں کی تعلیم مکمل ہو جائے تو میں اور بازغہ تو ضرور واپس آ جائیں گے۔ ہم تو اب بھی نہیں جانا چاہتے تھے مگر بچے اتنے

چھوٹے ہیں کہ انہیں اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔

سوال: کیا بچے واپس نہیں آئیں گے؟

عطاء اللہ: میری خواہش تو ہو گی کہ واپس آ جائیں لیکن میں زبردستی نہیں کروں گا۔

سوال: آپ کے کتنے بچے ہیں؟

عطاء اللہ: میرے تین بچے ہیں' بڑا بیٹا سانول پندرہ سولہ سال کا ہے) بیٹی لاریب (بارہ سال کی) اور پھر چھوٹا بیٹا بلاول ہے۔

سوال: آپ اپنی ابتدائی زندگی کے متعلق کچھ بتائیں۔

عطاء اللہ: جیسا کہ میرے نام سے بھی ظاہر ہے میں پنجاب کی آخری تحصیل عیسیٰ خیل میں پیدا ہوا۔ نسلاً میرا تعلق قبائلی پٹھانوں سے ہے جو گانے بجانے کو جرم کی حد تک برا سمجھتے تھے۔ میٹرک میں نے عیسیٰ خیل سے کیا' ایف اے فیصل آباد سے اور بی اے میانوالی سے کیا۔ گانے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ بزم ادب کی کلاس میں گانا پسند کرتا تھا اور اسمبلی میں بھی اکثر نعت یا اقبال کا کلام پڑھتا تھا۔

سوال: کیا بچپن میں شرارتی تھے؟

عطاء اللہ: نہیں میں بچپن سے ہی سنجیدہ مزاج تھا اور اب تک ہوں' کبھی کوئی خاص شرارت وغیرہ نہیں کی۔

سوال: کوئی گیم تو کھیلتے ہوں گے؟

عطاء اللہ: والد صاحب چاہتے تھے کہ صرف دل لگا کر پڑھوں اس لیے بھی کسی خاص گیم میں حصہ نہیں لیا اور دوسرا وہاں کوئی ایسا خاص کھیل کود والا ماحول اور مواقع بھی نہیں تھے۔ بس تھوڑی بہت ہاکی کھیلی ہے۔

سوال: والد صاحب کیا کرتے ہیں؟

عطاء اللہ: والد صاحب زمیندار ہیں اور ان کا نام احمد خاں نیازی ہے۔

سوال: شوق تو کئی بچوں کو ہوتا ہے لیکن آپ کو یہ احساس کیسے ہوا کہ آپ اچھا گا سکتے ہیں؟

عطاء اللہ: ایک بار بزم ادب کی کلاس میں سب بچے کچھ نہ کچھ سنا رہے تھے میں نے کہا میں بھی گانا سناؤں گا۔ ان دنوں سلیم رضا کا ایک گانا ''اے دل کسی کی یاد میں'' کافی مشہور تھا' میں نے وہی سنا دیا۔ استاد صاحب ایم اے انگلش تھے اور سید خاندان سے ان کا تعلق تھا مگر وہ خود بھی بہت اچھا گاتے تھے۔ وہ میرے خاندان کی روایت پسندی سے بھی آگاہ تھے اس لئے بہت حیران ہوئے۔ مجھے اکیلے ہاسٹل بلایا اور حوصلہ دیا کہ بیٹا تم بہت اچھا گاتے ہو تم گایا کرو۔

سوال: استاد نے علیحدگی میں بلا کر کیوں کہا' کیا آپ کے گھر والے سخت تھے؟

عطاء اللہ: ایسے ویسے۔ میرے والد بہت سخت تھے۔ اس زمانے میں گانے بجانے کو میراثیوں کا کام سمجھا جاتا تھا اور میرے گھر والے خصوصاً ابا حضور اصولوں کے بہت پابند تھے۔

سوال: تو اتنی سختی میں آپ نے اپنے شوق کی تکمیل کے لئے کیا کیا؟

عطاء اللہ: سب سے پہلے تو وہاں ایک استاد تھے امتیاز خالق' ان کا تعلق ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے تھا میں نے ان سے باقاعدہ تربیت لینے کی درخواست کی۔ انہوں نے حامی بھر لی۔ ابھی میں نے استاد سے ہارمونیم کے دو سبق ہی لئے تھے کہ والد صاحب کو پتہ چل گیا اور انہوں نے استاد کو سختی سے منع کر دیا کہ اسے نہ سکھایا کریں۔ اس لئے استاد نے مجھے سکھانے سے

انکار کر دیا۔

سوال: والد صاحب نے آپ کو منع نہیں کیا؟

عطاء اللہ: کیوں نہیں! انہوں نے مجھے بہت منع کیا مگر مجھے گانے کا جنون کی حد تک شوق تھا، میں نے ان سے کہا کہ اس کو پیشہ نہیں بناؤں گا صرف شوقیہ گانے دیں مگر وہ اس پر بھی نہ مانے۔ حتیٰ کہ یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا' جائیداد سے عاق کر دیا' خاندان والوں نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن میرا شوق ختم نہ ہو سکا۔

سوال: انہوں نے گھر سے نکال دیا تو آپ نے کیا کیا؟

عطاء اللہ: کیا کچھ نہیں' رکشہ چلایا' ٹرک چلایا حتیٰ کہ لبرٹی کے ایک ریسٹورنٹ میں ویٹر کی نوکری بھی کی۔ میری خاصی فیملی لاہور میں سیٹ تھی مگر انہوں نے بھی مجھے نہیں رکھا کیونکہ ان کے خیال میں' میں برا کام کر رہا تھا۔

سوال: کیا ریڈیو ٹی وی پر آسانی سے چانس مل گیا؟

عطاء اللہ: بہت مشکل سے 1973ء میں بہاولپور ریڈیو پر ڈیڑھ منٹ کا سرائیکی آئٹم چلا اور پھر بہت عرصہ تک دوبارہ چانس نہ ملا۔ ٹی وی پر تو لوگوں نے بہت ہی دل توڑا۔ ایک ٹی وی پروڈیوسر کو گانا سنایا تو انہوں نے کہا کیوں گانا خراب کرتے ہو' جاؤ کوئی اور کام کرو۔

سوال: جب چانس نہیں ملا تو لوگوں نے آپ کو سننا کیسے شروع کر دیا؟

عطاء اللہ: یہ 70 کی دہائی کی بات ہے کہ پاکستان سے بہت لوگ دبئی جا رہے تھے۔ گھر والے فرمائش کرتے کہ ریڈیو ٹیپ لاؤ۔ یوں ٹیپ پاکستان آنے لگے۔ اب لوگوں کو صحیح طور پر چلانا نہیں آتے تھے۔ ٹیوننگ کرتے کبھی میری آواز بھی کان پڑنے لگی اور لوگ سننے لگے بالخصوص ٹرک ڈرائیور وغیرہ۔ ویسے بھی مجھ سے پہلے سرائیکی کا کوئی قابل ذکر سنگر نہیں تھا اور میرے علاقے کے کافی لوگ ٹرک ڈرائیور وغیرہ تھے چنانچہ انہوں نے اپنی زبان میں گیت پسند کئے اور میں ٹرکوں میں چلنا شروع ہو گیا۔

سوال: پھر البم کیسے آیا؟

عطاء اللہ: فیصل آباد کے ایک ریکارڈنگ کمپنی نے میرا گانا سنا تو انہیں کوئی پوٹینشل محسوس ہوا' چنانچہ انہوں نے مجھے بلایا اور 77ء میں اکٹھے میرے چار البم ریلیز کئے۔

سوال: ملک گیر شہرت کا سبب کونسا گانا بنا؟

عطاء اللہ: ملک گیر شہرت تو "دل لگایا تھا دل لگی کے لئے" سے ملی۔

سوال: گھر والوں نے تو گھر سے نکال دیا تھا' پھر گھر واپسی کیسے ہوئی؟

عطاء اللہ: میری چھوٹی بہن کو اپنڈکس کا پرابلم ہو گیا تھا' اس نے ہسپتال والوں کو کہا کہ بھائی کو بلائیں۔ لہٰذا مجھے بلایا گیا۔ کچھ دن بعد وہ خود تو مر گئی مگر ابا سے اجازت لے گئی کہ اسے بہت شوق ہے' اسے شوقیہ گانے کی اجازت دے دیں' یہ اسے پیشہ نہیں بنائے گا۔ سو یوں میری واپسی ہوئی۔

سوال: لیکن اب تو آپ نے اسے پیشہ بنا لیا ہے کیوں؟

عطاء اللہ: جب میں مفت گاتا تھا تو لوگ توہین آمیز باتیں کرتے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ جتنے پیسے بڑھاؤ یہاں اتنی ہی عزت ملتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی جب مجھے میوزیشنز وغیرہ کی ضرورت پڑی تو مجبور ہو گیا ان کو پیسے کہاں سے دیتا۔

سوال: اب آپ کو اس مقام پر دیکھ کر والد صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہوا کہ نہیں؟

عطاءاللہ: والد صاحب تو اب بھی ناخوش ہیں' کہتے تو کچھ نہیں لیکن ٹی وی پر میرا گانا لگے تو اٹھ کر چلے جاتے ہیں لیکن امی کہتی ہیں کہ میں نہ ہوں تو دیکھ لیتے ہیں۔ ویسے بھی میں نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے کوئی مجھ پر یا میرے وطن پر انگلی اٹھاتا۔ شاید اسی لئے اب وہ چپ رہتے ہیں' غصہ کا اظہار نہیں کرتے۔

سوال: والد صاحب کی مسلسل ناراضگی اور لوگوں کی حوصلہ شکنی نے کبھی آپ کو پچھتانے پر مجبور نہیں کیا!

عطاءاللہ: نہیں مجھے گانے کا شوق اتنا زیادہ تھا کہ مجھے کبھی بھی پچھتاوا نہیں ہوا بلکہ اب تو میرے علاقے سے بہت سے نئے لوگ اس شعبہ میں آ رہے ہیں۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں کبھی گانا جرم سمجھا جاتا تھا۔

سوال: اب تک آپ کے کتنے البم مارکیٹ میں آ چکے ہیں؟

عطاءاللہ: تقریباً تین سو اتیس

سوال: پرائیڈ آف پرفارمنس کب ملا؟

عطاءاللہ: چھوٹے موٹے اکیڈمی ایوارڈ تو 80 سے زائد ہیں لیکن پرائیڈ آف پرفارمنس 1992 میں ملا۔

سوال: اس کے بعد مخالف خاندان والوں کے رویہ میں کیا تبدیلی آئی؟

عطاءاللہ: (ہنستے ہوئے) کوئی خاص نہیں' پہلے مخالف تھے اب جیلس ہیں۔

سوال: آج کل بہت سے پاپ سنگر فوک کو ملا کر گا رہے ہیں' کبھی آپ نے ایسی کوشش کی؟

عطاءاللہ: ایک دو دفعہ کوشش کی مگر میرے سننے والے میرے مخصوص اسٹائل کو پسند کرتے ہیں' انہوں نے اس کوشش کو رد کر دیا۔

اب چند سوال عطاءاللہ کے ساتھ ساتھ ان کی بیگم بازغہ سے بھی ہو جائیں۔

سوال: شادی کے بعد آپ نے ہنی مون کہاں منایا۔

بازغہ عطاء: ہم نے ساری دنیا میں ہنی مون منایا۔ ہوا یوں کہ شادی کے بعد یہ مختلف پروگراموں کے سلسلے میں دوسرے ممالک میں جاتے تھے۔ ظاہر ہے میں بھی ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے ہنی مون کے موقع پر پوری دنیا گھومی۔

سوال: شادی کی سالگرہ کیسے یاد رہتی ہے؟

عطاءاللہ: بھئی مجھے تو بالکل یاد نہیں رہتی۔

بازغہ عطاء: مجھے یاد تو رہتی ہے مگر ان کی مصروفیات کے پیش نظر سالگرہ کا تحفہ ضرور لیتی ہوں اور یہ بھی تحفہ دینا کبھی نہیں بھولتے۔

سوال: لڑائی ہو تو پہلے کون مناتا ہے؟ عموماً کس بات پر لڑائی ہوتی ہے؟

عطاءاللہ: کبھی کبھار لڑائی ہو جاتی ہے لیکن جلد ہی صلح بھی' پہلے کون مناتا ہے' یاد نہیں' بس دونوں ہی مان جاتے ہیں۔

بازغہ عطاء: ہمارے عام میاں بیوی کی طرح لڑائی جھگڑے نہیں ہوتے لیکن جب انہیں غصہ آتا ہے تو مت پوچھئے یہ کیا کچھ کرتے ہیں' یہ ناراض ہوں تو میری کوشش ہوتی ہے کہ انہیں جلد منا لوں۔

سوال: عطا صاحب! آپ کے ایک معاشقے کا بڑا ذکر تھا' کیا بھابی بازغہ نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا؟

عطاءاللہ: میں نے بازغہ سے شادی کے بعد' اپنا پورا ماضی ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔ میری خوش قسمتی یہ ہے کہ یہ کبھی روایتی بیوی نہیں بنی۔

بازغہ عطاء: سچی بات تو یہ ہے کہ مجھ سے پہلے ان کی زندگی کیسی تھی' میں نے کبھی اس بارے غور ہی نہیں کیا۔ میرے بعد ان کی ساری زندگی صرف میرے لئے ہے میرے لئے یہی کافی ہے۔

سوال: بچوں کے مستقبل کی زیادہ فکر کسے رہتی ہیں؟

عطاءاللہ: میں اپنے طور پر سانول' بلاول اور اپنی بیٹی لاریب کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں لیکن ان کے مستقبل سے اس لئے بھی بہت زیادہ مطمئن ہوں کہ بازغہ بیگم جیسی عورت ان کی ماں ہے۔

بازغہ عطاء: میں ماں ہوں' میری تمام خواہش اور تمنائیں اب صرف ان کے روشن مستقبل سے وابستہ ہیں۔ دراصل ہم دونوں بچوں کے مستقبل کے بارے میں پلاننگ کرتے رہتے ہیں۔

سوال: عطاء صاحب! بازغہ بھابی سے شادی کے بعد پاکستان فلم انڈسٹری ایک انتہائی خوبصورت اور باصلاحیت اداکارہ سے محروم ہوگئی۔ کیا یہ آپ کا فیصلہ تھا یا بازغہ بھابی نے خود فلم انڈسٹری سے کنارہ کشی اختیار کی ہے؟

عطاءاللہ: سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے شادی سے پہلے بازغہ بیگم کی کوئی فلم نہیں دیکھی۔ اور نہ ہی شادی کے بعد ان کی کوئی فلم پوری طرح سے دیکھ سکا۔ لیکن اس بات کا مجھے اندازہ ہے کہ بازغہ بہت اچھی فنکارہ ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ان کی فلم انڈسٹری سے علیحدگی کا کبھی کبھی مجھے افسوس بھی ہوتا ہے۔

سوال: تو پھر آپ نے انہیں اداکاری کرنے کی اجازت کیوں نہیں دی؟

عطاءاللہ: میں نے کوئی باقاعدہ پابندی نہیں لگائی تھی بلکہ شادی کے بعد انہوں نے خود ہی فلم انڈسٹری چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

سوال: کیا شروع سے ہی گلوکار بننے کا شوق تھا؟

عطاءاللہ: جی نہیں پہلے پہل اداکار بننے کا شوق تھا اور طالب علمی کے زمانہ میں سکول میں میں نے ایک ڈرامے میں کام بھی کیا تھا لیکن بعد میں گلوکاری شروع کردی۔

سوال: شروع میں آپ نام کیساتھ نیازی لکھتے تھے لیکن بعد میں عیسیٰ خیلوی لکھنا شروع کردیا اس کی وجہ؟

عطاءاللہ: جب گلوکاری شروع کی تو ایک دن دوپہر کے وقت گلی سے گزر رہا تھا کہ خاندان کے ایک بزرگ نے بلالیا اور کہا کہ تم نیازی نام کے ساتھ نہ لکھا کرو' اس وقت تو ان کی وہ کیفیت میں نہ سمجھ سکا لیکن بعد میں سوچا کہ ہمارے لوگ چونکہ اس کام کو برا سمجھتے ہیں وہ جنگ و جدل پسند اور بندوق سے پیار کرنے والے ہیں تب میں نے اپنے نام کے ساتھ عیسیٰ خیلوی لکھنا شروع کردیا۔

سوال: لوگ کہتے ہیں کہ آپ کا اس کام میں کوئی اُستاد نہیں اور نہ آپ نے سیکھا ہے؟

عطاءاللہ: جی ہاں میں نے موسیقی کا فن سیکھا نہیں حالانکہ مجھے اس کا بہت شوق تھا کہ سیکھوں۔ لیکن گھر والوں کی سختی کے باعث سیکھ نہ سکا لیکن اس سلسلے میں کبھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوا۔ اور اوائل عمری میں ایک دفعہ میں نے کراچی کے مسرور بیں پر ایک شو کیا جس میں میرے ساتھ مہدی حسن' منی بیگم' اسد امانت علی جیسے بڑے فنکاروں نے حصہ لیا تھا لیکن اس دوران بھی مجھے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی اور میں نے پرفارم کیا جس کے بعد سب نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔

سوال: کیا خاندان میں کوئی شخص ایسا بھی تھا جس نے آپ کی حوصلہ افزائی کی ہو؟

عطاءاللہ: جی: میرے ماموں محمد احسن خان نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔

سوال: کیا گلوکاری کی وجہ عشق تھی؟ اور آواز میں درد بھی اسی بناء پر ہے؟

عطاءاللہ: نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ زندگی کے حقائق میں محبت کرنا شامل ہے اور تھوڑی بہت دل لگی تو ہر کوئی کرتا ہے لیکن ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔

سوال: پروفیشنل گلوکاری کا آغاز کب ہوا؟

عطاءاللہ: پہلے پہل تو میں شوقیہ فنکار تھا اور صرف اپنے شوق کے لئے گاتا تھا اور پیسے وغیرہ بھی نہیں لیتا تھا لیکن ایک دفعہ چنیوٹ میں ہونے والے واقعے نے مجھے باقاعدہ پروفیشنل گلوکار بننے پر مجبور کیا۔

سوال: وہ واقعہ کیا تھا؟

عطاءاللہ: ہوایوں کہ چنیوٹ میں ایک میلہ تھا اور وہاں سے مجھے بہت سے لوگ لینے آئے کہ تم آ کر وہاں پرفارم کرو وہ لوگ مجھے کاروں کے قافلے کے ساتھ لے کر گئے لیکن شو کے بعد کہا کہ آپ بس سے واپس چلے جائیں تو اس واقعے کے بعد میں نے سوچا کہ اب پیسوں کے بغیر کہیں پرفارم نہیں کروں گا۔

سوال: آپ ہر وقت کاندھے پر چادر ساتھ رکھتے ہیں اس کی کوئی خاص وجہ؟

عطاءاللہ: چادر ہمارے علاقے میں لباس کا ضروری حصہ ہے ہم لوگ اس کے بغیر لباس کو نامکمل سمجھتے ہیں۔ یہی ہمارا تولیہ، یہی تکیہ، یہی رضائی اور یہی جائے نماز بھی ہے اور میں اکثر جہاں جاتا ہوں وہاں پرستار مجھے چادر کا تحفہ ضرور دیتے ہیں۔ میں نے اسے ذرا جدید رنگ دے دیا ہے۔

سوال: پھر تو آپ کے پاس بہت سی چادریں اکٹھے ہوگئی ہونگی کیا بیچ دیتے ہیں؟۔

عطاءاللہ: جی نہیں۔ پرستاروں کے تحفے میرے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں ہاں لیکن ایک دفعہ چادر بیچنی پڑی۔

سوال: کب؟

عطاءاللہ: شوکت خانم ہسپتال کے لئے چندہ اکٹھا کرنے کی مہم میں میں نے سکاٹ لینڈ کے شہر گلاسکو میں اپنی چادر بیچ دی تھی۔

سوال: کبھی چادر پھیلانے کی نوبت بھی آئی؟

عطاءاللہ: جی! معروف گلوکار اخلاق احمد کے لئے ایک دفعہ چادر پھیلانی پڑی۔ انہیں کینسر تھا اور میں جب بھی انگلینڈ جاتا تو ان کے لئے شو ضرور کیا کرتا تھا ایک دفعہ چادر میں چندہ اکٹھا کیا

سوال: اب تک کتنے ملکوں میں پرفارم کر چکے ہیں؟

عطاءاللہ: اسرائیل کے علاوہ تقریباً دنیا کے ہر ملک میں پرفارم کر چکا ہوں۔

سوال: آپ کو پرائیڈ آف پرفارمنس بھی مل چکا ہے اس کے علاوہ کتنے ایوارڈ ملے؟

عطاءاللہ: جی۔ پرائیڈ آف پرفارمنس بھی ملا ہے لیکن اصل ایوارڈ عوام کی چاہت ہے۔ زیادہ تر ایوارڈ پاک فوج کی طرف سے ملے ہیں۔

سوال: آپ نے فلموں میں بھی کام کیا؟

عطاءاللہ: جی بس مروت میں فلموں میں کام کرنا پڑا۔ ظہور گیلانی صاحب نے ایک دوست کی سفارش کرائی کہ میرے فلم کے لئے گانا گاؤ ان دونوں قمیض تیری کالی بہت مشہور تھا پہلے صرف گانے کے لئے کہا گیا پھر کہا کہ پکچرائز بھی آپ پر ہوگا۔ اس کے بعد

ایک فلمساز نے سلطان راہی مرحوم سے مجھے فلموں میں کام کرنے کے لئے سفارش کرائی اور سلطان راہی میرے گھر آگئے۔ وہ میرے بہت اچھے دوست تھے اس لئے انکار نہ کرسکا۔ اور سینما کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ فلم کے دوران کوئی گانا دوبارہ دکھایا گیا ہو کیونکہ جب ''قمیض تیری کالی'' گانا ختم ہوا تو لوگوں نے پروجیکٹر کے آگے چادر پھیلادی کہ گانا دوبارہ دکھاؤ جس پر گانا دوبارہ چلایا گیا۔

سوال: فلم انڈسٹری کے زوال کے اسباب کیا ہیں؟

عطاءاللہ: اگر فلموں سے ''ریکارڈ ٹائم'' کا نعرہ نکال دیا جائے تو فلمیں اچھی بن سکتی ہیں۔ فلموں میں حقیقی مناظر ہونے چاہئیں۔ ہمارے ہاں سٹوڈیو میں صبیحہ اور سنتوش کے زمانے کی محرابیں اور سیڑھیاں میں سیمنٹ کی بوریاں لگا کر پہاڑ بنادیے گئے ہیں۔ گتے کے کمرے ہیں۔ ایسے میں کامیاب فلمیں کہاں سے بنیں گی۔ میری فلمیں جب بن رہی تھیں تو میں نے کہا تھا کہ روٹین سے ہٹ کر کام کیا جائے۔ اور جینئل لوکیشنز پر شوٹنگ کی جائے اور اس کے لئے میں نے اپنی بلا معاوضہ خدمات پیش کی تھیں میں نے کہا تھا کہ میں اور جینئل لوکیشنز پر لے کر جاؤں گا وہاں کے اخراجات بھی میں برداشت کروں گا۔ چوڑیاں فلم کی کامیابی کی بڑی وجہ بھی یہی تھی کہ اس میں حقیقی مناظر دکھائے گئے۔ تخلیق سوچ کی محتاج ہوتی ہے۔ ہم میوزک ڈائریکٹر کو کہتے ہیں کہ ایک ہفتے میں کام مکمل کردو جب اسے سوچنے کے لئے ٹائم نہیں دینگے تو پھر ایسا ہی کام ہوگا۔ اور انڈسٹری کی اس تباہی کے ہم سب ذمہ دار ہیں۔ کیونکہ ہم دیانتداری سے اپنی ذمہ داریاں نہیں نبھاتے۔

سوال: فوک موسیقی معدوم کیوں ہوتی جارہی ہے؟

عطاءاللہ: فوک موسیقی ہر دور میں مضبوط رہی ہے لیکن آپ صبح سے شام تک پاپ گلوکاروں کو دکھاتے رہیں گے تو فوک کون سنے گا۔ اس لیے ٹی وی چینلز کو چاہئے کہ چاروں صوبوں کی فوک موسیقی دکھایا کریں۔ جب میں آیا تھا تو اس وقت عالمگیر، شہکی اور اے نیئر جیسے بڑے پاپ گلوکار تھے پھر نازیہ حسن آئی لیکن فوک موسیقی نے سب کو شکست دی میڈیا' پاپ گلوکاری کو فروغ دے رہا ہے اب ہر بچے کے ہاتھ میں گٹار ہے۔ جب فوک دکھائیں گے نہیں تو اسے فروغ کیسے ملے گا۔

سوال: اب جو پاک بھارت تعلقات بہتر ہو رہے ہیں تو اس سے ہماری ثقافت پر تو کوئی برا اثر نہیں پڑے گا؟ اور انڈین اداکاروں کے یہاں آنے پر آپ کیا کہتے ہیں؟

عطاءاللہ: نہیں اس سے ہم پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا کیونکہ دونوں ملکوں کی ثقافت ملتی جلتی ہے۔ کھانا، لباس، رہن سہن ایک جیسا ہے سوائے مذہب کے۔ فن کی کوئی سرحد نہیں ہوتی لیکن فنکاروں کی سرحدیں ہوتی ہیں اچھا کام جہاں بھی ہوگا ساری دنیا میں پسند کیا جائیگا۔ جہاں تک انڈین اداکاروں کی پاکستان آمد اور پذیرائی کی بات ہے تو انہیں صرف فیشن اور دکھاوے کے طور پر پذیرائی دی گئی۔ کچھ لوگوں نے انہیں صرف میڈیا پر آنے کے لئے مہمان بنانے کی کوشش کی حالانکہ انڈیا میں لوگ دل سے پذیرائی دیتے ہیں۔

سوال: آپ اتنے سارے ملکوں میں گئے کسی ملک میں جاتے ہوئے جھجک محسوس ہوئی

عطاءاللہ: ہاں ایک دفعہ پروموٹر نے مجھے فجی پرفارم کرنے کے لئے کہا میں اسے جانتا نہیں تھا صرف فون پر بات ہوئی تھی اور فجی میں پاکستان کا کوئی سفارت خانہ بھی نہیں تھا نہ ہمارے ملک میں ان کا۔ تو میں وہاں جانے سے جھجک رہا تھا کہ وہ لوگ مجھے جانتے بھی ہونگے یا نہیں۔ لیکن وہاں جا کر بہت پذیرائی ملی۔ میرا 31 شو کرنے کا معاہدہ تھا۔ لیکن وہاں 7 جزیروں پر میرے 7 شو

کروائے گئے وہاں اینگلو انڈین لوگ رہتے تھے پاکستانی نہیں۔ لیکن ان لوگوں نے میرے گیتوں کو بہت پسند کیا۔ ایسے جزیروں میں بھی پرفارم کیا جہاں صرف فوکر جہاز جاتا تھا اور لوگوں کو ناپ تول کر جہاز میں بٹھایا جاتا تھا۔

سوال: سنا ہے جہاز میں سفر کرنے سے ڈرتے ہیں؟

عطاءاللہ: جی وہاں جہاز میں سفر کرنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ یہ میرا نفسیاتی خوف ہے۔ اور اگر لمبا سفر کرنا پڑے تو زیادہ وقت سو کر گزارتا ہوں۔

سوال: آپ کے گیتوں میں مندری، قمیض، کوکا، چھلی کا بہت ذکر ہوتا ہے؟

عطاءاللہ: میں چاہتا ہوں کہ ہماری آنے والی نسلوں کو بھی ہماری یہ ثقافت یاد رہے اور ہم ان چیزوں کو بھول نہ جائیں اس لئے جان بوجھ کر ایسے گیتوں کا انتخاب کرتا ہوں۔

سوال: کھانے میں کیا پسند ہے؟

عطاءاللہ: ساگ، مکھن مکئی کی روٹی اور گائے کے دودھ کی لسی بہت زیادہ پسند ہے۔

سوال: آپ نے سٹوڈیو بھی بنا رکھا ہے کیا اس میں صرف اپنی ریکارڈنگ کرتے ہیں یا دوسرے بھی؟ اس کا افتتاح کس نے کیا تھا؟

عطاءاللہ: میرے سٹوڈیو کا افتتاح ملکہ ترنم نور جہاں نے کیا تھا ان کا رویہ ہمیشہ میرے ساتھ بڑی بہنوں والا رہا۔ وہ ان دنوں بہت زیادہ بیمار تھیں اور ڈاکٹروں نے چلنے پھرنے سے منع کر رکھا تھا اس کے باوجود وہ میرے سٹوڈیو کا افتتاح کرنے کے لیے آئیں۔ سٹوڈیو میں باقی گلوکار بھی ریکارڈنگ کراتے ہیں میرے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں۔

سوال: آئیڈیل گلوکار کون ہے؟

عطاءاللہ: نصرت فتح علی خان اور ملکہ ترنم نور جہاں کو بہت سنتا ہوں۔ نصرت فتح علی خان بہت اچھے دوست اور بہت پیارے انسان تھے۔

سوال: ان کے حوالے سے کوئی یادگار واقعہ؟

عطاءاللہ: واقعات بہت سے ہیں لیکن یہاں تذکرہ نہیں کروں گا کیونکہ اس سے خودنمائی کا پہلو نکلتا ہے۔

سوال : کیا بیٹوں کو بھی اس میدان میں لائیں گے؟

عطاءاللہ: اگر وہ آنا چاہیں تو ان کی مرضی۔ ویسے بڑے بیٹے سانول کو کرکٹ اور چھوٹے بلاول کو اداکاری کا شوق ہے۔

سوال : پچھلے دنوں آپ کے بارے میں ایک بیان چھپا تھا جس میں آپ نے عوام کو چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والی قرار دیا، ایسی کیا بات تھی؟

عطاءاللہ: عوام فنکار کے لئے خدا کے بعد سب سے بڑا آسرا ہوتے ہیں میرے پرستار میرا سرمایہ ہیں۔ ایک نجی چینل پر چلنے والے انٹرویو کے حوالے سے یہ خبر شائع کی گئی۔ جہاں تک عوام کا سوال ہے تو عوام میرے لیے خدا کی طرف سے دی گئی سب سے بڑی نعمت ہیں اور میں کفرانِ نعمت نہیں کر سکتا۔

# صوفیانہ طرز کے منفرد گلوکار

# شوکت علی

گلوکار شوکت علی کی شخصیت اور فن کے حوالے سے لکھنے اور کہنے والے اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی آواز کے سوز سے صوفیانہ کلام کی دلوں پر اثر پذیری عمل جراحی کے انداز میں ہوتی ہے۔ سیف الملوک اور بابا بلھےؒ شاہ کا کلام گائیں تو روح پر عجیب وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ گائیکی کے حوالے سے پنجاب کے لوک ورثے کی بات کی جائے تو اس فنکار کو پنجابی ثقافت کا امین کہا جاسکتا ہے۔ جب انہوں نے علامہ اقبالؒ فیض احمد فیض اور جوش ملیح آبادی کا کلام گایا تو لوگوں کو اپنی رائے درست کرنا پڑی کہ اردو اور پنجابی زبان کی قید نہیں ان کی آواز کے سوز سے ہر کلام پُر اثر ہو جاتا ہے۔ شوکت علی سے کی جانے والی گفتگو قارئین کی نذر ہے۔

سوال: آپ نے گلوکاری شروع کی تو لوک فنکاروں میں طفیل نیازی' عنایت حسین بھٹی' عالم لوہار اور فریدہ خانم جیسے قد آور فنکار پہلے سے موجود تھے۔ آپ کی علیحدہ پہچان کیسے ہوئی۔

شوکت علی: میرا شوق' شعور پر غالب آیا اور میں لاشعوری طور پر ان لوگوں میں جا گھسا۔ جیسے بچہ بڑوں کے درمیان ایڑھیاں اٹھا کر اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کرتا ہے معلوم ہوا کہ اچھا گا لیتا ہوں۔ لے اور تان محمد رفیع جیسے ہیں۔ بس پھر گاتا رہا' گاؤں گاؤں شہر شہر میلے ٹھیلے اور پھر وہاں تک جہاں کسی بھی فنکار کی علیحدہ شناخت ہو جاتی ہے اور اسے تسلیم کر لیا جاتا ہے اس فرق کے ساتھ کہ مجھے ناصرف مان لیا گیا بلکہ لوگ اپنا جاننے لگے۔

سوال: کچھ ابتدائی زندگی اور شوق کی بنیاد کے حوالے سے بتائیے؟

شوکت علی: ایم بی ہائی سکول ملکوال ضلع گجرات میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا آغا حشر کاشمیری کا ڈرامہ ''صید ہوس'' سٹیج ہوا۔ آغا حشر کے ڈراموں میں مکالمے' شاعری اور گائیکی سب کچھ ہوتا تھا۔ میں نے گایا تو میرا گانا پسند کیا گیا مسلم ماڈل سکول لاہور میں محمد رفیع کا گایا ہوا گانا ''بابو اک پیسہ دے دے'' گایا تو بہت سراہا گیا سکول کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں میری آواز گونجی۔ والدہ کی دعا' صوفیانہ کلام سے لگاؤ' اساتذہ کی حوصلہ افزائی اور اللہ کے کرم سے بات بنتی چلی گئی۔

سوال: کونسا گیت سب سے پہلے مقبول ہوا؟

شوکت علی: موسیقار نواز کی دھن پر ''اے دھرتی میرا سونا یار وے میں ایدھا سنیارا'' گایا تو زبان زد عام ہو گیا۔ اس طرح پہچان کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا اور پھر وہ دن بھی آیا کہ میں نے جوش ملیح آبادی کی غزل گائی تو معلوم ہوا کہ لاہور میں غزل گانے والا واحد فنکار ہوں ڈرامے کے شعبے میں خالد عباس ڈار اور موسیقی سے احسان علی خان و اکمل نواز ہم تینوں کا گروپ ہوا کرتا تھا۔

سوال: پنجابی فوک گلوکاری کے حوالے سے ایک خاص پہچان کیونکر ہوئی؟

شوکت علی: میں صوفیا کرام کے کلام سے متاثر تھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے زندگی کے سرد گرم موسم جھیلے تھے۔ بہت سے نشیب و

فراز سے واسطہ پڑا تھا۔ انسانوں کی تکلیف کو دیکھا اور محسوس کیا تھا' ذاتی طور پر بھی مشکلات کا ادراک تھا۔ صوفیا کرام کے کلام میں زندگی کی بے ثباتی کا ذکر' محبت اور بھائی چارے کا درس اور خاص طور پر خالق حقیقی سے لولگانے کی تلقین ہوتی ہے۔ میرے خیال میں میرے اندر کے انسان نے مجھے یہ کلام گانے کی طرف راغب کیا کہ زندگی کی سچائیاں اجاگر کروں۔ اللہ کا شکر ہے کہ صوفیا کا کلام میری پہچان بنا۔ دنیا بھر میں مقبولیت اور پذیرائی تو اپنی جگہ پر مشرقی اور مغربی پنجاب والے مجھے اپنی ذاتی پراپرٹی سمجھتے ہیں۔ اپنی گائیکی اور شخصیت پر پنجاب رنگ کی چھاپ میرے لئے باعث فخر ہے۔

سوال: کیا اب یہ سلسلہ چلتا نظر آتا ہے" فنکار جو لوک ورثے کی پہچان تھے آہستہ آہستہ اٹھتے جارہے ہیں نئے فنکاروں کا چلن بدل گیا۔ اسکا ذمہ دار کون ہے؟

شوکت علی: ہم پرانے لوگ ہی اپنے ورثے کی حفاظت نہ کر سکے نئی نسل کا قصور بہت کم ہے۔ میرے خیال میں ہم نے فن کے تسلسل کی طرف توجہ نہیں دی۔ موسیقی اور فن کو اپنے اپنے دائروں اور خانوں میں محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئے لوگ بے مہار ہو گئے موسیقی پر بھی دہشت گردوں کا قبضہ ہو گیا۔ مغربی سازوں پر اچھل کود عریاں لڑکیوں کی ہمراہی میں ڈانس اور شور شرابے نے ہماری ثقافت کا چہرہ ہی مسخ کر دیا۔ تلاش' جستجو اور شوق کے انداز بدل گئے وہی کیا جانے لگا جس کا تعلق آج کے فائدے سے ہے۔ کل کی کسی نے فکر نہ کی۔ سہل پسندی اور شعوری طور چور دروازے تلاش کر لئے گئے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے میڈیا کے پاس ایک پر اثر چورن ہے جو سب کچھ ہضم کر دیتا ہے۔ آج سے تیس برس پہلے گائے جانے والے گانے آج بھی مقبول ہیں۔ اس کی بڑی وجہ ہی یہ ہے کہ وہ پائیدار تھے۔ سچی لگن تلاش اور محنت کے بعد تخلیق ہوئے تھے۔ ان میں لوک رنگ تھا اپنی پہچان اور گھر کی بات تھی جو نسل در نسل منتقل ہوئی پرانی نسل کے لوگ سیف الملوک اور کلام باہو سُن کر آبدیدہ ہو جاتے ہیں ایک طرف زندگی کے ادھیڑ بن یاد آنے لگتے ہیں۔ اللہ سے لولگانے کا سبق دہرایا جاتا ہے۔ زندگی کی حقیقتیں سامنے آجاتی ہیں۔ دوسری طرف اچھل کود اور تیز موسیقی یا شور کانوں کو بُرا محسوس ہوتا ہے۔

مگر یہ سب کچھ عارضی ہے میں فن کی پائیداری کا قائل ہوں۔ اب چوری چکاری عام ہے دہشت گردی کا یہ عالم ہے کہ شاعر کا اچھا بھلا کلام چوری کر کے شور شرابے کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ وہ گیت جو آواز و آہنگ کا شاہکار تھا اسے بگاڑ کر ایک تیسری صنف کی شکل دے دی جاتی ہے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ ہمارے بیشتر گیت بلکہ موسیقی بھی اس وقت دہشت گردی کے نرغے میں ہے۔

سوال: زندگی کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟

شوکت علی: زندگی دینے کے لئے ہوتی ہے لینے کے نہیں زندگی میں کچھ دینے والا موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ اور لینے والا زندگی ہی میں مر جاتا ہے۔ جن لوگوں نے زندگی کو کچھ دیا وہ آج بھی زندہ ہیں اور جو اپنی زندگی بہتر بنانے کے لئے دوسروں کا حق مارتے رہے وہ جیتے جی بھی مردہ سمجھے جاتے رہے۔ میرے خیال میں ہر انسان کو چاہئے کہ وہ دوسروں کو سہولت مہیا کرے اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو کم از کم حاصل سہولتیں تو نہ چھینے۔ اس سوال پر ایک واقعہ یاد پڑتا ہے کہ میں نے کسی صاحب کے گھر گانے کی محفل میں شرکت کی وہاں سے پیسے ملے۔ کچھ اور رقم ڈال کر ایک چھوٹی سی کار خرید لی۔ چند روز بعد ان صاحب کو پیدل جاتے ہوئے دیکھا تو عجیب سا احساس ہوا۔ اسی احساس کے تحت فوراً گاڑی بیچ دی۔ اس احساس کی تشریح میں آج بھی نہیں کر سکتا۔

سوال: آپکو ادب سے بہت لگاؤ رہا اس حوالے سے کچھ کہیں گے؟

شوکت علی: ناصر کاظمی میرے محلے دار تھے۔عدیم ہاشمی سے والہانہ تعلق تھا استاد دامن سے پر خلوص محبت رہی۔ایسے ناموں کی فہرست بہت لمبی ہے۔آج بھی بلند پایہ ادیب وشاعر موجود ہیں مگر اس میدان میں بھی تخلیق کا عمل جمود کا شکار ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادب پیدا کیا جارہا ہے۔تخلیق نہیں ہو پا رہا۔گویا پروڈکشن پر توجہ زیادہ ہے (CREATION) تخلیق بہت کم دیکھنے میں آتی ہے

سوال: آج کل کیا مصروفیات ہیں؟

شوکت علی: جہاں جہاں پنجاب کے لوگ ہیں وہاں پنجاب رنگ غالب ہے۔ اسی لئے بلوایا جاتا ہوں گزشتہ دنوں کیلفورنیا میں بابا گرونانک کی تین سوسالہ تقریبات تھیں۔ مجھے نہ صرف وہاں مدعو کیا گیا بلکہ خصوصی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔انگلینڈ امریکہ کینڈا وغیرہ سے دعوت نامے آئیں تو چلا جاتا ہوں۔ویسے اب میں شاعری بھی کرتا ہوں۔

سوال: کچھ اپنے شعر؟

شوکت علی: ترے باجھ نتانی جند میری

درداں دا کھوں ہو جاندی اے

دل لے کے جدھروں لنگھناواں

نیراں نوں سوہ ہو جاندی اے

سوال: کوئی ایسا واقعہ جو عمومی سوچ میں تبدیلی کا باعث بنا ہو؟

شوکت علی: ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ جمخانہ کلب جانے کا اتفاق ہوا۔شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔اعتراض ہوا کہ اس لباس میں کلب میں نہیں جایا جاسکتا۔ بہت افسوس ہوا کہ غلامی کے دور کی نشانی انگریز کے لباس کی اہمیت ہمارے اپنے لباس سے زیادہ سمجھی جارہی ہے۔ طے کرلیا کہ اب انگریزی لباس نہیں پہنوں گا مجھے اپنے پنجابی ہونے اور ماں بولی سے پیار ہونے پر فخر ہے۔اور یہی میرے شناخت ہے جسے میں اثاثہ سمجھتا ہوں۔

سوال: کہتے ہیں فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے افراد توہمات کا شکار ہو جاتے ہیں؟

شوکت علی: میرے ساتھ یہ المیہ نہیں ہے۔ میں محنت اور صداقت پر یقین رکھتا ہوں۔مسلسل جدوجہد محنت اور فن سے لگاؤ ہی فنکار کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ میں نے کبھی کسی بڑے ایوارڈ کے حصول کی تمنا نہیں کی۔خدا کا شکر ہے کہ جن ایوارڈوں کے حصول کے لئے کوشش کی جاتی ہے نئے نئے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں وہ سب میرے حصے میں آچکے ہیں۔میں بزرگوں کی دعا اور اللہ پر ایمان رکھتا ہوں۔اس دنیا میں میری والدہ ہی میرے رہبر تھیں۔میرے لئے ہر وقت دعا کرتی رہیں۔میرا ایمان ہے کہ جس کے گرد ماں کی دعاؤں کا حصار ہو اسے کسی وہم یا شک وشبے میں نہیں پڑنا چاہئے۔شاید یہی وجہ ہے کہ میں کبھی توہمات کا شکار نہیں ہوا۔

سوال: آپ کو کبھی خود پر یا حالات پر غصہ بھی آیا؟

شوکت علی: حالات یا دوسروں پر غصہ بہت کم آتا ہے یاد نہیں کہ غصے میں کسی کا دل دکھایا یا نقصان پہنچایا ہو۔حالات پر غصہ کرنے کا بھی قائل نہیں ہوں۔حالات دراصل زمانے کا حصہ ہوتے ہیں اور زمانہ کبھی نہیں بدلتا۔اللہ تعالیٰ نے زمانے کی قسم کھائی ہے۔

البتہ لوگ بدل جاتے ہیں ان کا برتاؤ، رہن سہن اور طرز زندگی کچھ اس طرح بدلتا ہے کہ پوری تہذیب اور معاشرہ بدل جاتا ہے۔ لوگ اسے زمانے کی تبدیلی کہتے ہیں حالانکہ یہ تمدنی زندگی کی تبدیلی ہوتی ہے۔ حالات کیسے بھی ہوں صبر و ہمت کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہئے۔ شکست کھانے کی بجائے حالات کو بہتر بنانے یا یوں سمجھ لیں کہ شکست دینے کا سلیقہ بھی حالات ہی سے سیکھا ہے۔ زمانہ استاد ہوتا ہے۔ اچھا شاگرد اپنے تجربات اور مشاہدات کو ضائع نہیں کرتا۔ میں نے بھی زمانے سے بہت کچھ سیکھا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انسان محبت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ جنگ و جدل یا ظلم و ستم کے لئے نہیں، میں نے حالات کے اتار چڑھاؤ برداشت کئے ہیں جو میرے پاس زندگی اور زمانے کی امانت ہیں، یہاں ان کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ جب تک ہم اپنی ذات کو دوسروں کی جگہ رکھ کر صحیح میزان نہیں کرتے اس وقت تک صحیح فیصلہ بھی نہیں کر سکتے اور صحیح فیصلہ کرنے کے لئے قوت ایمانی کا ہونا بہت ضروری ہے۔ لہٰذا میں خود کو حالات کے مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کر سکتا۔

سوال: سب سے زیادہ خوشی کب ہوتی ہے؟

شوکت علی: جب میرا دل بھر آتا ہے اور آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں۔ کہنے کو تو یہ غم کے تاثرات ہیں مگر میں سمجھتا ہوں جب انسان کا دل کوئی سچا تاثر قبول کرتا ہے تو آنکھیں ضرور پرنم ہو جاتی ہیں۔ دیار غیر میں فیض احمد فیض کا کلام سنا کر داد وصول کروں۔ سٹیج سے اترتے ہی گلے لگا لیا جاؤں۔ مختلف رنگ و نسل کے سینکڑوں لوگ وجد میں آ کر جھومنے لگیں ہزاروں ہاتھ بے خود ہو کر تالیاں بجائیں پھر ذریعہ اظہار آنسو ہی ہوتا ہے۔ جو بے انتہا خوشی کی ترجمانی کرتے ہیں جب بھی صوفیانہ کلام یا سیف الملوک گاتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے اندر ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہے۔ ایسی شکست و ریخت جو دکھائی نہیں دیتی' لوگ سنتے ہیں تو آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ شاید اپنے من کے سمندر میں ڈوب جاتے ہیں۔ جب آپ اپنے توسط سے کسی کو اپنی ذات ٹٹولنے پر لگا دیں تو اس کامیابی پر خوشی تو ہوتی ہے۔ میری والدہ کہا کرتی تھیں کہ سیف الملوک شاید اسی لئے لکھی گئی کہ شوکت اسے گاتا رہے۔ دراصل یہی وہ تمغہ ہے جس کا متبادل کوئی انعام یا ایوارڈ نہیں ہو سکتا۔

سوال: کبھی ساتھی فنکاروں سے کسی حوالے سے حسد بھی کیا؟

شوکت علی: خدا کا شکر ہے اس طرح کا ظلم اپنی ذات پر کبھی نہیں کیا۔ میرے قبیلے کے لوگ بڑے فراخدل تھے۔ دوسروں کے لئے جگہ بناتے تھے۔ میں نے بھی یہی سیکھا ہے۔ تلاش اور جستجو کا راستہ اپنایا ہے اور اللہ کے فضل سے کامیاب رہا۔

سوال: اپنے بیٹے عمران کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

شوکت علی: عمران ہونہار ہے، نئی نسل کا نمائندہ ہے مگر اپنی روایات اور اقدار کی پاسداری کرتا ہے۔ محنت کرتا رہا تو ضرور کامیاب ہوگا۔ کامیابی کے لئے شوکت علی کا بیٹا ہونا شرط نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اتنے عروج پر پہنچ جائے کہ باپ سے بھی آگے نکل جائے۔ میں تو دعا ہی کر سکتا ہوں۔

سوال: نئے فنکاروں کے لئے پیغام؟

شوکت علی: محبت کی سفارت کاری کریں' وطن اور اپنی دھرتی کی نمائندگی کریں۔ دھرتی کے اتنے زیادہ اور دیرپا رنگ ہیں کہ اغیار کے چند شوخ مگر جلد پھیکے پڑ جانے والے رنگ میں ڈھلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مصنوعی زیور دیکھنے میں وقتی طور پر بہت ہو جاتے ہے مگر سونا سونا ہوتا ہے۔ اپنی دھرتی کو سنوارنے' اس کی پہچان قائم رکھنے میں جو مزا ہے وہ عارضی شہرت یا دولت

میں ہرگز نہیں۔

سوال: آپ نے اس وقت تک کتنے گیت گائے ہوں گے؟

شوکت علی: کوئی اندازہ نہیں 35 برس ہوگئے گاتے ہوئے۔ ویسے بھی پلے بیک سنگرز کو تعداد کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ریڈیو ٹی وی اور نگر نگر گانے والے تعداد کا زیادہ خیال نہیں رکھتے۔

سوال: ہم عصر ساتھیوں کے بارے میں کچھ کہیں گے؟

شوکت علی: مہدی حسین' غلام علی اور پرویز مہدی سب ہی بہت اچھے ہیں۔ یہ محض تعریف نہیں ہے۔ میری نظر میں ان لوگوں کا بڑا مقام ہے۔ عوام میں مقبولیت کے حوالے سے شاید کسی فنکار کا مکمل تعارف نہیں ہوتا۔ ایسے بھی فنکار ہیں کہ ان کے نام پر لوگ کھنچے چلے آتے ہیں مگر فن شناس افراد کی رائے سامعین سے مختلف ہوتی ہے۔ مہدی حسن' فریدہ خانم' استاد سلامت علی خان' بڑے غلام علی خان' عابدہ پروین کی گائیکی کی قدر موسیقی کے رموز و اسرار سمجھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔

سوال: کبھی خود کو اپنی ذات میں معتبر محسوس کیا؟

شوکت علی: معتبر تو نہیں' کارآمد ضرور محسوس کیا۔ اس ضمن میں ایک واقعہ کچھ اس طرح ہے۔ ایک دوست کی شادی میں شرکت کے لئے جا رہا تھا۔ فیض احمد فیض بھی اسی فلائٹ میں تھے۔ پوچھنے لگے کیا کر رہے ہو۔ کدھر کا ارادہ ہے؟ پھر کہنے لگے کہ میرے ساتھ چلو۔ میں انکار نہ کر سکا۔ انہوں نے میرا ہارمونیم بھی گاڑی میں رکھوایا اور عابد علی شاہ کے گھر جی۔ او۔ آر لے گئے۔ وہاں رات بھر فیض صاحب کی غزل گاتا رہا۔ شرکائے محفل میں صادقین' منو بھائی' صفدر میر' قاضی مظہر بھی موجود تھے۔ بار بار ایک ہی غزل سنی جاتی رہی۔ اس موقع پر صادقین نے فیض صاحب سے کہا "دیکھیں شوکت علی آپ کی غزل کس خوبصورتی سے پینٹ (Paint) کر رہا ہے۔ اتنے بڑے مصور اور خطاط کا یہ جملہ سن کر خود کو "کارآمد" سمجھا۔ معتبر ہونا یا سمجھا جانا میری خواہشات کا حصہ نہیں۔ شاید اس لئے کہ بہت کم معتبر لوگ بہت زیادہ غیر معتبر لوگوں کی پرواہ نہیں کرتے۔

سوال: کچھ گھر کے بارے میں بھی بتائیں؟

شوکت علی: گھر سے مراد اگر میری اہلیہ ہیں تو اس لحاظ سے میں بڑا خوش نصیب ہوں۔ میری بیوی نے ہر طرح کے حالات میں میری ہمت بندھائی۔ تھوڑے میں بھی خندہ پیشانی سے گزارہ کیا۔ جب اللہ نے زیادہ دیا تو بھی میانہ روی اختیار کی۔ میں اپنی تمام کامیابیاں اپنی والدہ مرحومہ کے نام کرتا ہوں۔ جبکہ ان کامیابیوں کے حصول کی منزلیں آسان بنانے میں میری بیوی کا ہاتھ ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اپنی بیوی کو بہت محترم جانتا ہوں۔

سوال: صوفیائے کرام اور بزرگوں سے عقیدت کے حوالے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو مذہب سے بہت لگاؤ ہے کچھ مذہب کے حوالے سے بتائیں گے؟

شوکت علی: میرا مذہب مجھے خدا اور محسن کائنات' نبی اکرم کی عطا کردہ تعلیمات پر عمل کرنے کا درس دیتا ہے۔ اس حوالے سے احتساب ذات کے عمل کو زیادہ فوقیت ہونی چاہئے۔ اسلام محبت' امن' بھائی چارے اور رواداری کی تلقین کرتا ہے۔ یہ سب خصوصیات اس وقت سامنے آتی ہیں جب انسان خود اپنا محاسبہ کرے اور اپنے کردار سے پہچانا جائے میرے آقا و مولا کا کردار ہی ان کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت بنا۔ جھوٹ سے نفرت پر "صادق" قرار دیئے گئے۔ امانت کی حفاظت پر "امین" کا لقب پایا۔ یتیموں اور ناداروں کے ماوا و ملجا تھے۔ اگر اسلام کو ماننے والا جھوٹ بھی بولے' امانت میں خیانت بھی کرے۔ دوسروں کا دکھ

درود نہ بانٹ سکے اور یہ کہے کہ میں اسلام کا پیروکار ہوں تو میرے نزدیک اس کی باقی اچھائیاں یا عبادات ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ اللہ کی رسی کو چھوڑ کر مختلف فرقوں اور خانوں میں تقسیم ہو کر تفرقات میں پڑ جانا مذہب نہیں ہے۔ مذہب خالق اور مخلوق سے محبت کرنے کا نام ہے۔ صوفیائے کرام نے اسی محبت کے درس کو عام کیا۔ میں نے یہ معتبر کلام اور پیغام اپنی آواز میں سمو لیا ہے۔ شاید اسی لئے لوگ مجھے مذہبی سمجھتے ہوں گے۔ میں اس حوالے سے اپنی ذات کو ٹٹولتا ہوں تو کھوکھلا ہی محسوس کرتا ہوں۔

سوال: شاعری کرتے ہیں، کیا دیوان شائع کروائیں گے؟

شوکت علی: فی الحال کچھ کہنا مشکل ہے۔ شعر اندرونی کیفیت کے زیر اثر کہتا ہوں اور یہ کیفیت مشاہدات و تجربات کی وجہ سے طاری ہوتی ہے۔ شاعری احساس کے اظہار کا بہت اچھا ذریعہ ہے۔ مگر آسان نہیں ہے۔ بعض اوقات آدمی بے بس ہو کر رو دیتا ہے اور بس۔ کچھ لکھ نہیں پاتا' کچھ کہہ نہیں پاتا'

سوال: کوئی میوزک اکیڈمی وغیرہ قائم کریں گے؟

شوکت علی: اگر اکیڈمی اینٹ گارے سے بنی عمارت کا نام ہے تو شاید نہ بنا سکوں اگر موسیقی کے فروغ یا موسیقی کی حرمت برقرار رکھنے کا نام ہے تو میں ہر طرح کی خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ میرا خیال ہے کہ فن تقسیم نہیں ہوتا۔ تلاش اور جستجو سے ملتا ہے۔ ''میوزک اکیڈمی'' ایک محدود سا تصور ہے جبکہ موسیقی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ میں نے جو تھوڑا بہت جو سیکھا ہے اپنے بڑوں سے سیکھا ہے۔ تلاش و جستجو کے بعد میرے حصے میں آیا ہے۔ پھر بھی اتنا نہیں جتنا کہ میری خواہش تھی۔ اگر اکیڈمی سے سیکھتا تو شاید اب تک فراموش کر دیا گیا ہوتا۔

سوال: کوئی خواہش جو پوری نہ ہو سکی ہو؟

شوکت علی: خواہشات کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کسی ایسی شے کی کمی نہیں جو جان کا روگ بن جائے۔ ایک خواہش اور دعا ہمیشہ سے ہے کہ اللہ کسی کا محتاج نہ کرے۔ اپنے ہاتھ پاؤں چلتے رہیں اور خاتمہ بالخیر ہو۔

سوال: زندگی سے کوئی شکوہ تو نہیں؟

شوکت علی: بالکل نہیں! زندگی نے وہ کچھ دیا کہ مرنے کے بعد بھی چاہنے والے ''شوکت علی'' کو یاد رکھ سکیں۔

# غزل گائیکی کا عظیم گلوکار

## غلام علی

غلام علی گذشتہ چار دہائیوں سے ساز و آواز کی دنیا پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ وہ 5 دسمبر 1941ء کو ضلع سیالکوٹ کے ایک چھوٹے سے گاؤں گلوٹیاں خورد میں پیدا ہوئے۔ والد بھی گلوکار تھے اس لیے گلوکاری سے تعلق تو فطری تھا۔ گھر میں ہی موسیقی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ آواز بچپن میں ہی اچھی تھی۔ سکول میں غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ 13 سال کی عمر میں گاؤں سے کراچی اپنے عزیزوں کے پاس چلے گئے اور وہاں پر ہارمونیم کو ذریعہ روزگار بنایا تین سال کراچی میں رہ کر لاہور آ گئے اور استاد بڑے غلام علی خاں کے شاگرد بنے ان کے علاوہ ان کے دو بھائیوں استاد برکت علی خاں اور استاد مبارک علی خاں سے بھی موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ ریڈیو سے انہوں نے باقاعدہ فنی زندگی کا آغاز کیا۔ پی ٹی وی پر اس کے قیام سے بھی یعنی آزمائشی نشریات سے لے کر اب تک گا رہے ہیں۔ فلموں سے بھی انہوں نے بیشار گیت گائے۔ غزل گانے میں انہیں کمال حاصل ہے۔ پاکستان کے علاوہ بیرون ملک میں بھی گا چکے ہیں۔ 1980ء میں انہیں گلوکاری کے میدان میں شاندار خدمات پر صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان کی طرف سے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔ ان کا شمار ملک کے چند بڑے فنکاروں مہدی حسن، فریدہ خانم، اقبال بانو میں ہوتا ہے۔ انہوں اپنے محنت اور منفرد انداز سے اس وقت اپنے آپ کو منوایا جب مہدی حسن عروج پر تھے۔ ملک کے اس بڑے گلوکار کے ساتھ ایک نشست ہوئی جس میں ان کی نجی اور فنی زندگی کے حوالے سے کچھ گفتگو ہوئی جس کے منتخب حصے نذر قارئین ہیں:

**سوال:** آپ نے گانا کب شروع کیا؟

**غلام علی:** میں نے کئی فنکاروں کے انٹرویوز پڑھے ہیں ان میں زیادہ تر یہی کہتے ہیں کہ بچپن سے ہی گلوکاری یا اداکاری کا شوق تھا جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے لیکن مجھے واقعی بچپن سے ہی گلوکاری کا شوق تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے والد دولت علی جعفری بھی اپنے وقت کے بہت بڑے گلوکار تھے۔ اس طرح مجھے گھر میں ماحول ایسا ملا کہ خود بخود ہی موسیقی کی تعلیم ملتی رہی۔ ریڈیو پر گانے سن کر گنگنایا کرتا۔ میرے والد مجھے گنگناتے ہوئے سنتے تو بہت خوش ہوتے۔ میرے دادا بھی موسیقی سے تعلق رکھتے تھے۔ میری آواز بچپن میں ہی اچھی تھی سکول میں ٹیچر نے مجھے گنگناتے ہوئے سنا تو انہوں نے میری ڈیوٹی لگا دی کہ صبح اسمبلی میں روزانہ حمد و نعت پڑھوں۔ اس وقت میری عمر بمشکل سات سال ہوگی میں جس سکول کی بات کر رہا ہوں وہ ضلع سیالکوٹ کے گاؤں کالیکے ناگرے میں واقع تھا۔ یہ مڈل سکول تھا۔ میرا آبائی گاؤں گلوٹیاں خورد ہے جہاں میں پیدا ہوا۔ میرے دادا اس گاؤں میں آباد ہوئے۔ یہ گاؤں بہت چھوٹا تھا اس میں سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں چنانچہ ہم لوگ موضع کالیکے ناگرے میں شفٹ ہو گئے جہاں میں نے مڈل سکول میں پڑھنا شروع کر دیا۔ پڑھائی بھی ہوتی رہی ساتھ ساتھ اسمبلی میں حمد و نعت بھی پڑھتا رہا۔ سکول گاؤں کے درمیان میں واقع تھا اس لیے جب میں صبح حمد و نعت پڑھتا تو میری آواز سکول کے اردگرد مکانوں میں بھی چلی جاتی۔ سکول کے ساتھ میرے والد کے ایک دوست راجندر سنگھ کا بھی مکان تھا۔

یہ گاؤں کے بڑے زمیندار تھے ان کی بیوی اماں باوی میری امی کی دوست تھیں۔ ان لوگوں نے میری آواز سنی تو میری امی کو پیغام بھجوایا کہ غلام علی سے کہو کہ سکول سے واپسی پر میرے گھر سے ہو کر جایا کرے میں سکول سے فارغ ہو کر اماں باوی کے گھر گیا تو انہوں نے مجھ سے حمد و نعت کے علاوہ جو تھوڑا بہت آتا تھا سنا اور مجھے پانچ روپے انعام دیا۔ میں نے یہ پانچ روپے اپنی اماں کو لا کر دیئے تو وہ غصے میں آ گئیں اور پوچھا کہ کہاں سے چوری کر کے لائے ہو۔ میں نے کہا کہ چوری نہیں کی اماں باوی نے دیئے ہیں۔ میری امی نے اماں باوی سے تصدیق کی۔ اماں باوی نے 5 روپے روزانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ وہ مجھ سے روزانہ حمد و نعت اور گیتوں کے کچھ ٹکڑے جو مجھے آتے سنتیں اور میری حوصلہ افزاء کرتیں جب میں سات سال کا ہوا تو والد صاحب نے گھر میں ہی کلاسیکل کا ریاض شروع کرا دیا۔ جب میں نے تان پلٹا کیا تو میری آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ میری دادی نے دیکھا تو انہیں غصہ آ گیا۔ میرے والد صاحب کو ناراض ہو کر کہنے لگیں کہ میرے پوتے کو مارنا چاہتا ہے اتنی کم عمری میں اسے اتنی مشکل میں کیوں ڈال دیا ہے۔ میرے والد صاحب کہنے لگے کہ کم عمری میں ریاض کیا جائے تو فاؤنڈیشن صحیح بنتی ہے اور جب فاؤنڈیشن صحیح ہو گی تو اس پر بننے والی عمارت بھی مضبوط بنے گی۔ کلاسیکل میں ریاض کیا جائے تو اس کے بعد جو چاہے گاؤ۔ میں نے بچپن میں بہت ریاض کیا۔ والد صاحب سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کے مختلف دیہات اور قصبوں میں جاتے تو میں بھی انکے ساتھ جاتا اور پرفارم کرتا لوگ میری کمسنی میں گائیکی کو بہت پسند کرتے کراچی میں میرے کچھ عزیز رہتے تھے جب 13 سال کا ہوا تو کراچی اپنے عزیزوں کے پاس چلا گیا۔ کراچی جانے کے لیے گوجرانوالہ سے ٹرین پر سوار ہوا۔ روانگی کے وقت میرے پاس صرف ایک شلوار قمیض تھی یہی میری کل جائیداد تھی میں سمجھتا ہوں کہ میرے ساتھ سب سے بڑی دولت میری ماں اور باپ کی دعائیں تھیں۔ کراچی جا کر میں نے صرف 16 دن میں ہارمونیم سیکھ لیا۔ ہارمونیم کے سیکھنے کے بعد آمدنی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آج سے چالیس سال پہلے میں نے 5 روپے ماہوار گھر بھیجنے شروع کر دیئے۔ گاؤں میں اس کی بہت خوشی منائی گئی۔ مجھے کام کا عشق تھا۔ میں گھر میں سب سے بڑا تھا۔ اس لیے والد صاحب کا ہاتھ بٹانا فرض سمجھتا تھا۔ جب میری آمدنی میں کچھ اضافہ ہوا تو میں نے کراچی سے والد صاحب کو خط لکھا کہ اب میں نے کام شروع کر دیا ہے اس لیے اب آپ کام چھوڑ دیں اور آرام کریں۔ میں دو تین سال کراچی میں رہنے کے بعد لاہور آ گیا اور لاہور میں استاد بڑے غلام علی خاں کی شاگردی اختیار کر لی۔ میرے والد استاد بڑے غلام علی خاں سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے میرا نام ہی غلام علی رکھ دیا۔ استاد غلام علی زیادہ تر ملک سے باہر پرفارم کرتے اس لیے وہ کسی کو شاگرد نہیں بناتے تھے ہم نے ان کے دوستوں سے سفارشیں کرائیں چنانچہ وہ مان گئے۔ انہوں نے میرے والد صاحب سے کہا کہ مجھے اس کی آواز سناؤ۔ میں استاد بڑے غلام علی کو سنتا رہتا تھا مجھے ان کی دو تین ٹھمری یاد تھیں میں نے ان میں سے ایک ٹھمری ان کے سامنے گنگنائی۔ غالباً وہ راگ ''کھماج'' میں یہ ٹھمری تھی۔ ''پریم اگن جیارا جلائے''

میں نے ایک دو منٹ گایا۔ استاد بڑے غلام علی خاں ہنس پڑے اور مجھے گلے لگا لیا مجھے پیار کیا اور کہا کہ کل تیری شاگردی کی رسم ہو گی۔ میں استاد بڑے غلام علی خاں کے منہ سے یہ الفاظ سن کر بہت خوش ہوا۔ گویا میرے مقدر جاگ اٹھے۔ میں ان کا شاگرد تو بن گیا مگر خاں صاحب زیادہ تر بیرون ملک رہتے چنانچہ میں نے ان کے دو چھوٹے بھائیوں استاد برکت علی خاں اور استاد مبارک علی خاں سے تربیت حاصل کرنا شروع کر دی۔ استاد برکت علی خاں غزل ٹھمری کی دنیا کے سب سے اچھے استاد تھے۔ ان سے غزل اور ٹھمری کی تعلیم حاصل کی جبکہ کلاسیکل کی فاؤنڈیشن استاد مبارک علی خاں نے بنائی۔ ان سے

کلاسیکل کے علاوہ سرگم بھی سیکھا اور راگ بھی۔ پہلے راگ بھیرو سیکھا جاتا ہے پھر بھیرویں ہے پھر توڈیاں ہیں جن میں گجری توڈی ہے اور میاں توڈی شامل ہیں پھر کلاسیکل تھا۔ میر کھنڈ سرگم سیکھا۔ دس بارہ سال ان دونوں بھائیوں کے پاس رہا۔ لاہور کے سید مٹھا بازار کے کونے پر دونوں بھائیوں کی بیٹھکیں ہوتی تھیں۔ ان کے پاس دن بھر ریاض کرتا رہتا۔ استاد امرتسری ریڈیو میں افسر بھی تھے اور شاعر بھی ایک دن وہ آئے تو میں گا رہا تھا انہوں نے پوچھا کہ کون گا رہا ہے اسے بلاؤ میں آ گیا۔ اُنہوں نے کہا کہ بہت اچھا گایا۔ انہوں نے میرے سامنے ہی استاد برکت علی خاں سے کہہ دیا کہ یار اس کو ریڈیو پر بھیج دو شاد صاحب نے میری طرف دیکھا میں نے کہا خان صاحب نے اجازت دی تو ریڈیو پر آ جاؤں گا خاں صاحب نے کہا کہ کل چلے جانا۔ غالباً یہ 1957ء کی بات ہے۔ میں ریڈیو پر چلا گیا۔ وہاں میرا آڈیشن ہوا۔ ان دنوں لاہور ریڈیو کے سٹیشن ڈائریکٹر آغا بشیر تھے۔ ان کے ساتھ ایوب رومانی بھی تھے۔ میں نے آڈیشن کے لیے ابھی گانا شروع ہی کیا کہ سرخ بتی جل گئی اور مجھے کہا گیا کہ بس کرو۔ میں پریشان ہو گیا کہ شاید میرا گانا معیار پر پورا نہیں اترا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ آڈیشن لینے والے پینل نے میرے نام کے سامنے "ایکسیلنٹ" لکھ دیا آڈیشن کے تین چار روز بعد مجھے پروگرام کے لیے بلا لیا گیا پہلے پروگرام کے مجھے 15 روپے ملے۔ اس پروگرام کا نام نوائے شوق تھا۔ یہ پروگرام میں نے دو مہینے کیا۔ پھر B کیٹگری میں آ گیا اس کی فیس 25 روپے تھی۔ پھر 60 روپے ہوئی۔ پھر 120 روپے، پھر اے کلاس پھر آؤٹ سٹینڈنگ تک یہ سفر بڑی تیزی سے طے ہوا۔ 1960ء میں ریڈیو پر میری پہلی غزل ریکارڈ ہوئی اس غزل کے بول تھے

شام کو صبح چمن یاد آئی
کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی

اس کے شاعر تھے احمد ندیم قاسمی جب قاسمی صاحب نے اس غزل کی ریکارڈنگ سنی تو ریڈیو پر آ گئے اور پوچھنے لگے کہ غلام علی کہاں ہے جس نے میری غزل گائی ہے۔ اتفاق سے میں وہیں تھا میں قاسمی صاحب کے سامنے آ گیا۔ وہ کہنے لگے یہ غلام علی نہیں ہو سکتا جس غلام علی نے میری غزل گائی ہے وہ کسی میچور آدمی کی آواز ہے۔ میرے پاس کھڑے لوگوں نے کہا کہ یہی غلام علی ہے بیشک اس سے سن لو۔ میں نے وہ غزل سنائی تو انہوں نے بہت پیار کیا۔ انہی دنوں ناصر کاظمی اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم سے ریڈیو پر ہی ملاقات ہوگئی۔ یہ لوگ ریڈیو پر روزانہ آتے تھے۔ ان سے میں نے بڑی حد تک تعلیم حاصل کی۔ ان ہستیوں سے میں نے تلفظ سیکھا۔ 65ء کے بعد میری مقبولیت میں کافی اضافہ ہو گیا۔

سوال: پی ٹی وی پر گلوکاری کب شروع کی؟

غلام علی: پی ٹی وی شروع تو 64ء میں ہوا مگر سروے کے لیے 61ء میں جاپانی ماہرین کی ایک ٹیم لاہور آئی اور اس ٹیم نے منٹو پارک میں جو آزمائشی پروگرام تیار کیا، اس میں میں نے کافی گائی، لوگوں نے مجھے بتایا کہ ہم نے تیری تصویر دیکھی ہے تو یہ کافی گا رہا تھا تو گویا ٹی وی پر میں آزمائشی پروگراموں سے ہی گا رہا ہوں پھر 64ء میں پی ٹی وی قائم ہو گیا تو میں نے گانا شروع کر دیا اور آج تک سلسلہ جاری ہے۔ پی ٹی وی کے پروگرام میں ایک غزل "فنکار" محفل، بزرگانِ دین پر عارفانہ کلام جو زیادہ تر شاہ حسین اور خواجہ غلام فرید کی کافیوں پر مشتمل تھا گایا۔ اس کے بعد "غزل اس نے چھیڑی، پھر تخنور، پھر سرگم، محفل شب، محفل موسیقی میری پسند، شامل ہیں میں نے سولو پروگرام بھی کیے ہیں۔

سوال: آپ نے فلموں میں گلوکاری کیسے شروع کی؟

غلام علی: والد صاحب اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ میں فلموں میں گاؤں۔ کہتے تھے کہ وہ گاؤ جس کی لائف زیادہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم ایسا گاؤ کہ لوگ آواز سن کر پہچان جائیں کہ یہ غلام علی گا رہا ہے میں سمجھتا ہوں کہ میرے والد صاحب کی دعا قبول ہوگئی ہے، میں نے بڑی مشکل سے والد صاحب سے یہ کہہ کر فلموں میں گانے کی اجازت لی کہ اگر فلم میں اچھا گانا ہوا تو گاؤں گا ورنہ نہیں گاؤں گا۔ میں نے جس فلم کا پہلا گانا گایا اس گانے میں میرے علاوہ ملکہ ترنم نور جہاں اور نسیم بیگم تھیں۔ یہ گانا اعجاز اور فردوس پر عکسبند ہوا۔ اس کے بعد فلم ''ٹھاہ'' میں گایا اس کے ڈائریکٹر دلجیت مرزا تھے اور میوزک ڈائریکٹر مرحوم صفدر حسین تھے۔ اس گانے کے بول تھے ''پہلی واری اج ایناں اکھیاں نیں تکیا'' اس کے بعد میرا ایک فلمی گانا بہت مقبول ہوا۔ اس کے بول تھے۔

چھپے دیئے بند کلیے

اس کے بعد میں نے ریڈیو پر ایک گانا ریکارڈ کرایا جس کے بول تھے۔

''میرے شوق دا نہیں اعتبار تینوں''

یہ گانا بعد میں فلم میں شامل کرلیا گیا پھر میں نے ایک غزل گائی جس کے بول تھے ''تم سلامت رہو'' اس کی موسیقی ناشاد نے ترتیب دی تھی پھر فلم کامیابی کا ایک گانا بہت ہٹ ہوا اس کے بول تھے ''جو زمانے میں ہمت نہ ہارے'' اس کا میوزک ایم اشرف نے ترتیب دیا تھا، ایم اشرف کی ہی موسیقی میں ایک اور گانا گایا جس کے بول تھے۔ اللہ ہی اللہ صبح شام کیے جا'' اس میں میرے ساتھ مہناز نے گایا تھا پھر ملکہ ترنم نور جہاں کے ساتھ ایک '' گانا گایا اس کے بول تھے ''سوہنیے توں حسن دی کتاب'' پھر رونا لیلی کے ساتھ ایک چند دوگانے گائے ایک سرائیکی فلم جس میں گایا اس کے بول تھے ''نیناں دے بوہے بند نہ کر'' اس کے موسیقار کالے خاں تھے۔ میں یہاں پر اپنی ایک غزل ''جو مولانا حسرت موہانی کی لکھی ہوئی'' اور جس کے بول ہیں 'چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے'' کا ذکر ضرور کروں گا۔ یہ غزل میں نے 75ء میں گائی بہت مقبول ہوئی۔ بلکہ اب تک مقبول ہے

سوال: آپ نے کون کون سے ممالک میں پرفارم کیا؟

غلام علی: میں نے دنیا کے بہت سے ممالک میں پرفارم کیا ہے جن میں برطانیہ، آسٹریلیا، امریکہ، کینیڈا، کویت، بحرین، چین، ہانگ کانگ، بنگلہ دیش، بھارت اور نیپال شامل ہیں۔ نیپال میں میں نے پہلی دفعہ بیس برس قبل پرفارم کیا نیپال کے شہنشاہ بریندرا نے مجھے بلایا میں نے نیپال کے شہنشاہ کے باپ کے لکھے ہوئے گانے بھی گائے نیپالی زبان میں تو بہت گانے گائے نیپال کے علاوہ بنگالی، اردو، پنجابی، سرائیکی اور پشتو زبان میں گانے گائے۔

سوال: آپ کی فنی زندگی میں کوئی دلچسپ واقعہ پیش آیا؟

غلام علی: میری فنی زندگی میں بہت سے دلچسپ واقعات پیش آئے جن میں سے میں یہاں پر دو واقعات کا ضرور کروں گا کہ ایک واقعہ تو اسلام آباد میں پیش آیا کہ میں وہاں پر ایک دوست کے ہاں گیا تو اس نے بتایا کہ وہاں پر ایک انگریز رہتا ہے اور وہ میرا گایا ہوا گانا ''چھپے دیئے بند کلیے'' گنگناتا رہتا ہے۔ ایک واقعہ لندن کے ویمبلے ہال میں پیش آیا وہاں پر میں نے جب گایا تو وہاں پر ایک برطانوی صحافی جو غالباً گارڈین اخبار کا تھا اس نے میری بہت تعریف کی اور اخبار میں میرے بارے میں لکھا کہ ایک پاکستانی گلوکار اپنی زبان میں گاتا ہے مگر اسے دوسری زبانوں والے بھی پسند کرتے ہیں۔ اس کے پاس کوئی جادو

ہے میں اپنے بارے میں یہ ریمارکس پڑھ کر بہت خوش ہوا۔

سوال: آپ نے کوئی البم بھی بنائے ہیں؟

غلام علی: ہر سال میں ایک دو البم نکالتا رہتا ہوں میرا ایک البم ''آوارگی'' جس کی شاعری محسن نقوی کی ہے بہت ہٹ ہوا خصوصاً اس البم کا ایک گانا

یہ دل یہ پاگل دل میرا
کیوں بجھ گیا آوارگی

بہت ہی پسند کیا گیا۔ پھر ناصر کاظمی کے کلام پر مشتمل ''دل میں اک لہر سی اٹھی ہے'' پھر ابن انشاء کے کلام ''کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا تیرا''

پھر یہ باتیں جھوٹی باتیں ہیں، یہ دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے، یہ ہٹ آئٹم میرے البم کے ہی ہیں جب تک میری آواز میں گانے کے لیے طاقت ہے تب تک میں گاتا رہوں گا۔

سوال: آج کل جو گلوکار پاپ گا رہے ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

غلام علی: جو گلوکار باقاعدہ سیکھ کر گاتے ہیں وہ اچھا گاتے ہیں سر میں گاتے ہیں لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ آج کل زیادہ نئے گلوکار باقاعدہ سیکھ کر نہیں گاتے۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔

سوال: کھانا پکا لیتے ہیں؟

غلام علی: کوکنگ بالکل نہیں کر سکتا البتہ یہ بتا سکتا ہوں کہ اچھا کھانا کون سا ہے۔

سوال: پسندیدہ کھانے کون سے ہیں؟

غلام علی: میں ہلکے پھلکے اور سادہ کھانے پسند کرتا ہوں۔

سوال: کیا آپ کے بچے بھی گلوکاری کی طرف آ رہے ہیں۔ اگر جواب ہاں میں ہے تو کیا وہ اُس مقام تک پہنچ پائیں جس پر آپ فائز ہوئے۔

غلام علی: میں اپنی اولاد کے معاملے میں بہت خوش قسمت ہوں۔ میرے تین بیٹے نذر عباس، عامر علی اور عمران علی ہیں، سب سے بڑا بیٹا نذر عباس ہے۔ اس نے صحیح معنوں میں میرا ساتھ دیا ہے۔ غزل گانے میں اسے خصوصی مہارت حاصل ہے۔ جب یہ نو دس برس کا تھا تو اس نے میرے ساتھ گانا شروع کر دیا بچپن سے ہی اسے گانے کا شوق تھا۔ میں نے اسے گلوکاری کے حوالے سے جو بتایا اس نے اسے غور سے سنا اور پھر بہت زیادہ ریاضت کی۔ اس نے ریڈیو پر بے شمار پروگراموں میں شرکت کی۔ میرے ساتھ پروگراموں میں پرفارم کرتا ہے اور گانے کے دوران مجھے سانس دلاتا ہے میرے ساتھ اس کی بہت ہم آہنگی ہے۔ نذر عباس نے میرے ساتھ نہ صرف پاکستان میں بلکہ پاکستان سے باہر بھی کئی ممالک میں میرے ساتھ پرفارم کیا۔

میرا دوسرا بیٹا عامر علی ہے۔ اس نے بھی مجھ سے گلوکاری کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ غزل کلاسیکل فوک گیت کافی پوپ سمیت گائیکی کی متعدد اصناف میں مہارت رکھتا ہے۔ اس کا رجحان پوپ میوزک کی طرف زیادہ ہے میں نے اسے اس لیے منع نہیں کیا کہ پاپ بھی سر میں گاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میوزک کلاسیکل ہو یا پاپ سر میں گایا جائے تو کانوں کو بھلا لگتا

ہے۔ عامر علی نے حال ہی میں اپنی گائیکی پر مشتمل البم ریلیز کیا ہے۔ اس میں زیادہ تر فاسٹ میوزک ہے۔ اس کے علاوہ کچھ غزلیں بھی ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی ہے کہ اس کی گائیکی کو لوگوں نے پسند کیا ہے میں نے اسے کہا ہے کہ اپنی شناخت بناؤ۔ والد کی شناخت سے زیادہ دیر نہیں چل سکو گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے گائیکی میں مجھ سے بالکل مختلف انداز اپنایا ہے۔ پچھلے دنوں اس نے کچھ تقریبات میں پرفارم کیا جو لوگوں نے پسند کیا مجھے اس وقت بہت خوشی ہوئی۔

میرا تیسرا بیٹا عمران علی ہے، اس نے حال ہی میں ایم بی اے کیا ہے اور اب ذاتی بزنس کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ غلام علی نے کہا کہ میں نے بچوں کو مجبور نہیں کیا کہ وہ گلوکاری کو اپنائیں یا نہ اپنائیں۔ میں نے انہیں مکمل آزادی دی، دو بیٹے گلوکاری سے دلچسپی رکھتے تھے انہیں گلوکاری کے بارے میں بتایا۔ اب وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہیں۔ تیسرا بیٹا ایم بی اے کرنا چاہتا تھا اسے ایم بی اے کرایا اب وہ بزنس کرنا چاہتا ہے اور اس معاملے میں بھی جہاں تک ممکن ہوا میں اس کا تعاون کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ نذر عباس اور عامر علی اچھا گا رہے ہیں۔ زیادہ محنت کریں گے تو زیادہ نام کمائیں گے۔

❁❁❁

**جذام** (معاشرتی رومانی ناول)

**جذام** ایک معاشرتی رومانی ناول ہے جس میں بشریٰ سعید نے ہمارے اس عقیدے کو بہت خوبصورتی سے کہانی کے تانے بانے میں بنا ہے کہ جہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی آزمائش لیتا ہے اور اس آزمائش میں پورا اترنے والوں کے درجات بلند کرتا ہے، وہیں دوسری طرف وہ اپنے گناہ گار اور صراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے بندوں سے بھی منہ نہیں پھیرتا بلکہ انھیں بھی سنبھلنے کا ایک موقع ضرور دیتا ہے۔ شرط صرف صدق دل سے اُسے پکارنے کی ہے پھر چاہے معصوم فطرت "عائشہ" ہو یا باطنی طور پر کوڑھی "جاشیہ" وہ سب کی پکار سنتا ہے۔ سب پر رحم کرتا ہے۔ اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئیے۔ **جذام** کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

# لائف ٹائم ٹریبوٹ بی بی سی ایوارڈ حاصل کرنے والے
# جدید گائیکی کا معمار استاد نصرت فتح علی خاں

استاد نصرت فتح علی خان کو ہم سے جدا ہوئے سات برس ہوگئے ہیں ان چھ برسوں کے دوران ترتیب پانے والی موسیقی کا حقیقت پسندانہ انداز سے تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ جیسے سُر کا سفر تھم سا گیا ہے۔ موسیقی محض شور و غوغا بن کر رہ گئی ہے ہماری گائیکی میں سے نغمگی، رچاؤ، سرتال کا زیر و بام، سوز و گداز مفقود ہو چکا ہے۔ کوئی ایسا موسیقار اور گلوکار نظر نہیں آتا جو موسیقی کی اس جمودی کیفیت کا تسلسل توڑنے کی اہلیت اور صلاحیت رکھتا ہو۔ نصرت فتح علی خان نے موسیقی اور گائیکی میں نئے نئے تجربات کر کے عالمی شہرت و مقبولیت حاصل کی انہوں نے مشرقی موسیقی اور مغربی آرکیسٹرا کی خوبصورت اور دلکش آمیزش سے جو دھنیں کمپوز کیں انہیں دنیا بھر میں قبول عام کی سند حاصل ہوئی۔ مشرقی موسیقی کو چونکہ ماضی میں چند گھرانوں تک محدود رکھا گیا ہے اس لیے وہ دنیا میں راہ پانے والی تیز رفتاری کا ساتھ دینے کے قابل نہیں رہی تھی انسان نے سائنس کی حیرت انگیز ترقی کی بدولت اتنی تیز روی حاصل کر لی کہ ستاروں پر کمندیں ڈالنا شروع کر دیں سائنس کی اس ترقی سے انسانی رویوں میں بھی عجلت اور تیزی آ چکی ہے مغرب کے موسیقاروں نے اس تیز رفتاری کا ساتھ دینے کے لئے موسیقی اور گلوکاری میں بھی تیزی پیدا کر کے الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے ثقافتی یلغار کر دی اور ہر طرف فاسٹ بیٹ کے شور و غوغا سے بھرپور گیت سنائی دینے لگے ہماری نئی پود بھی موسیقی کی اس تیز رو میں بہنے ہی والی تھی کہ استاد نصرت فتح علی خان میدان میں آئے اور انہوں نے زمانے کی تیز رفتاری کا ساتھ دینے کیلئے موسیقی کے شائقین کو جدید آہنگ سے روشناس کیا۔ اپنے تمام تر تاثر اور رچاؤ کے باوجود ہماری کلاسیکی موسیقی آہستہ رو ہے۔ نصرت فتح علی خان نے اسے روک میوزک کی فاسٹ لے سے ہم آہنگ کر کے اسے فاسٹ میوزک کی رسیا نئی نسل کے لئے پسندیدہ بنا دیا۔ انہوں نے لوک کے علاوہ امریکی، جاپانی، یورپی، افریقین موسیقی کی لوک روایات اور عوامی موسیقی کو اپنی آواز اور موسیقی میں سمو لیا۔ نصرت فتح علی خان کی سحر انگیز آواز میں ایک ایسا تاثر موجود تھا جس کا تجزیہ کرنا ناممکن تھا وہ اپنے سامعین کو اپنے سروں سے مسحور کر کے نغمگی کی ایسی دنیا میں لے جاتے جہاں وہ ان کی پرکشش آواز کے زیر و بام سے محظوظ ہو کر کیف و مستی کا شکار ہو جاتے۔ نصرت فتح علی نے اپنی گائیکی اور قوالی کے ذریعے کلاسیکی موسیقی کو عام آدمی تک پہنچایا۔ نصرت فتح علی خان کے ان اوصاف اور کاوشوں کو پاکستان سے پہلے بیرون ملک تسلیم کیا گیا مغربی دنیا نے ان کے تان پلٹوں، مشرقی موسیقی کی مغربی سازوں سے آمیزش، قدیم راگوں کی جدید موسیقی کی مغربی سازوں سے آمیزش، قدیم راگوں کا جدید موسیقی سے اشتراک، عارفانہ کلام کی رفعت، انسان کی مختلف کیفیات کا مشاہدہ، وجد اور کیف و مستی کے والہانہ مظاہرے کو محض پیشہ ورانہ شعبدہ بازی کی بجائے اس کے موسیقی سے لگاؤ اور روحانیت پر یقین و اعتقاد کا ثمر سمجھا اور پوجنے کی حد تک اس کا ادب اور احترام کیا۔ یوں نصرت فتح علی خان کو موسیقی کے حوالوں سے دنیا میں پاکستان کے حقیقی ثقافتی سفیر کی حیثیت حاصل ہو گئی اور وہ موسیقی کے ساتھ ساتھ پاکستان کی شناخت اور پہچان کا بھی موثر ذریعہ بن گئے امریکہ ہو یا برطانیہ، جاپان ہو یا کینیڈا، بھارت ہو یا مشرق وسطی فرانس ہو یا آسٹریلیا یا جرمنی، اسرائیل کے سوا دنیا کے ہر ملک میں نصرت فتح علی خان کی قوالی اور گائیکی پر لوگ وجد اور کیف و مستی سے سرشار ہو کر محو رقص ہو جاتے تھے۔

دنیا کے بڑے بڑے موسیقاروں اور دانشوروں نے نصرت فتح علی خان کی موسیقی کے اس سحرانگیز تاثر کو بیان کرتے ہوئے انہیں خراج تحسین اور خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ موسیقار مائیکل بروک، نصرت فتح علی کو سپاس عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''نصرت فتح علی خان کی موسیقی میں آفاقی عنصر پایا جاتا ہے اور ان کی آواز میں ایک گہرا تاثر ملتا ہے جو مسحور کن اور طلسماتی اثر رکھتا ہے اس کے فن میں ارضی اور آسمانی یا مادی اور روحانی دونوں اثرات موجود ہیں اور یہ وصف ان کے عظیم آرٹ کی علامت ہیں۔''

روپ بروک مین کہتا ہے کہ نصرت فتح علی خان موسیقی کی دنیا کا ایک بے مثال سپر سٹار ہے اس کا کوئی ثانی نہیں وہ قوالی کی اس روایت کا ایک عظیم اور اعلیٰ فنکار ہے جو سات سو سال سے چلی آرہی ہے ان کی آواز میں ایک ایسا ناقابل یقین تاثر موجود ہے جو کسی اور گائیک کی آواز میں نہیں ملتا۔ ان کی آواز کی خوبصورتی اور شدت سننے والوں کو کہیں دور روحانی دنیا میں لے جاتی ہے۔''

نصرت فتح علی خان کی آواز کا یہی تاثر تھا جس پر امریکہ میں تحقیق کی جارہی تھی کہ اس آواز کے تاثر کی خوبیوں کا تجزیہ کرکے اسے بیماریوں کے علاج کے لئے بروئے کار لایا جائے موسیقی کے ذریعے اس طریقہ علاج کو طب کی زبان میں میوزک تھراپی کہا جاتا ہے یہ تحقیق ابھی جاری تھی کہ نصرت فتح علی خاں گردوں اور ہپاٹائٹس سی کے امراض میں مبتلا ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ قدرت کی طرف سے اگر انہیں مہلت ملتی تو وہ فنکار کے علاوہ ایک مسیحا کے طور پر بھی دنیا میں نام پیدا کرتے، موسیقار اور گلوکار پیٹر گیبریل نصرت فتح علی خان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''نصرت فتح علی خان کو جب میں نے پہلی بار لندن کے ایک میوزیکل شو میں سنا تو اس کا ردھم، تال، بیٹ سب میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا صرف دو تین سازوں کے ساتھ تالیوں کا تال میل اور ان کے ہمراہ نصرت کی دلکش آواز جس کی رینج اتنی زیادہ ہے جس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ فن کی ان خوبیوں کی بنیاد پر میں نے نصرت کو اپنی فلم لاسٹ ٹیمپٹیشن آف کرائسٹ کے پس منظر کے میوزک کے لئے استعمال کیا۔ نصرت فتح علی خان کی آواز نے اس فلم کو چار چاند لگا دیے۔

آپ 1948ء میں پاکستان کے شہر لائل پور (فیصل آباد) میں پیدا ہوئے آپ کا ابتدائی نام پرویز رکھا گیا اور پیار سے پیجی کہا جاتا رہا ایک بزرگ نے آپ کے والد کو کہا کہ اس بچے کا نام ٹھیک نہیں ہے اسے بدل دو۔ بعدازاں آپ کا نام نصرت علی رکھا گیا۔ تیسری جماعت تک سیکرڈ ہارٹ سکول میں تعلیم حاصل کی میٹرک کا امتحان پاکستان ماڈل ہائی سکول فیصل آباد سے پاس کیا۔ آپ کو بچپن سے ہی انگریزی اور فائن آرٹس گری میں دلچسپی تھی آپ نے سکول میں بھی اپنی قوال پارٹی بنا رکھی تھی۔ سکول پارٹی کے ہمراہ ایک مرتبہ آپ گورنمنٹ کالج اپنے فن طبلہ بجانے کا مظاہرہ کرنے گئے۔ تو وہاں پہلا انعام حاصل کیا۔ آپ کی والدہ آپ کو طبلہ بجانے سے منع کرتی تھی۔ ایک روز بھارت سے ایک گانے والا فیصل آباد آیا اس نے شکوے کے انداز میں آپ کے والد سے کہا کہ جب وہ راگ گاتے ہیں تو اس راگ میں طبلے پر میرا پورا ساتھ کوئی نہیں دیتا اس پر آپ کے والد نے کہا آج سے میرا بیٹا نصرت تمہارے ساتھ ٹھیکا لگائے گا اس پر گائیک نے مذاق سے کہا اس بچے نے کیا ٹھیکا لگانا ہے آپ کے والد نے کہا کہ دیکھو تو سہی۔ شاید یہ تمہارے معیار پر پورا اتر جائے۔ پھر جب آپ نے اس گائیک کے ساتھ ٹھیکا لگایا تو گائیک کے پسینے چھوٹ گئے اور وہ گا نہ سکا۔ آپ کو بچپن سے کرکٹ کھیلنے کا بھی شوق تھا۔ کچھ عرصہ گانا اور کرکٹ کا شوق ساتھ ساتھ چلتا رہا جسم بھاری بھرکم ہونے کی بنا پر ساتویں جماعت کے بعد کرکٹ کو خیر باد کہنا پڑا۔ حقیقت میں والد آپ کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے یہی وجہ تھی کہ سکول میں آرٹس کے مضامین تبدیل کرا کے سائنس کے مضامین رکھوائے گئے مگر آپ کا ذہن پڑھائی سے زیادہ خاندانی گائیکی کی طرف زیادہ مرکوز تھا۔ نصرت فتح علی خان کی ساری خواہشیں پوری ہوئیں مگر ایک خواب ادھورا رہا۔ وہ میوزک اکیڈمی کے قیام کا تھا۔ وہ میوزک اکیڈمی کے ذریعے کلاسیکی موسیقی کا اثاثہ نئی نسل کو منتقل کرنا چاہتے تھے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا اور نہ ہی ان کے بعد ان کے ورثا یا حکومت نے ان کے خواب کی تکمیل کیلئے قدم اٹھایا۔ اب ان کا فن ہی ایسا ورثہ ہے جس سے نئے فنکار کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ یہ فن ہی نوجوان نسل کیلئے اکیڈمی کا درجہ رکھتا ہے۔ نصرت فتح علی خان کو موسیقی کا فن ورثے میں ملا۔ ان کے والد فتح علی

خان اور تایا مبارک علی خان اپنے دور کے نامور قوال اور گائیک تھے جو کہ قیام پاکستان کے بعد جالندھر سے ہجرت کر کے فیصل آباد میں آباد ہو گئے۔ نصرت فتح علی خان کا بچپن اور فنی سفر کا ابتدائی وقت فیصل آباد میں ہی گزرا۔ نصرت فتح علی خان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دِلا کر ڈاکٹر بنائیں۔ اس لئے کہ ان کا خیال تھا کہ نصرت فتح علی خان کی آواز میں وہ خصوصیت نہیں ہے جو ایک گائیک یا قوال میں ہونی چاہئے۔ مگر دوسری طرف نصرت فتح علی خان کو موسیقی سے لگاؤ تھا اور وہ اپنے آبائی پیشے کو ہی اپنانا چاہتے تھے۔ مگر والد صاحب کی ڈانٹ کے ڈر سے خاموش رہتے۔ جب ان کے والد صاحب اپنے شاگردوں کو موسیقی کی تعلیم دیتے تو وہ دوسرے کمرے میں دروازے کے پیچھے کھڑے ہو کر انہیں غور سے سنتے، دل میں دہراتے اور تنہائی میں اس کی مشق کرتے۔ ایک دن وہ تنہا بیٹھے مشق کر رہے تھے کہ ان کے والد آ گئے انہوں نے جب بیٹے کو کلاسیکل موسیقی کی مشق کرتے سنا تو حیران ہو گئے۔ جب نصرت کی نظر والد صاحب پر پڑی تو وہ گھبرا گئے۔ مگر والد صاحب نے تسلی اور حوصلہ دیا اور پوچھا کہ یہ سب اس نے کیسے اور کہاں سے سیکھا تو نصرت نے والد کو سب کچھ بتا دیا اور اپنے جذبہ شوق کا اظہار کر دیا۔ اسی دن سے والد نے نصرت کے شوق کا احترام کرتے ہوئے انہیں موسیقی کی باقاعدہ تعلیم دینا شروع کر دی۔ وہ صبح فجر کی سیر کیلئے نکلتے تو نصرت کو ساتھ لے جاتے۔ ساتھ ساتھ باتیں بھی ہوتیں اور موسیقی کے اسرار و رموز پر گفتگو بھی ہوتی۔ انہی دنوں نصرت پاکستان ماڈل سکول میں تعلیم بھی حاصل کر رہے تھے اور موسیقی کا علم حاصل کرنے کی منازل بھی طے کر رہے تھے۔ ابھی وہ میٹرک کے طالب علم ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ گھر چلانے کی ذمہ داری ان کے ناتواں کندھوں پر آ پڑی۔ ساتھ ساتھ والد اور تایا مبارک علی خان کی جانشینی بھی ان کے حصے میں آئی۔ اپنے والد صاحب کے چہلم کے موقع پر انہوں نے اپنی زندگی کی پہلی پرفارمنس دی۔ سننے والوں نے تو اسی وقت کہہ دیا کہ وہ فنی حوالے سے اپنے خاندان کے حقیقی جانشین ہیں۔ یہیں سے ان کے فنی سفر کا آغاز ہوا۔ انہوں نے پہلی پبلک پرفارمنس ریڈیو پاکستان لاہور کے پروگرام جشن بہاراں میں دی۔ پھر جدوجہد، شہرت اور مقبولیت کا ایسا سفر شروع ہوا کہ نصرت فتح علی خان نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ان کے قدم آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ انہیں پہچان دی اور پھر چند سال بعد ہی ان کی قوالی "علی مولا علی" نے ہر طرف کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے، ہر طرف نصرت فتح علی خان کا نام گونجنے لگا۔ بلکہ ان کے نام کی گونج سرحدوں کو بھی عبور کر گئی۔ نصرت فتح علی خان نے اجمیر شریف میں حاضری دی۔ دہلی اور ممبئی گئے۔ اجمیر میں راج کپور سے ملاقات ہوئی۔ راج کپور ان کے والد کے بڑے مداح تھے۔ جب ان سے نصرت فتح علی خان کا تعارف ہوا تو انہوں نے نصرت فتح علی خان کو اپنے گھر بلا لیا اور ان سے فرمائش کر کے مختلف آئٹمز سنتے رہے۔ نصرت فتح علی خان کے فنی سفر کو نیا موڑ اس وقت ملا جب ان کی قوالی "اللہ ہو" ہٹ ہوئی اور انہوں نے برطانیہ کا دورہ کیا۔ لندن میں تو گورے انہیں "مسٹر اللہ ہو" کے نام سے پکارنے لگے۔ انہوں نے اپنی قوالیوں کے ذریعے نہ صرف مشرق کی ترویج کیلئے کام کیا بلکہ اس سے دینی تبلیغ کا کام بھی لیا انہوں نے جاپان، فرانس، جرمنی، امریکہ وغیرہ پوری دنیا کے دورے کئے۔ فرانس اور جاپان میں ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وہاں کی حکومت نے انہیں وہاں کی شہریت کی پیش کش بھی کر دی۔ جسے حب الوطنی کے جذبے کے تحت نصرت فتح علی خان نے قبول نہ کیا۔

ہالی وڈ کے معروف میوزک ڈائریکٹر پیٹر گبریل کو اپنی فلم "ٹیمپٹیشن آف کرائسٹ" کے لئے ایسی آواز کی ضرورت تھی۔ جس میں سوز اور درد ہو۔ اصل میں وہ یہ آواز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کرنے والے منظر کے پس منظر میں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ برطانیہ میں انہیں جب نصرت فتح علی خان کو سننے کا موقع ملا تو نصرت فتح علی خان کا سرگم، سر، تان اور لے سننے کے بعد پیٹر گبریل نے فوراً کہہ دیا کہ مجھے اسی آواز کی تلاش تھی انہوں نے نصرت فتح علی خان کو اپنے سٹوڈیو بلایا اور ان کی آواز میں مذکورہ فلم کا گانا ریکارڈ کیا۔ اس گانے کی ریکارڈنگ سے نصرت فتح علی خان پوری دنیا میں مقبول ہو گئے۔ ان کے پرستاروں میں وہ گورے اور گوریاں بھی شامل ہو گئے جو ان کی زبان نہیں سمجھتے تھے مگر نصرت فتح خان کے سچے سروں پر جھومتے تھے اور پھر نصرت فتح علی خان نے جب مشرقی اور مغربی موسیقی کو ملا کے "دم مست قلندر" والا گیت تخلیق کیا تو ہر طرف دھوم مچ گئی۔ بیشتر فنکار نصرت فتح علی خان کے نقش قدم پر چلنے لگے بعد ازاں نصرت فتح علی خان کی آواز میں "ڈیڈ مین واکنگ" کا گیت بھی ریکارڈ کیا گیا۔ انہوں

نے "پینٹ کوئن" کی پس منظر موسیقی بھی ترتیب دی۔ جو کہ نیا تجربہ اور نیا انداز تھا۔ یورپ کے ساتھ انہیں بھارتی فلموں میں گانے اور موسیقی ترتیب دینے کی آفرز بھی ہوئیں۔ انہوں نے اپنا استاد تسلیم کرتے ہوئے انہی کے انداز کو اپنایا نصرت فتح علی خان نے باوجود بیماری اور مسائل کے اپنے آپ کو اپنے کام میں مصروف رکھا۔ پہلی ریکارڈنگ 1973ء میں ہوئی اس کے بعد کل 20 سالوں میں ان کے 150 البم ریلیز ہوئے۔ کام کی زیادتی ہی ان کی صحت کی خرابی کا سبب بنی اور 48 سال کی عمر میں لندن کے معروف ہسپتال میں چند دن زیر علاج رہ کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کے پرستاروں کیلئے ساون رت کی جھڑی آنسوؤں کی جھڑی میں تبدیل ہو گئے نصرت فتح علی خان کو ہم سے بچھڑے سات سال تو بیت گئے ہیں مگر وہ اپنے گیتوں کی صورت میں آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ پاکستان کے نصرت فتح علی خان نے قوالی کے 125 سے زائد البم ریکارڈ کروائے ان کی وفات 1999 میں ہوئی اپنی وفات کے وقت وہ بے حد مشہور و مقبول قوال کے طور پر پہچانے جاتے تھے امریکہ میں انہوں نے ایک مشہور البم 1998ء میں ریکارڈ کروایا جس کا The last Temptation of christ تھا جبکہ ایک اور البم انہوں نے 1995ء میں امریکہ میں ہی ریکارڈ کروایا جس کا Dead Man Walking تھا۔

نصرت فتح علی خان نے یورپ کے کٹر عیسائیوں اور یہودیوں کو "تیرے سوہنے مدینے تو قربان میں" گا کر کالی کملی والے محمد ﷺ کی ثناء خوانی پر مجبور کر دیا اور پھر زمانے کے مورخ نے وہ منظر بھی دیکھا جب غیر مسلم "اللہ ہو اللہ ہو" کہتے ہوئے محفلوں میں جھوم اٹھے۔

نصرت فتح علی خان کی یہ خوبی تھی کہ انہوں نے بھی کلام کے معاملے میں سمجھوتہ نہ کیا، اچھا کلام ڈوب کر سمجھ کر اور جذباتی ہو کر گایا اور سننے والوں کے دل میں اترتے چلے گئے۔

نصرت فتح علی خان کو امیر خسرو سے خاص لگاؤ تھا جبکہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ کی شخصیت اور شاعری سے خاص طور پر متاثر تھے ڈاکٹر صاحب کا کلام انہوں نے خاص محبت کے ساتھ گایا وہ اکثر محفلوں میں کہا کرتے تھے کہ مجھے جو عزت شہرت ملی اس میں بڑا کردار علامہ اقبالؒ کی حقیقی شاعری کے جذبہ شوق کا ہے جس کو ادا کرتے ہوئے میرے اندر کا جذبہ عشق پوری جوانی پر ہوتا ہے۔ نصرت فتح علی خان نے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" گا کر نوجوانوں تک کلام اقبال پہنچایا علامہ اقبالؒ کا کلام گاتے وقت تلفظ کا خاص خیال رکھتے ہوئے انہوں نے ثابت کیا کہ وہ اردو اور فارسی کو سمجھتے ہیں۔

یہاں یہ ذکر بے محل نہیں کہ نصرت فتح علی خان نے بھارتی فلموں کا میوزک بھی دیا اور بھارت میں لاتعداد ایوارڈ جیتے۔ بھارت میں جا کر میوزک دینا ان کی مجبوری تھا کیونکہ بھارتی موسیقار انو ملک اور ندیم شیرون کے ساتھ ساتھ کئی دوسرے بھی ان کی دھنوں کو دھڑا دھڑ چوری کر رہے تھے اور خود ہی کریڈٹ لے رہے تھے سو نصرت فتح علی خان نے بھارت جا کر اس سلسلے کو کسی حد تک ختم کر دیا جبکہ ان کا بڑا پن یہاں سے عیاں ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی بھی بھارتی موسیقار کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی نہ کی۔

بھارت میں جاوید اختر ان کے خاص چاہنے والوں میں سے تھے جاوید نے بھی ان سے بھارت سکونت اختیار کرنے کے لیے کہا لیکن نصرت کا دل تو پاکستان میں تھا چنانچہ انکار کر دیا۔ بھارتی صف اول کے موسیقار اے آر رحمٰن بھی نصرت کے پرستاروں میں سے ایک تھے ان کا کہنا ہے "میں نے نصرت سے بہت کچھ سیکھا وہ عظیم تھے" نصرت فتح علی خان نے ثابت کیا کہ پاکستان میں رہتے ہوئے بھی بھارت کو اسی طرح ثقافتی مات دی جا سکتی ہے جس طرح آج ہم ان سے شکست کھائے ہوئے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ نصرت فتح علی خان جیسے گلوکار صدیوں میں جنم لیتے ہیں۔ موسیقی کے شعبے میں عالمی سطح پر ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

# پرائیڈ آف پرفارمنس کلاسیکل گلوکار
# اور ایوارڈ یافتہ انجینئر ڈاکٹر امجد پرویز

ڈاکٹر امجد پرویز 1954ء میں ریڈیو پاکستان سے بچوں کے پروگرام میں بحیثیت گلوکار متعارف ہوئے۔ انہوں نے گزشتہ پچاس سال کے عرصہ میں پاکستان کی موسیقی اور سرسنگیت کو سنوارنے اور اس کے ارتقا کے لئے بڑی دلجمعی کے ساتھ اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔ موسیقی کے ساتھ رفاقت کی اس طویل مدت میں وہ ریڈیو، ٹیلیویژن اور سٹیج کے ساتھ بھی منسلک رہے۔ انہوں نے نہ صرف نئی اور پرانی دھنوں میں نغمے' گیت' غزل اور نظمیں گا کر بلکہ کلاسیکی موسیقی میں "خیال" صنف میں کئی راگ گا کر داد تحسین حاصل کیا۔ ڈاکٹر امجد پرویز گزشتہ پچیس سال سے ریڈیو اور ٹی وی کی "آؤٹ سٹینڈنگ کیٹیگری" میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر امجد پرویز کا مزاج بڑا تخلیقی ہے۔ انہوں نے گائیکی کے میدان میں متعدد تجربے کیے جہاں انہوں نے مغربی سازوں اور مشرقی دھنوں کے امتزاج سے پی ٹی وی کے پروگرام "سنگت" میں 1972ء سے 1974ء تک "فیوژن" کا آئیڈیا کامیابی سے متعارف کروایا جسے بعد میں استاد نصرت فتح علی خان سمیت کئی اور نامور گلوکاروں نے اپنایا' وہاں پنجابی لوک موسیقی' گیت' غزل' عارفانہ کلام اور کلام اقبال کی ادائیگی کے بحر وخارسے ان کی شناوری خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انہوں نے اپنی میٹھی' شفاف' سریلی' مدھر اور خداداد آواز کو مزید ریاضت اور شام چوراسی گھرانے کے اساتذہ' نزاکت علی خاں' سلامت علی خان اور موسیقار میاں شہر یار سے تعلیم حاصل کر کے' پروفیشنل (میراثی) اور نان پروفیشنل (عطائی) طبقوں میں حائل خلیج کو کم کرنے میں جو معاونت کی ہے' وہ آنے والی نسل کے لئے ایک مثال بن چکی ہے۔ ان کی آواز باجے کی تینوں سپتکوں کو باسانی چھوتی ہوئی' ان کی گائی ہوئی نظم "جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے" کے ذریعے اپنی آواز کے پھیلاؤ کا زندہ ثبوت ہے۔

ڈاکٹر امجد پرویز کلاسیکی موسیقی اور ہلکی پھلکی موسیقی کو بیک وقت یکساں مہارت سے ادا کرنے کی واحد مثال ہیں۔ ان کو بلاشبہ موسیقی کی دنیا کا "آل راؤنڈر" کہا جاسکتا ہے آپ نے پاکستان کے تمام مشہور موسیقاروں سمیت معروف موسیقار خیام کی دھنیں بھی گائی ہیں۔ ڈاکٹر امجد پرویز نے کلام میر' غالب' اور فیض کو تین مختلف البموں میں ریکارڈ کروانے کے علاوہ اپنی آواز میں بی بی سی اور اندرون و بیرون ملک کمپنیوں کے لئے کئی اور البم اور سی ڈی تیار کی ہیں۔ ان میں بیرون ملک قیام پذیر شعراء کا بھی کلام شامل ہے۔ اس طرح ڈاکٹر امجد پرویز نے ان متعدد شخصیات کے معیاری کلام کو نہ صرف پاکستان میں متعارف کروایا بلکہ ان کے کلام کو مزید شہرت بخشی۔ اپنی اس کاوش کے ذریعے اور پی ٹی وی پروگرام "دیس پردیس" کی تحریر و تحقیق اور کمپیئرنگ کی ذمہ داری نبھا کر انہوں نے بیرون ملک پاکستانیوں کی اپنے ہم وطنوں کے ساتھ قربت و محبت میں اضافے کا کام بھی کر دکھایا ہے۔ اسی طرح انہوں نے مسلم امہ کی موسیقی، کلچر اور رہن سہن پر تحریر و تحقیق کر کے پی ٹی وی کے پروگرام "صدائے دوست" میں پاکستان کی مسلم امہ کے ساتھ دوستی کے رشتے مزید مضبوط کرنے میں ایک سنگ میل کا کردار ادا کیا ہے۔ ان کو بلاشبہ پاکستان کا "ثقافتی سفیر" قرار دیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر امجد پرویز نے متعدد ملی نغمے گا کر ایک محب وطن مسلمان پاکستانی ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بیشتر دوست ممالک

میں قیام پذیر سفیران اور دیگر ثقافتی اداروں کی دعوتوں پر قومی دنوں کے مواقع پر وہ اپنے ملک کی نمائندگی کرتے رہتے ہیں۔ کشمیری مجاہدین کی جدوجہد پر پی ٹی وی ڈرامہ سیریل "وفا" میں ان کا گایا ہوا نغمہ "یہ پہاڑ یہ اداس وادیاں" قابل ذکر ہے۔ انہوں نے اپنے بیرون ملک دوروں پر مبنی سفرنامے، موسیقی سے منسلک مشہور شخصیات اور موسیقی کے میدان میں مختلف معاملات پر ملکی اور غیر ملکی اخبارات، مجلوں اور رسائل میں انگریزی اور اردو زبان میں سینکڑوں مضامین بھی لکھے ہیں۔

ڈاکٹر امجد پرویز نے انگلستان سے مکینیکل انجینئرنگ میں ڈاکٹریٹ اور ماسٹرز کی ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ نو سال بحیثیت پروفیسر انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں درس وتدریس کے بعد انجینئرنگ کے معیاری مشاورتی ادارے نیسپاک میں مینجنگ ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز رہ کر حال ہی میں ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔ انہوں نے 1976ء میں صدر پاکستان سے انجینئرنگ کے شعبہ میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ آپ موسیقی میں بھی گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ ڈاکٹر امجد پرویز کا تعلق پاکستان کے اس تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے جنہوں نے تحریک پاکستان کے دوران اور قیام پاکستان کے بعد انجمن حمایت اسلام اور اسلامیہ کالج لاہور کے جھنڈے تلے لاکھوں مسلمانوں کو نظریہ پاکستان کی روح پیغام سے آگاہ کیا اور سائنس کے مضامین کی تعلیم دی تاکہ مسلمان بھی دنیا کی مہذب اور ترقی یافتہ قوموں کے شانہ بشانہ کھڑے ہو سکیں۔ آپ کے والد پروفیسر شیخ عبدالکریم، کیمیاء اور نانا خواجہ دل محمد، ریاضی کے ماہر اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ کے نانا اردو کے مشہور شاعر بھی تھے۔

ڈاکٹر امجد پرویز کا شمار ملک کے ان چند گنے چنے پڑھے لکھے گائیکوں میں ہوتا ہے جنہوں نے موسیقی کو کسی معاشی دباؤ کے تحت اختیار نہیں کیا بلکہ یہ ان کی اپنی خواہش اور لگن ہے جس کے پیچھے ان کا تخلیقی ذہن، مزاج اور جنون کارفرما ہے۔

خواجہ دل محمد، جن کے نام پر لاہور کی ایک سڑک کا نام دل محمد روڈ رکھا گیا وہ ڈاکٹر امجد پرویز کے نانا ہیں۔ شاعری سے بھی انہیں خاصا شغف تھا۔ یوں تعلیم اور شاعری کی اگلی صنف موسیقی ڈاکٹر امجد پرویز کو ورثے میں ملی انہوں نے اپنے ورثے سے بھرپور طریقے سے استفادہ بھی کیا۔ 1960ء میں انہوں نے سینٹرل ماڈل سکول لاہور سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پورے پنجاب میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ بعدازاں گورنمنٹ کالج لاہور میں زیر تعلیم رہے۔ 1967ء میں انجینئرنگ یونیورسٹی سے مکینیکل انجینئرنگ کرنے کے بعد وہیں لیکچرر بھرتی ہو گئے پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے حکومت کے سکالرشپ پر برطانیہ چلے گئے۔ 1972ء میں یونیورسٹی آف برمنگھم سے پی ایچ ڈی کی اور 1975ء میں انجینئرنگ کے سب سے بڑے مشاورتی ادارے نیسپاک سے منسلک ہو گئے۔ ان دنوں وہ نیسپاک سے بطور مینجنگ ڈائریکٹر ہونے کے بعد ایک فرم میں بطور کنسلٹنٹ کام کر رہے ہیں

ڈاکٹر امجد پرویز ایک فیملی انٹرویو کیا گیا آیئے دیکھیں کہ وہ اپنی کامیابیوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

سوال: بیگم سے سب سے پہلا "آمنا سامنا" کب اور کہاں ہوا؟

ڈاکٹر امجد: ہماری پہلی ملاقات انہی کے گھر پر ہوئی۔ یہ میری بہن کی ہمسائیگی میں رہتی تھی۔ ہوا یوں کہ میں ان کے گھر بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا یہ کسی کام سے اندر آئیں اور پھر فوراً ہی واپس چلی گئیں۔ پھر بزرگوں کی مرضی سے ہمارا نکاح ہو گیا۔ البتہ نکاح کے بعد ہماری ایک دو مرتبہ ملاقات ہوئی۔ ثمینہ بھابی نے مسکرا کر ڈاکٹر امجد پرویز کی تائید کی لیکن اتنا اضافہ کیا کہ شادی ہماری نہیں ہمارے والدین کی مرضی سے ہوئی۔ ایک تو ان دنوں لڑکے لڑکی سے پوچھنے کا رواج ذرا کم تھا، دوسرے میں پورے وثوق سے کہتی ہوں کہ والدین کا فیصلہ اولاد کے حق میں بہترین ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہمارے بارے میں کیا جانے والا فیصلہ ...... بھابی کی بات دونوں میاں بیوی کی مطمئن مسکراہٹ پر ختم ہوئی۔ جیسے وہ والدین کے اس فیصلے پر بہت مسرور ہیں۔

شادی کی رسومات کے بارے میں سوال کا جواب دیتے ہوئے ثمینہ بھابی بولیں کہ ہماری شادی میں محدود حد تک وہ تمام رسمیں ادا ہوئی تھیں جو رائج ہیں۔ ثمینہ بھابی کی بات کا اعادہ کرتے ہوئے ڈاکٹر امجد پرویز بولے ہماری شادی میں رسمیں تو

بھی ادا کی گئیں لیکن میانہ روی سے' فضول خرچی بالکل نہ کی گئی۔ قریبی عزیزوں اور دوستوں نے بھی شرکت کی۔ منہ دکھائی میں دیئے گئے تحفے کی بابت سوال کرنے پر ڈاکٹر امجد پرویز بولے میں نے انہیں منہ دکھائی میں سونے کا ہار دیا تھا۔ ثمینہ بھائی نے اس امر کی تصدیق بڑے خوبصورت انداز میں یوں کی کہ ''میں اب بھی وہ ہار اکثر پہنتی ہوں۔''

سوال: ایک دوسرے کی کونسی عادت بری لگتی ہے؟

ثمینہ بھابی: بڑی برجستگی سے بولیں مجھے تو ان کی کوئی عادت بری نہیں لگتی۔ البتہ شروع میں...... (قدرے توقف سے) جب یہ بہت زیادہ مصروف ہوتے تھے تو مجھے ضرور برا لگتا تھا لیکن بعد میں ان کی مجبوری کو سمجھنے لگی۔ یہی سوال ڈاکٹر امجد پرویز سے کیا گیا تو بولے ویسے تو ان کی بھی کوئی عادت مجھے بری نہیں لگتی البتہ کبھی کبھی ان کی فضول خرچی کی عادت بری لگتی ہے۔ جس پر میں سمجھاتا بھی ہوں لیکن اب ایسا نہیں' یہ شروع کی بات ہے۔ اب ہم اپنے ذرائع میں رہتے ہیں ویسے اللہ عزوجل نے ہمیں اتنا کچھ عطا کیا ہے کہ ہم اپنے اخراجات بڑے آرام سے پورے کر لیتے ہیں۔

ایک دوسرے کی کونسی عادت اچھی لگتی ہے؟ کے سوال کے جواب میں ڈاکٹر امجد پرویز بولے، یہ بڑی ملنسار ہیں اور اپنے سسرال میں انہوں نے جس طرح محبت کی خوشبو پھیلائی ان کی اس عادت نے مجھے گرویدہ بنا لیا۔ میری والدہ جن کا دو تین برس قبل انتقال ہو چکا ہے، ان سے اتنی محبت کرتی تھیں کہ انہیں اپنی بیٹی سمجھتی تھیں۔ اس کے علاوہ میرے اساتذہ جب بھی آتے ہیں یہ ان کے کھانے پینے کا بڑا خیال رکھتی ہیں اور انہوں نے یہ امور سرانجام دیتے ہوئے کبھی بھی جبیں پر شکن نہیں ڈالی۔ علاوہ ازیں میرے دوست بہت زیادہ ہیں اور وہ جب بھی آتے ہیں یہ بڑی خوش دلی سے انہیں خوش آمدید کہتی ہیں۔

ڈاکٹر امجد پرویز نے اپنی بات مکمل کی تو یہی سوال ثمینہ بھابی سے کیا گیا جس کے جواب میں وہ بولیں ان کی عادت مجھے سب سے زیادہ پسند یہ ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کام میں روک ٹوک نہیں کی جیسی بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ یہ کیا کیا، کیوں کیا۔ یہ کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں، ویسے کیوں نہیں پہنے۔

جھگڑا کس بات پر ہوتا ہے؟ سوال کے جواب میں ڈاکٹر امجد پرویز نے کہا جھگڑا تو نہیں ہوتا البتہ بعض معاملات میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے۔ لیکن یہ اختلاف رائے ہی ہوتا ہے جو کبھی بھی لڑائی کا روپ نہیں دھارتا۔ ثمینہ بھابی نے اس سوال کا جواب یوں دیا کہ اختلاف رائے کہیں جانے یا نہ جانے پر ہوتا ہے لیکن اب تو ایک عرصہ سے ہم نے ایک دوسرے کی سوچ کو سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ لہٰذا اب اختلاف رائے کی نوبت بھی کم ہی آتی ہے۔ لڑائی ہونے کی صورت میں پہلے کون مناتا ہے؟ کے ضمنی سوال کا بڑی برجستگی سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ پہلے میں مناتا ہوں۔ یوں بھی یہ اختلاف رائے 15 یا 20 منٹ سے زیادہ نہیں رہتا۔ ثمینہ بھابی نے جواب دیا کہ ویسے بھی گھر میں ہم دو ہی رہ گئے ہیں اور اگر اب بھی آپس میں لڑ پڑیں تو کریں کیا۔

کیا ڈاکٹر صاحب شوق سے سسرال جاتے ہیں یا ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں؟ ہمارے سوال کے جواب میں ثمینہ بھابی بولیں ''شوق سے بھی کوئی بندہ کبھی سسرال جاتا ہے؟'' پھر انہوں نے ازراہ مذاق کی جانے والی بات پر قہقہہ لگایا اور بولیں ''ان کی اچھی عادتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے سسرال جانے میں کبھی بھی ناں نہیں کی۔ ڈاکٹر امجد نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ پہلے تو نہیں لیکن اب ایسے لگتا ہے جیسے میں اپنے ہی گھر جا رہا ہوں۔

ڈاکٹر امجد پرویز سے اگلا سوال یہ کیا گیا کہ آپ عموماً دفتری امور کے سلسلے میں بیرون ملک جاتے ہیں تو کبھی کوئی ایسا موقع آیا یا کوئی ایسا مقام دیکھا جہاں بھابی کو بہت مس کیا ہو۔ ڈاکٹر امجد کے جواب دینے سے قبل ہی ثمینہ امجد بولیں کہ یہ تو جب

بھی باہر جاتے ہیں' میں انہیں بہت مس کرتی ہوں۔ پھر ڈاکٹر امجد پرویز بولے میں جہاں بھی جاتا ہوں انہیں یاد کرتا ہوں لیکن ایسا صرف دفتری امور کے لئے بیرون ملک کے دورے کے دوران ہوتا ہے کیونکہ جب بھی سیر و سیاحت کے لئے کہیں باہر جانا ہوا ہم لوگ اکٹھے ہی جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں ہم برطانیہ اور امریکہ گئے تھے۔ ویسے ہمیں گھومنے پھرنے کا بھی بہت شوق ہے۔ ترکی میں ہر سال جاتا ہوں۔ نئے نئے مقامات دیکھنے کا ہم دونوں کو شوق ہے۔ ہم نے ترکی میں زیر زمین شہر تپادوکیا بھی اکٹھے دیکھا اور تیکساس کی غاریں بھی۔ بیرون ملک جائیں تو بھابی کے لیے کیا لاتے ہیں؟ ڈاکٹر امجد پرویز بولے کیونکہ سونا عورت کی کمزوری ہوتا ہے لہٰذا میں جب بھی باہر جاتا ہوں ان کے لئے سونے کے زیورات وغیرہ ہی لاتا ہوں۔ ثمینہ بھائی نے ڈاکٹر امجد پرویز کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ سونے کی تخصیص نہیں یہ کچھ بھی لائیں میرے لیے قیمتی ترین تحفہ ہوتا ہے۔

آپ دونوں میں زیادہ فری کون ہے؟ ڈاکٹر امجد پرویز نے ثمینہ بھابی کی طرف صرف اشارہ کر کے اور مسکرا دیا۔ جس پر ثمینہ امجد بھی مسکرا دیں۔ اسی سوال سے ملتا جلتا سوال "تو کیا آپ ان کی ضد مان لیتے ہیں؟" کیا گیا تو ڈاکٹر امجد پرویز کے جواب پر دونوں کھلکھلائے۔ انہوں نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ "مجبوری ہے۔"

ڈاکٹر امجد پرویز اور ان کی اہلیہ ثمینہ امجد سے اگلا جو سوال کیا گیا یہ تھا کہ "اگر آپ دونوں کار میں کہیں جا رہے ہوں اور بھابی کہیں کہ گاڑی روکیں مجھے فلاں چیز خریدنا ہے تو کیا آپ گاڑی روک لیں گے اور انہیں ان کی مطلوبہ چیز خرید دیں گے یا گاڑی آگے بڑھا لے جائیں گے؟" میں گاڑی روک لوں گا۔ ڈاکٹر امجد پرویز نے دوٹوک قسم کے لہجے میں جواب دیا تو ثمینہ بھابی بولیں میں ایسی کوئی خواہش نہیں کروں گی۔ ویسے بھی گھر کی زیادہ تر شاپنگ میں خود ہی کرتی ہوں۔ آپ دونوں بیک وقت بولے اب تو ہم دونوں ہی نہیں رہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب بولے اللہ پاک نے ہمیں اتنا کچھ عطا کیا ہے ہم اس کا شکر ادا نہیں کر سکتے۔ پھر بھی ہم فضول خرچ نہیں۔ اور نہ ہی لالچی ہیں۔

مجھے بیرون ملک شہرت حاصل کرنے اور بھاری بھرکم تنخواہ پر ملازمت کرنے کے سینکڑوں مواقع ملے لیکن میں نے ہر چیز پر پاکستان میں رہنے کو ترجیح دی۔ یہ گھر مجھے میرے والدین نے دیا۔ نیس پاک NES PAK جو ایشیا کا انجینئرنگ کے حوالے سے سب سے بڑا مشاورتی ادارہ ہے' میں اس ادارے کے مینجنگ ڈائریکٹر کے عہدے پر کام کر چکا ہوں اور کیا چاہئے۔

"کبھی ذہن میں یہ خیال آیا کہ کاش آپ کی ایک دوسرے سے شادی نہ ہوئی ہوتی؟" کے اس پر ثمینہ بھابی بولیں میرے ذہن میں تو ایسا خیال کبھی نہیں آیا ڈاکٹر امجد پرویز بولے ایسا واقعی کبھی ذہن میں نہیں آیا۔ بلکہ ہم نے تو اپنی بچیوں کی شادیاں بھی بزرگوں کی مرضی سے کی ہیں۔ میری والدہ اس وقت حیات تھیں۔ "اگر ڈاکٹر صاحب دوسری شادی کی اجازت طلب کریں تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟" جواب میں ثمینہ بھابی مسکراتے ہوئے بولیں اول تو میں اجازت دوں گی نہیں اور اگر یہ کریں گے تو پھر میرے گھر میں نہیں رہیں گے۔ بات ختم ہونے پر وہ ایک مرتبہ پھر مسکرا دیں۔ ڈاکٹر امجد پرویز بولے کہ ایسی سوچ یا ایسا موقع ویسے کبھی آیا نہیں۔ سوچ آتی تو یہ تب کی بات ہے ویسے اب کہاں۔ اب ہم نانا نانی تو بن ہی گئے ہیں۔ اب ایسی سوچ کہاں آئے گی۔" ویسے جب آپ کی شادی ہوئی اس وقت ڈاکٹر صاحب کے لئے لڑکیوں کے فون تو آتے ہوں گے' کیا دل میں کبھی کوئی شک پیدا ہوا؟ ثمینہ بھابی نے بڑے اطمینان آمیز تیقن سے جواب دیا امجد کے بارے میں میرے دل میں کبھی کسی بھی قسم کا کوئی شک پیدا نہیں ہوا۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر امجد پرویز بولے اللہ کا شکر ہے جتنا ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد ہے میں نے ایسا اعتماد کسی میں کم ہی دیکھا ہے۔ دعا گو ضرور ہوں کہ لوگوں کو ایسا ہی اعتماد حاصل ہو جیسا ہمیں ایک دوسرے پر ہے۔

# اے نیّر

تنہائیوں میں ڈھل جائیں گے میرے دن رات توں کیا جانے" جیسے سپر ہٹ گانے گانے والی سریلی آواز کے مالک اے نیّر نے کہا ہے کہ آج کل تمام نئے لڑکے اچھا گا رہے ہیں لیکن ایک بات ہے کہ ایک دوسرے سے پوچھ لینے میں کوئی حرج نہیں پڑتا۔ اس سے عزت بڑھتی ہے کم نہیں ہوتی۔ اے نیّر نے بتایا کہ میں ایک کرسچین اور دیہاتی آدمی ہوں۔ ساہیوال کے ایک گاؤں میں میری پیدائش ہوئی میرے والد سرکاری ملازم تھے اور ان کی تبدیلی ادھر ادھر ہوتی رہتی تھی۔ میرے نانا ساہیوال میں ہی تھے۔ والد صاحب کی جب تبدیلی ہوتی تھی تو میرے سے بڑے ادھر ادھر ہو جاتے تھے چونکہ میں سب سے چھوٹا ہوں ہم تین بھائی ہیں۔ سب سے بڑی بہن ہے۔ میرے والد اس وقت بھی خاندانی منصوبہ بندی کے بڑے قائل تھے۔ ساہیوال سے ہم عارف والا آ گئے وہاں سے میں نے پرائمری کی۔ عارف والا ایسی جگہ ہے جہاں صدر ایوب خان کے دور میں ہمارے ایک ایسے ٹیچر تھے جنہوں نے اسلام آباد کا نام رکھا تھا۔ مجھے یاد ہے ان کو اسلام آباد کا نام رکھنے پر ایک ہزار روپیہ انعام بھی دیا گیا تھا۔ جب میں پرائمری میں تھا تو مجھے قومی ترانہ آتا تھا اور کسی کو آتا نہیں تھا نہ ریڈیو گھر میں تھا اور نہ ہی کچھ اور تھا صرف ایک سینما قریب تھا وہاں سے سنتا تھا یادداشت بہت اچھی تھی۔ پہلی پرفارمنس بزم ادب کے حوالے سے قومی ترانہ گا کر کی تھی۔ میں قومی ترانہ گا رہا ہوں سارے لوگ کھڑے ہو گئے اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ سارے میرے احترام میں کھڑے ہیں۔ میں اس وقت اتنا بڑا آرٹسٹ بن گیا کہ خوامخواہ اس وقت ذہن میں آیا کہ سب لوگ کھڑے ہی رہیں، اس سے اچھی کیا بات ہے۔ وہ خیر بعد میں پتہ چلا کہ کیوں کھڑے ہیں۔ عارف والا میں پرائمری کی چوتھی جماعت میں تھا کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا پھر ہم لاہور آ گئے۔ آبائی شہر لاہور ہی ہے اور آبائی گھر بھی لاہور ہی میں تھا اور ابھی تک اس آبائی گھر میں ہوں، اپنے بہن بھائی کے ساتھ خوش ہوں جس وقت والد صاحب کا انتقال ہوا اس وقت سے شاید میں نے دکھ برداشت کرنے سیکھ لیے تھے۔ مجھے کوئی دکھ بڑا نہیں لگا۔ اب بھی میں کافی سارے مسائل سے گزر رہا ہوں لیکن برداشت اللہ تعالیٰ نے بہت دی ہے۔ میں مسائل کو بہت نارمل لیتا ہوں۔ میں امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا جو امید خدا نے دی ہے۔ وہ ہر صورت زندہ رہنی چاہیے۔ مایوس نہیں ہونا چاہیے شاید بچپن میں مجھے والد صاحب کا دکھ نہ ملتا آگے آ کر میرے لیے پرابلم ہو جاتے جیسے میرے دوست وحید مراد کے ساتھ ہوا۔ ان کے ساتھ اچانک ایسا ہوا جیسے میرے ساتھ ہوا وہ برداشت نہیں کر پائے اور میں سوچتا ہوں کہ مجھے بچپن سے دکھ نہ ملتے تو شاید جو بعد کے آنے والے دکھ تھے وہ میں شاید برداشت نہ کر سکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے میری ماں بلوچ تھی وہ بڑی سخت عورت تھی، انہوں نے باپ کا کام بھی کیا اور ماں کا بھی کیا۔ 1997ء میں ان کا انتقال ہوا۔ انہوں نے کبھی محسوس نہیں ہونے دیا کیونکہ وہ ایک بڑے باپ کی بیٹی تھیں۔ انہوں نے ہماری ہمت بڑھائی رکھی۔ ان سے مار بھی بڑی کھائی لیکن انہوں نے محبت بھی بڑی دی مجھے جو فلم ٹی وی میں گانے کا شوق تھا وہ میں بڑا چھپ چھپ کر پورا کرتا تھا لیکن مار سے بہت ڈرتا تھا کہ کہیں امی کو پتہ نہ چل جائے۔ امی کا کہنا تھا کہ تم نے پڑھنا ضرور ہے میٹرک سینٹ فرانسیس ہائی سکول انارکلی سے کیا۔ ایف سی کالج سے گریجوایشن کیا۔ بی ایڈ کیا اس کے بعد میں فلم اور ٹی وی پر آ گیا۔ جب میں آ گیا تو پھر امی نے کچھ نہیں کہا صرف میری شادی کر دی۔ سینٹ فرانسس ہائی اسکول کے ایک پروگرام میں محمد رفیع کا ایک مشہور گانا (فلم بیجو باورا کا تھا) گایا۔ لوگوں نے اس گانے کو نہایت تحمل سے سن لیا میں بڑا حیران تھا۔ جب میں کالج میں گیا تو وہاں احمد رشدی، مہدی حسن، مسعود رانا اور مجیب عالم کے گانے گائے۔ کالج میں میرے ٹیچرز بہت اچھے تھے۔ میرے ساتھ جو اسٹوڈنٹ پڑھتے تھے وہ بھی

بڑے اچھے تھے۔انہوں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔آپ یقین کریں کہ میں پانچویں تک اپنی کلاس میں ٹاپ کرتا رہا۔چھٹی سے دسویں تک بہت مشکل وقت گزارا میں نے پتہ نہیں میٹرک کیسے کیا۔اگر میرے آگے وہ لڑکا نہ بیٹھا ہوتا جس کا حساب اچھا تھا میں اس کی نقل نہ کرتا تو میں کبھی میٹرک نہیں کرسکتا۔میری نظر تیز تھی میں نے اسے دیکھ کر اپنا پرچہ کیا میں آج ساری دنیا کے سامنے یہ مان رہا ہوں میرا حساب اچھا نہیں ہے بڑی دونوں بیٹیوں کا حساب بڑا اچھا ہے۔دونوں نے ایم بی اے کیا ہے۔جس کی میں نے نقل کی اس لڑکے کے نمبر کم آئے میرے زیادہ آئے۔یہ کیسی ستم ظریفی کی بات ہے۔میرے والد کو میوزک کا شوق تھا میرے سامنے انہوں نے کبھی کچھ نہیں کہا یہ ضرور تھا کہ پہلے بھی میں نے کہا کہ میرے گھر کے پاس ایک سینما گھر تھا میں سینما میں گانے سننے جاتا تھا وہاں سے میں نے میڈم نورجہاں کی فلم انتظار کے گانے سنے پھر طلعت محمود صاحب کو بہت سنا، لتا منگیشکر کے بہت گانے وہاں سے سنے حتیٰ کہ ہمارے جو پرانے سنگرز تھے ان کے گانے اس سینما میں چلتے تھے جن کو میں اکثر سنتا تھا۔ان کو یاد بھی کر لیتا تھا اور میں گاتا بھی تھا بعض اوقات میں ان میں سے کسی گانے کو علامہ اقبالؒ کے کھاتے میں ڈال دیتا تھا۔ٹیچر بہت سخت تھے وہ کہتے یہ کونسا گانا ہے میں کہتا تھا کہ یہ علامہ اقبال کی نظم ہے۔ٹیچر بہت ذہین تھے وہ کہتے یہ علامہ اقبال کا کلام نہیں ہو سکتا میں کہتا پتہ نہیں مجھے کسی نے سنا دیا ہے جو گانا سیکھنا چاہتا ہے وہ سن کر بھی سیکھ لیتا ہاں کلاسیکل میوزک کو سیکھنے کے لیے چھوٹی عمر سے اس کو شروع کرنا پڑتا ہے جیسے اسد امانت علی خان، حامد علی خان گاتے ہیں، ہم عطائی لوگ ہیں ہماری صرف آواز اچھی تھی۔گانے میں اسٹریٹ نوٹ لگانا مہدی حسن صاحب سے سیکھا۔اس میں وہ میرے استاد ہیں۔سارے لوگ مجھے کہتے تم کشور کی کاپی ہو میں نے سارا کچھ مہدی حسن صاحب سے سیکھا ہے۔مجھے مہدی حسن بننے کے لیے 25 سال لگے۔ مہدی حسن بننا بھی کوئی مذاق نہیں ہے۔اس سے زیادہ سال بھی لگ سکتے ہیں۔مہدی حسن مہدی حسن ہی ہیں۔ٹی وی پر مشکل سے آیا پہلے ریڈیو پر گیا۔انہوں نے سنا انہوں نے کہا نکل جاؤ یہاں سے پھر ٹی وی پر گیا۔انہوں نے بھی کہہ دیا نکل جاؤ۔میں اب بھی ٹی وی کا گیٹ عبور کرتا ہوا ڈرتا ہوں کہ کہیں روک نہ لیا جائے۔ان کی مہربانی ہے کہ اب وہ میری عزت کرتے ہیں۔مجھے رفیق وڑائچ نے ایک پروگرام ''نئے فنکار'' میں متعارف کرایا۔رفیق وڑائچ کو میں اب بھی ڈیڈی کہتا ہوں۔گیت میں نے ریکارڈ کروایا میری کمبختی آئی کہ میں نے سارے محلے کو بلایا ہوا تھا کہ میرا گیت چلنا ہے جب گیت چلنے لگا تو لائٹ چلی گئی جب پروگرام ختم ہوا تو لائٹ آ گئی میری ایسی عزت افزائی ہوئی کہ بڑا بور ہوا۔اس وقت میں فرسٹ ایئر میں تھا اور میری عمر 17 سال تھی۔صوفی تبسم کے گیت نالائے صبا تنہا پھول کرہنسی تنہا اس چمن کی دنیا میں ہے۔کلی کلی تنہا میرا ریکارڈ ہٹ ہو گیا۔اب جب وہ گانا ٹی وی پر چلتا ہے تو میرے بچے کہتے ہیں کہ یہ ہمارا باپ نہیں ہے کیونکہ میری ٹنل جیسی شکل تھی اس وقت امجد بوبی کے ساتھ بنا تیرا نام ایم اشرف کے ساتھ ناہید اختر کا ایک گانا تھا ''پیار تجھ بن ہونا تھا'' نثار بزمی کے ساتھ ٹی وی پر میں نے پہلا گانا گایا۔سپنوں سے بھری آنکھیں بڑی یہ ٹی وی کا ہٹ گانا ہوا۔اس طرح دوستوں کے گانے گاتا چلا گیا۔میں دلدار پرویز بھٹی کے غم میں ایک سال اپنے کام کو فراموش کر دیا۔میں یہ بھول گیا کہ میرے ساتھ اور بھی لوگ جڑے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے بہت پیچھے رہ گیا۔دلدار سے 15 سال رفاقت رہی۔وہ بہت اچھا اور سچ بولنے والا انسان تھا۔دوستوں کا دوست تھا۔مجھے کوئی پرابلم ہوتی تو اس کو بتا دیتا تھا۔اس کے جنازے پر بہت سارے لوگ تھے۔لاہور میں اتنا بڑا جنازہ شائد میں نے پہلے نہیں دیکھا۔

# کلاسیکی گلوکار سلمان علوی

غزل کی گائیکی گلوکاری کی مشکل ترین صنف ہے۔ راگ اور سُر کی باریکیوں اور لب و لہجے کے اتار چڑھاؤ کا علم صرف اسے ہوسکتا ہے' جس نے اس دشت کی سیاحی میں عمر گزاری ہو۔ پاکستان میں اعلیٰ پائے کے کلاسیکل گلوکار گزرے ہیں۔ مہدی حسن' اقبال بانو' استاد امانت علی خان' غلام علی' غرض کہ فہرست اتنی طویل ہے کہ شاید ان ناموں کے لیے یہ سطریں کم پڑیں۔ اس میدان میں ایک مستند نام سلمان علوی کا بھی ہے۔ وہ کراچی میں 15 فروری 1956 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد امین الدین علوی معروف ماہر تعلیم تھے۔ سلمان علوی پڑھے لکھے اور باشعور شخص ہیں۔ انہوں نے آئی بی اے (جامعہ کراچی) سے 78ء میں ایم بی اے کیا۔ اٹھارہ برس تک مختلف اداروں میں کام کرتے رہے۔ آج مارکیٹنگ کنسلٹنٹ کی حیثیت سے ذاتی کمپنی چلا رہے ہیں۔ انہوں نے چار برس کی عمر میں محض شوق کی خاطر گلوکاری کے میدان میں قدم رکھا۔ کہتے ہیں' شوق کا کوئی مول نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود ان کی پہلی ترجیح کاروبار ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بعض اوقات کام کے دباؤ کی وجہ سے کئی کئی مہینوں کے لیے موسیقی چھوڑ دیتا ہوں لیکن بہرحال' یہ ایسا شوق ہے جس سے وہ چھٹکارا حاصل کرنا نہیں چاہتے۔☆

سوال: اپنے فنی سفر کے بارے میں قارئین کو کچھ آگاہ کریں؟

سلمان علوی: میں چار برس کی عمر سے ریڈیو پاکستان پر موسیقی کے آلات بجا رہا ہوں۔ میں نے بینجو' آرگن' بانسری' گٹار وغیرہ بجائے ہیں اور آج بھی یہ آلات بجاتا ہوں۔ کالج لائف میں ہمارا ایک بینڈ بھی تھا۔ آپ اسے پاپ بینڈ بھی کہہ سکتی ہیں۔ میں نے پاپ بھی گایا۔ مغربی موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ اردو ادب سے بھی دلچسپی بڑھتی گئی۔ آج بھی ادب پڑھتا ہوں۔ اس کے بغیر کلام سمجھنا ناممکن ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں اردو کو ایک مضمون کی طرح پڑھا۔ میری والدہ اردو کی پروفیسر رہی ہیں' جب کہ میرے والد نے علی گڑھ یونیورسٹی سے فارسی اور حساب میں ماسٹرز کیا تھا۔ میں نے گھر سے بھی تعلیم کے کچھ جراثیم اکٹھے کیے تھے' پھر مجھے خود بھی پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔

سوال: کیا موسیقی کے آلات بجانے کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی؟

سلمان علوی: جی نہیں' چار برس کی عمر میں یہ کام محض شوق کی خاطر شروع کیا۔ بعدازاں فرصت کے لمحات میں ان آلات کو بجاتا تھا۔ دراصل مجھے اس شعبے کو اپنا کیریر نہیں بنانا تھا اور ویسے بھی یہاں ایسے ادارے موجود نہیں' جہاں موسیقی کے آلات بجانے کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہو۔

سوال: یہ بتایئے کہ آپ کی روزمرہ مصروفیات کیا ہیں؟

سلمان علوی: میرے دن کا آغاز افراتفری کے عالم میں ہوتا ہے۔ اٹھنا' نہانا دھونا' تیار ہونا' ناشتا کرنا اور پھر دفتر آجانا۔ نوکری کے الگ تقاضے ہوتے ہیں لیکن جب ذاتی کاروبار ہو تو ذمے داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ ملازمت کے دوران سوچتے تھے کہ جب اپنا کاروبار ہوگا تو خوب مزے آئیں گے۔ کوئی دیر سویر کا پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ مگر اپنے کام کے مسائل بھی اپنے ہوتے ہیں۔ بے شک میں کبھی دیر سے بھی دفتر آجاتا ہوں لیکن رات کو سوتے وقت بھی میرا ذہن یہ سوچ رہا ہوتا ہے کہ ملازمین کی تنخواہیں

دیتی ہیں یا فلاں جگہ سے پے منٹ آنی ہے۔فلاں کا Agreement تیار کر کے دینا ہے وغیرہ۔

سوال: اپنے اہلِ خانہ کے بارے میں کچھ بتایئے؟

سلمان علوی: میں 85ء میں رشتہ ازدواج سے منسلک ہوا۔میری دو بچیاں اور ایک بیوی ہے(مسکراتے ہوئے) بڑی بیٹی اے لیول کر رہی ہے جب کہ چھوٹی نویں جماعت کی طالبہ ہے۔

سوال: اپنے کام اور گھریلو زندگی میں توازن کس طرح برقرار رکھتے ہیں؟

سلمان علوی: میں اپنے گھر والوں کو پورا وقت دیتا ہوں اور میرے خیال میں گھر کے سربراہ کو اپنے اہلِ خانہ کو پورا وقت دینا بھی چاہیے۔ الحمدللہ میری اہلیہ بہت تعاون کرتی ہیں۔ ہم دونوں میں خاصی ذہنی ہم آہنگی ہے۔ بچوں کے ساتھ میری بہت Interaction ہوتی ہے۔ان کے اسکول میں ہونے والی Parents teacher میٹنگ میں شریک ہوتا ہوں۔

سوال: یعنی بچوں کی پڑھائی کے معاملے میں آپ خاصے سخت ہیں؟

سلمان علوی: سخت نہیں ہوں (انہوں نے لفظ سخت پر زور دیتے ہوئے کہا) کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ سختی کرنے سے پڑھائی نہیں ہوتی۔ اگر آپ بچے کو چار گھنٹے کمرے میں یہ کہہ کر بند کر دیں کہ تمہیں صرف پڑھنا ہے تو جب تک اس کا پڑھائی میں دل نہیں لگے گا وہ نہیں پڑھے گا۔بچوں پر نظر ضرور رکھنی چاہیے اور انہیں کوالٹی ٹائم دینا چاہیے۔چاہے وہ ایک گھنٹہ ہی کیوں نہ ہو۔پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ بچے سمجھدار ہو جاتے ہیں۔مثلاً اب مجھے اپنی بڑی بیٹی کو نہیں دیکھنا پڑتا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔اسے پتا ہے کہ اسے کیا پڑھنا ہے۔کب پڑھنا ہے۔دوسری بات یہ کہ ہمیں اپنے بچوں کا دوسرے بچوں سے مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔ اکثر والدین بچوں کو پڑھائی کی طرف مائل کرنے کے لیے یہ حربہ استعمال کرتے ہیں کہ دیکھو فلاں بچے کے کتنے اچھے نمبر آئے۔تمہارا فلاں کزن تم سے کتنا آگے ہے۔میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ہر بچہ انفرادی طور پر جداگانہ صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے۔ جیسے میری بڑی بیٹی بہت اچھا لکھتی ہے۔ انگریزی میں شاعری کرتی ہے۔ اس نے بین الاقوامی سطح پر انعامات بھی جیتے ہیں۔اسے کتابوں سے اتنا لگاؤ ہے کہ اکثر شادی بیاہ کی تقریبات میں بھی اس کے ہاتھ میں کتاب ہوتی ہے جب کہ چھوٹی بیٹی کو لکھنے لکھانے سے دلچسپی نہیں ہے لیکن وہ بے حد ذہین ہے۔بہت اچھی آرٹسٹ ہے۔اداکاری اور نقلیں اتارنے میں بہت آگے ہے۔میں نے کبھی دونوں بہنوں کا بھی موازنہ نہیں کیا۔اگر میں چھوٹی بیٹی سے یہ کہوں کہ تم کتاب پڑھ کر مجھے سناؤ تو وہ زبردستی کتاب پڑھ تو لے گی لیکن شوق سے نہیں پڑھے گی۔

سوال: آپ میں غصے کو قابو کرنے کی صلاحیت ہے؟

سلمان علوی: جی ہاں بالکل!میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص کو غصہ آتا ہے۔مجھے بھی آتا ہے لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہیں آتا ہے تو ایک ہی دفعہ آتا ہے۔اس کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ گھر والوں اور دفتر میں کام کرنے والے ساتھیوں نے مجھے کبھی بھی آؤٹ آف کنٹرول نہیں دیکھا ہوگا۔میں بہت ٹھنڈا مزاج اور پریکٹیکل انسان ہوں۔

سوال: مشکلات اور پریشانیاں کس سے شیئر کرتے ہیں؟

سلمان علوی: یہ تو پریشانی کی سطح اور نوعیت پر منحصر ہے۔بھئی دیکھیں شیئرنگ کے کئی انداز ہیں۔بعض دفعہ آپ اپنا بوجھ کم کرنے کے لیے شیئر کرتے ہیں۔اللہ کا شکر ہے مجھے یہ مسئلہ نہیں ہے۔بعض دفعہ انسان صلاح مشورے کے لیے شیئر کرتا ہے۔جی ہاں میں صلاح مشورے کے لیے بالکل شیئر کرتا ہوں لیکن یہ ضرور دیکھتا ہوں کہ مجھے کس سے مشورہ لینا چاہیے۔اگر آپ نے کسی

ایسے بندے سے مشورہ لے لیا جو آپ سے زیادہ پریشان ہو رہا ہے' تو پھر لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ جتنے لوگوں سے شیئر کرتے ہیں' اتنی باتیں سننی پڑتی ہیں اور آپ کنفیوز ہو جاتے ہیں۔ اس لیے گھریلو مسائل کے لیے میں اپنی اہلیہ سے بات کرتا ہوں۔ ہم دلائل کے ذریعے ایک دوسرے کو سمجھاتے ہیں' جب کہ میں کاروباری معاملات ان سے شیئر نہیں کرتا' کیوں کہ اپنے کاروبار کو میں زیادہ جانتا ہوں۔ باہر کا آدمی مجھے صحیح مشورہ نہیں دے سکتا۔ کہتے ہیں ناں کہ جُوتا کہاں کاٹ رہا ہے' یہ جُوتا پہننے والا بہتر جانتا ہے۔

سوال: اردو کے علاوہ کس زبان کی موسیقی سنتے ہیں؟

سلمان علوی: میرے پاس انگریزی پاپ گانوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو میرے پاس فلمی گانے بھی ملیں گے۔ کلاسیکل گانے بھی ملیں گے۔ اسپینش موسیقی بھی ملے گی۔ دیکھیں' موسیقی یونیورسل لینگویج ہے۔ بعض اوقات الفاظ سمجھ میں نہیں آتے لیکن موسیقی دل و دماغ میں اترتی محسوس ہوتی ہے۔ مجھے اسپینش موسیقی کا ایک لفظ سمجھ نہیں آتا لیکن یہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ اس میں عربی اور ترکش موسیقی کی طرح بہت ردھم ہے۔ بعض اوقات اوپیرا کی گلوکاراؤں کی چیخ و پکار عجیب لگتی ہے' لیکن میں آنکھیں بند کر کے یہ سنتا ہوں کہ آرکسٹرا کیسا بج رہا ہے۔ راگ کا شعبہ کیسا ہے۔ ان چیزوں کو ہماری موسیقی میں کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔

سوال: یہ بتایئے کہ آپ رجائیت پسند ہیں یا قنوطیت پسند؟

سلمان علوی: میں رجائیت پسند ہوں' ہر چیز کا اچھا پہلو دیکھتا ہوں۔ پاکستانی اشیاء دیکھ کر ناک بھوں چڑھانا ہماری عادت بن چکی ہے۔ ہم پاکستانی کپڑا دیکھ کر کہتے ہیں کہ ارے یہ تو پاکستانی ہے۔ حالاں کہ ہماری کاٹن پروڈکٹ کو دنیا مانتی ہے۔ ہم ہی نہیں مانتے۔ ہماری زرعی اجناس اور چمڑا بہترین ہے۔ آپ پاکستان کی سینیٹری ویئر کا کسی بھی ملک سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح موسیقی کی دنیا میں بھی آپ اپنے ملک کا کسی بھی ملک سے موازنہ کر سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارا میڈیا چھوٹا آبادی کم ہے۔ ہم اکثر بھارت کی موسیقی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ وہاں ایک مہینے میں دو سو گانے آتے ہیں۔ ان میں سے لوگوں کو چار پسند آ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں دس گانے آتے ہیں۔ اگر دس میں سے ایک بھی پسند آ جائے تو تناسب برا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھارت کی فلم انڈسٹری بہت بڑی ہے۔ وہ جتنا اپنی انڈسٹری پر خرچ کرتے ہیں' میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم اس کا سواں حصّہ بھی خرچ نہیں کرتے۔ وہاں کا میوزک ڈائریکٹر پچاس لاکھ سے ایک کروڑ روپے معاوضہ لیتا ہے' جب کہ ہمارے ہاں اس سرمایے میں دو فلمیں بنتی ہیں۔ وہاں بیس سے پچیس لاکھ میں گانے کی وڈیو بنتی ہے' جب کہ ہمارے ہاں بچے ایک لاکھ یا ستر ہزار میں وڈیو بناتے ہیں۔ ان کے اپنے وسائل ہیں۔ ہمارے اپنے ہیں۔ اس کے باوجود میں کہوں گا کہ غزل کے شعبے میں پاکستان کا کوئی مقابلہ نہیں۔ آپ کو دنیا میں کہیں دوسرا مہدی حسن نہیں ملے گا۔ اقبال بانو دوسری نہیں ملیں گی۔ فریدہ خانم' غلام علی کی ٹکر کا دوسرا گلوکار نہیں ملے گا۔ جیسا کلام ہمارے ہاں گایا گیا' کہیں اور نہیں گایا گیا۔ آج کل غزلوں کا کلام اوسط درجے کا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے ہاں اردو سمجھتا کون ہے۔ غزل کے نام پر وہ شاعری بکتی ہے' جو غزل ہوتی ہی نہیں ہے۔ ردیف قافیہ ملاتا تو غزل کا نام نہیں۔

سوال: حالاتِ حاضرہ سے دلچسپی ہے؟

سلمان علوی: جی ہاں ہے' اخبار پڑھتا ہوں لیکن میں سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ اس لیے سیاست کی گہرائی میں نہیں جاتا۔ حالات کا علم ہوتا

ہے لیکن تجزیے اور تبصرے کا میرے پاس وقت نہیں ہے۔

سوال: سلمان صاحب' اپنے بچپن کے بارے میں کچھ بتایئے کہ کیسا گزرا؟

سلمان علوی: ہر بچے کا بچپن کا دور بہت اچھا گزرتا ہے۔ آپ کسی ایسے بچے سے ملیں' جس کا بچپن محرومیوں سے عبارت ہو۔ وہ بھی اس دور کو بُرا نہیں کہے گا۔ آپ ایسے بچے سے پوچھ لیں جو سونے کا نوالہ لے کر پیدا ہوا' وہ بھی کہے گا کہ بچپن کا دور بہت اچھا تھا۔ یہ تو بڑے ہونے کے بعد پتا چلتا ہے کہ اُس دور میں ہم نے کیا مس کیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرے ساتھ بہت مہربانی کی۔ کبھی کسی قسم کی کمتری کا احساس نہیں ہوا۔ میں اسکول اور کالج لائف کی غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیتا تھا۔ کھیلوں میں آگے ہوتا تھا۔ میں نے اسکول' کالج اور یونیورسٹی کی نمائندگی بھی کی۔ اللہ کا شکر ہے کہ پڑھائی میں بھی میری پوزیشن ہمیشہ فرسٹ کلاس رہی۔

❁❁❁

## پر اسرار خزانہ

پُراسرار خزانہ...... کہانی ہے ایک حیرت و اسرار میں ڈوبی ہوئی رومانوی داستان کی، جسکا آغاز ہزاروں سال قبل ٹیکسلا (پاکستان) کے محلات (آج کے کھنڈرات) میں ہوا اور اختتام تبت کے پراسرار جنگلوں اور پہاڑوں میں۔ یہ کہانی گھومتی ہے انسانی محبت اخلاص اور ہمدردی کے جذبات کے گرد، اور اسے سنگین بناتی ہے انسان کی لالچ طمع اور خود غرضی کے جذبے۔ ایک بے قرار بھٹکتی رُوح کو سکون اور چین دینے کے لیے کیئے گئے دشوار گزار سفر کی داستان، جس میں کچھ لوگوں کے پیش نظر ایک بیش بہا خزانہ بھی تھا۔

پُراسرار خزانہ کو **ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

# معروف گلوکار مجیب عالم کے حوالے سے گفتگو

3 جون 2004ء کو معروف گلوکار مجیب عالم حرکت قلب بند ہونے کے سبب انتقال کر گئے۔ مجیب عالم 1948ء میں بھارت کے شہر کانپور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا باقاعدہ آغاز ریڈیو سے کیا فلم "مجبور" کے گانے "آجا پیاری نندیا" سے انہوں نے انڈسٹری میں قدم رکھا اور 27 جون 1966ء میں موسیقار نوشاد کی فلم "جلوہ" کے گانے "کوئی جا کے ان سے کہہ دے ہمیں یوں نہ آزمائیں" سے انڈسٹری میں اپنی شناخت بنائی۔ ان کے گائے ہوئے مشہور گانوں میں: وہ میرے سامنے تصویر بنے بیٹھے ہیں' بجھے نہ دل رات کا' میں تیرے اجنبی شہر میں' تھکی تھی سی زندگی' خدا کبھی نہ کرے' تم نے وعدہ کیا تھا آنے کا' میں خوشی میں کیوں نہ گاؤں' خدا نے حسن دیا ایسا بے مثال تجھے، یوں کھو گئے تیرے پیار میں ہم' میرے ساتھی دل میرا تجھ کو' کوئی ان سے جا کے کہہ دے' اے بے قرار تمنا ذرا ٹھہر جا' ذرا تم ہی سوچو بچھڑ کر یہ ملنا' کسی کے بے چین دل کی دھڑکن' دنیا والوں تمہاری دنیا میں' قسم اس وقت کی جب زندگی کروٹ بدلتی ہے' اے ماں تیری صورت کے آگے' آ میرے ساتھی دل میرا تجھ کو اور دل تیری یاد میں جب گھبرائے گا شامل ہیں مجیب عالم نے 12 سال قبل پلے بیک گانے بند کر کے قومی و ملی نغموں' پرائیویٹ شوز بیرون ملک دوروں کی جانب خصوصی توجہ دی۔ وہ ایک طویل عرصے سے شوگر کے مرض میں مبتلا تھے۔ ان کے انتقال کے بعد روزنامہ خبریں شازیہ انوار نے ان کی بیوہ فریدہ مجیب اور بیٹی حنا مجیب سے گفتگو کا اہتمام کیا جو پیش خدمت ہے۔

فریدہ مجیب کہتی ہیں

"میں وہ وقت کبھی نہیں بھول سکتی جب میں ان سے ملی تھی۔ میری جٹھانی جنہیں ہم سب بجیا کہتے ہیں میرے گھر کے کچھ افراد کو جانتی تھیں جس بنیاد پر میں کبھی کبھی ان سے ملنے چلی جاتی تھی۔ یہ شاید 1983ء کی میری شادی سے ایک سال قبل کی بات ہے میں جب بجیا کے گھر گئی تو انہوں نے مجھے ایک صاحب سے ملایا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ "ان سے ملو یہ مجیب عالم ہیں" میں جیسے خوشی سے پاگل ہو گئی کیوں کہ میں ان کے گانوں کی دیوانی تھی۔ بجیا نے مجھ سے پوچھا۔ "تم ان سے شادی کرو گی؟" مجھے اتنی شرم آئی کہ میں وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور گھر آ کر بھی گھنٹوں میری حالت ایسی ہی رہی۔"

"مجیب عالم سے شادی کی بات چیت ٹھہر جانے پر میں بے حد خوش تھی۔ گو کہ ان ہی دنوں میری ایک بہن کے اچانک انتقال ہونے پر شادی کی رسومات سادگی سے ادا کی گئیں تاہم اپنے پسندیدہ گلوکار سے شادی ہونے پر میرا دل کھلا ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے مجھے زندگی میں سب کچھ مل گیا اور ہوا بھی کچھ یوں ہی۔ انہوں نے مجھے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس ہی نہیں ہونے دی، جو دیا کھل کر دیا خواہ وہ محبت ہو یا ضرورت کی کوئی چیز۔

سوال : کیا سوچ کر آپ نے ان سے شادی کی تھی؟

فریدہ مجیب: سچ جانئے تو میں نے اس سے لالچ میں آ کر شادی کی تھی۔

سوال : لالچ؟

فریدہ مجیب: ہاں لالچ میں میں نے ان سے کہا بھی کہ میں نے اس لئے آپ سے شادی کی تھی کہ آپ مجھے گانے سنائیں گے مگر آپ تو مجھے گانے سناتے ہی نہیں تو مجیب مجھ سے کہتے "بھئی میں بڑا فنکار ہوں' ایڈوانس لیتا ہوں پھر گانے سناتا ہوں تو پہلے

ایڈوانس دو۔"

سوال : آپ نے مجیب عالم صاحب کے ساتھ کیسی ازدواجی زندگی گزاری؟

فریدہ مجیب: بہت اچھی! میں سمجھتی ہوں کہ مجیب عالم ایک بہترین شوہر تھے۔ میں نے ان سے جب جو کہا وہ انہوں نے دلا دیا۔

سوال : طبیعتاً کیسے تھے؟

فریدہ مجیب: ہر وقت مذاق کرتے رہتے تھے' کبھی کسی بات کا سنجیدگی سے جواب ہی نہیں دیتے تھے۔

سوال : آپ کو معلوم تھا کہ مجیب عالم شوبز کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں' ان کے مختلف خواتین سے مراسم بھی ہیں تو کبھی کوئی جلسی فیل کی؟

فریدہ مجیب: نہیں! مجیب بہت اچھے تھے اور مجھے مجیب پر سو فیصد نہیں دو سو فیصد بھروسہ تھا۔

سوال : معین اختر سے تو مجیب عالم کی بہت گہری دوستی تھی؟

فریدہ مجیب: جی ہاں! بہت زیادہ مجھے یاد ہے کہ جب میری شادی ہوئی تو مجھ سے مجیب نے کہا کہ میرا ایک دوست ہے وہ کہتا ہے کہ سنا ہے تمہاری بیوی بہت خوبصورت ہے مجھے اس سے ملاؤ۔ انہوں نے دعوت دی تو ہم دونوں ان کی طرف گئے۔ جب میں ان سے ملی تو انہوں نے مجھے دیکھتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان کا جغرافیہ کیا ہے؟ میں نے کہا جی ہاں' انہوں نے پوچھا۔ کیا آپ کو علم ہے کہ پاکستان کی آبادی کتنی ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ بھابھی آپ کو پورے پاکستان میں بس یہی شخص ملا تھا شادی کرنے کے لئے۔"

سوال : آپ کا مجیب عالم کے ساتھ کس بات پر جھگڑا ہوا کرتا تھا؟

فریدہ مجیب: مجیب بہت نفاست پسند تھے، انہیں گھر میں بے ترتیبی بالکل پسند نہیں تھی۔ بس اگر جوتا اپنی جگہ نہیں ہے یا کہیں مٹی ہے تو غصہ کرنے لگتے تھے۔ جھگڑے کی نوعیت کبھی بھی شدید نہیں ہوتی تھی۔

سوال : مناتا کون تھا؟

فریدہ مجیب: کوئی نہیں' اس کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد ہی ہم دونوں میں سے کوئی بھی بات چیت شروع کر دیتا تھا۔

سوال : کھانے میں مجیب عالم کو کیا پسند تھا؟

فریدہ مجیب: ماش کی دال بہت زیادہ پسند تھی۔ اس کے علاوہ گوشت بہت شوق سے کھاتے تھے۔ مجیب خود بھی بہت اچھے کک تھے۔

سوال : باہر کھانا کھانے کا شوق تھا؟

فریدہ مجیب: ہاں' ہم لوگ ہفتے میں ایک بار ضرور کھانا کھانے کے باہر جایا کرتے تھے۔

سوال : شاپنگ کا شوق تھا؟

فریدہ مجیب: بہت زیادہ۔ جب حالات خراب ہوئے تو انہیں اس بات کا بہت زیادہ دکھ تھا کہ وہ ہمارے لئے کچھ نہیں کر پائے۔ (آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے)

سوال : مجیب عالم صاحب نے اپنی بیماری کے دن کیسے گزارے؟

فریدہ مجیب: بہت تکلیف میں۔ انہوں نے گزشتہ کئی سالوں میں بہت تکلیف برداشت کی۔ ہر وقت ہنسنے کھلکھلانے والا آدمی جب بستر پر پڑا تو اسے شاید اپنے وجود سے وحشت ہونے لگی۔ گھر کی فکر' معاشی مسائل' دوستوں کی بے رخی نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔

سوال : کیا سارے دوستوں نے منہ موڑ لیا تھا؟

فریدہ مجیب: بہت سے ایسے تھے جو ان کے عروج کے دور میں تو بہت آیا کرتے تھے لیکن جیسے ہی فلم انڈسٹری سے وہ دور ہوئے ایسے لوگ بھی ان سے دور ہو گئے۔ میں تو سمجھتی ہوں اچھا ہی ہے کہ ابن الوقت قسم کے لوگ جلد ہی پہچان لئے گئے مگر شہزاد حیدری، معین اختر، شوکت رضوی، عمران رضا، سابق صوبائی وزیر برائے ثقافت شبیر قائم خانی، مظہر منگی، حفیظ انصاری، اکرم شیخ علی رضا، سعید السلام، ملک انوکھا، چاند پوری، عزیز وارثی جیسے دوستوں نے ان کا آخری وقت تک ساتھ دیا۔

سوال : یہ دل کی بیماری کا کیا معاملہ تھا؟

فریدہ مجیب: ان کے دل کا ایک وال بند تھا لیکن انہوں نے مجھے منع کیا تھا کہ کسی کو نہ بتاؤں۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا مگر جب تکلیف بڑھنے لگی اور ان کے بڑے بھائی کراچی آئے اور انہوں نے مجھ پر دباؤ ڈالا تو میں نے انہیں آگاہ کیا۔ انہوں نے مجیب سے کہا کہ تم انجیو گرافی کیوں نہیں کراتے۔ مجیب نے دھیمی آواز میں ان سے کہا کہ اس کے علاج میں کافی پیسے لگتے ہیں اور میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میں ہر لمحہ ان کے ساتھ رہتی تھی۔ ہسپتال میں، گھر میں ہر جگہ میں ان کی پرچھائیں بنی رہتی مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ اتنی اچانک میرا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔

سوال : آپ آخری لمحات میں ان کے ہمراہ تھیں؟

فریدہ مجیب: گھر میں لائیٹ نہیں تھی مجیب کو گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ انہوں نے مجھ سے اور حنا سے کہا کہ چلو شہزاد حیدری کے گھر گلستان جوہر چلتے ہیں۔ مجیب کو دو تین دن سے کھانسی ہو رہی تھی۔ ابھی گھر سے نکلے ہی تھے کہ انہیں اچانک کھانسی شروع ہو گئی۔ گھر سے کچھ ہی فاصلے پر قائم پیٹرول پمپ سے پانی لے کر انہوں نے پیا گلشن معمار کی روڈ ختم ہوتے ہی احسن آباد اس کے بعد ہائی وے شروع ہوتا ہے۔ سوا گیارہ بجے تھے' ابھی ہم احسن آباد سے چند ہی قدم کے فاصلے پر تھے کہ انہیں پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔ میں نے پانی کی بوتل کھولی، انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے پانی پینے سے انکار کیا، کہنے لگے مجھے کچھ ہو رہا ہے، مجیب اسٹیئرنگ پر سر رکھ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔ میں گھبرا گئی' حنا رونے لگی' باہر نکل کر اس نے گاڑیوں کو رکنے کا اشارہ کرنا شروع کر دیا۔ اسے دیکھ کر کئی گاڑیاں رک گئیں' ہم نے مجیب کو ایک گاڑی میں ڈالا اور نزدیک ترین واٹر پمپ کے ہام جی ہسپتال لے گئے لیکن مجیب اس وقت تک ہمیں چھوڑ کر جا چکے تھے۔ 20 سالہ رفاقت کا خیال بھی نہ کیا اور ایک لمحہ میں ہمیں چھوڑ گئے۔ مجھے گھر کا سناٹا کھائے جا رہا ہے۔ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا کہ اب زندگی کس طرح سے گزاریں گے کہ زندگی کی ساری مصروفیات تو ان کے ساتھ ہی چلی گئیں۔

حنا مجیب کہتی ہیں:

سوال : حنا آپ کے والد آپ کو کتنا چاہتے تھے؟

حنا مجیب: اس بات کا اندازہ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا لیکن میں جانتی ہوں کہ میرے والد مجھے بے حد چاہتے تھے' بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ وہ مجھے دیگر بچوں کے والدین سے کچھ زیادہ ہی چاہتے تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ مجھے نہیں یاد کہ انہوں نے کبھی میری کسی خواہش کو رد کیا ہو۔

سوال: بچپن کا کوئی یادگار واقعہ؟

حنا مجیب: ہاں ایک بار مجھے دھن سوار ہوئی کہ مجھے ماؤتھ آرگن لینا ہے۔ میں ان سے ضد کرتی رہی پہلے تو انہوں نے مجھے منع کیا مگر جب میں نہیں مانی تو وہ مجھے دکان پر لے گئے۔ دکان پر جا کر میں نے دیکھا کہ وہاں ایک پیانو رکھا ہوا ہے' بس میں نے وہیں ضد شروع کر دی کہ مجھے تو یہی چاہئے۔ انہوں نے مجھے پیانو دلا تو دیا مگر سارے راستے یہی بولتے ہوئے آئے کہ حنا تم بہت خطرناک لڑکی ہو کہتی کچھ ہو اور موقع پر بدل جاتی ہو۔

سوال: پڑھائی کے حوالے سے بھی نہیں؟

حنا مجیب: نہیں' کچھ تو وہ مجھے چاہتے بھی بہت تھے' کچھ میں نے کبھی موقع ہی نہیں دیا۔ میں ایک اچھی سٹوڈنٹ ہوں' وہ مجھے تعلیم کے میدان میں اچھا دیکھنا چاہتے تھے اور میں بہت دل لگا کر پڑھتی تھی۔ اس ضمن میں کبھی انہیں مجھے ڈانٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

سوال: آپ کی سالگرہ مناتے تھے؟

حنا مجیب: بہت دھوم دھام سے۔ وہ مجھے بہت چاہتے تھے اس لئے میری ہر خوشی کو بہت اچھی طرح سے مناتے تھے۔

سوال : مزاج میں کیسے تھے؟

حنا مجیب: بہت اچھے' بے حد پر مزاح طبیعت تھی ان کی۔ ہر وقت ہنستے ہنساتے رہتے تھے' مجھے ان کی یہ بات بہت پسند تھی کہ وہ مشکل حالات میں بھی اپنی فطری شگفتگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔

سوال: کیا آپ ان کیساتھ پروگرامز میں جاتی تھیں؟

حنا مجیب: کبھی کبھار ویسے امی اور میں ان کے ساتھ پروگرامز میں زیادہ نہیں جایا کرتے تھے۔

سوال: ان کی سب سے زیادہ کس سے بنتی تھی؟

حنا مجیب: میرے نانا ابو سلطان سکندر سے' نانا سے ان کی بے حد دوستی تھی۔ ہر وقت دونوں ایک دوسرے سے بات چیت کرتے رہتے تھے۔ لوگ حیران بھی ہوتے تھے کہ سسر داماد میں کس قدر دوستی ہے مگر یہ سچ ہے کہ وہ میرے نانا سے بے حد قریب تھے' دونوں ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے۔

سوال: بہن بھائیوں میں کس سے سب سے زیادہ قریب تھے؟

حنا مجیب: میری سب سے چھوٹی پھوپھی جن کا نام کوثر پروین ہے' ابو جان چھیڑ کتے تھے۔ میری یہ پھوپھی اسلام آباد میں رہتی ہیں لیکن جب بھی کراچی آتی تھیں ابو ان کو لے کر بیٹھ جاتے تھے۔ ان دنوں ابو امی کو بھی بھول جاتے تھے۔ ابو یانی اس بہن سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے اور پھوپھو بھی ان کو بہت زیادہ چاہتی ہیں۔

سوال: کیا آپ کے والد آپ کو سنگر بنانا چاہتے تھے؟

حنا مجیب: نہیں!

سوال : کیوں؟

حنا مجیب: جب بھی میں کچھ گانا چاہتی تھی تو وہ کہتے تھے کہ بس حنا رک جاؤ تمہاری آواز بہت بری ہے۔

سوال: حنا آپ اپنی والدہ سے زیادہ قریب ہیں یا والد سے؟

حنا مجیب: میں اپنے والد سے بے حد قریب تھی۔ وہ میرے دوست بھی تھے اور والد بھی۔ اپنے سارے مسائل، اپنی دن بھر کی باتیں میں ان سے شیئر کرتی تھی وہ مجھے اچھے مشورے بھی دیتے تھے اور میرے مسائل حل بھی کرتے تھے۔

سوال: آپ کے خیال میں آپ کے والد کے عروج وزوال سے ان کے دوستوں میں کمی آئی؟

حنا مجیب: جی ہاں! پہلے تو ان کے پاس بہت سے لوگ آتے تھے مگر جیسے جیسے ان کی طبیعت بگڑتی گئی ویسے ویسے ان کے پاس آنے والوں کی تعداد میں کمی ہوتی چلی گئی مگر کچھ لوگ ایسے تھے جو ابو کے بہت اچھے دوستوں میں تھے جیسا کہ شہزاد حیدری انکل، معین اختر انکل، ملک نوکھا انکل وغیرہ۔

سوال: کیا مجیب عالم صاحب اس بات پر افسوس کرتے تھے؟

حنا مجیب: ہاں انہیں افسوس تو بہت تھا مگر وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہی دنیا ہے۔ جس کا عروج ہوتا ہے اسے لوگ پوچھتے ہیں اور جس کا وقت نکل جائے اس کی قدر نہیں ہوتی۔

سوال: ایک طویل عرصے سے بیمار تھے اس سے ان کے مزاج پر منفی اثرات مرتب ہوئے؟

حنا مجیب: یہ تو ایک فطری سی بات ہے۔ وہ بے حد بیمار ہو جایا کرتے تھے۔ اکثر ہسپتال میں ایڈمٹ بھی رہتے تھے جس کی وجہ سے ان کے مزاج میں چڑچڑا پن آ گیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ کوشش کرتے تھے کہ کم سے کم غصہ کریں۔

سوال: ابو جب ہسپتال میں ہوتے تھے تو آپ لوگ کہاں رہتے تھے؟

حنا مجیب: میں اور امی ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے بس کپڑے بدلنے یا سامان وغیرہ لینے گھر آتے تھے بصورت دیگر میں اور امی ہر وقت ابو کے ساتھ ہی رہتے تھے۔

سوال: گھر کس کے حوالے کرتی تھیں؟

حنا مجیب: گھر میرے ابو سے زیادہ قیمتی نہیں تھا۔ ہم گھر کو تالا لگا کر جاتے تھے کیوں کہ میری ننھیال اور ددھیال کے زیادہ افراد دوسرے شہروں میں رہتے ہیں۔

سوال: ہسپتال کے اخراجات کیسے برداشت کرتے تھے؟

حنا مجیب: کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے، معین انکل کیساتھ پروگرامز بھی کرتے تھے۔ درمیان میں جب ان کا آپریشن ہوا تھا تو اس سے قبل انہوں نے بیرون ملک ایک پروگرام کیا تھا اس سے اتنے پیسے آ گئے تھے کہ ہسپتال کے اخراجات نکل آئے تھے۔

سوال: کیا حکومت کی جانب سے کوئی مدد نہیں ملی؟

حنا مجیب: حکومت کی جانب سے گرانٹ وغیرہ بھی ملتی رہی۔ آرٹس کونسل نے بھی ایک لاکھ روپے دینے کا اعلان کیا تھا وہ بھی مل گئے۔

سوال: حنا یہ بتائیے کہ وہ آپ لوگوں کے مستقبل کی طرف سے پریشان رہتے تھے؟

حنا مجیب: ہاں بہت پریشان رہتے تھے' اکثر کہا کرتے تھے کہ میں تم لوگوں کے لئے کچھ نہیں کر پایا۔

سوال: گھر ذاتی ہے؟

حنا مجیب: جی ہاں! ابو نے گھر کے اوپر بھی دو کمرے بنوائے ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو تم اور امی اوپر شفٹ ہو جانا اور نیچے کا گھر کرائے پر دے دینا تا کہ تم لوگوں کو مالی مشکلات نہ ہوں۔

سوال: کیا آپ کے والد مذہبی رجحان کے مالک تھے؟

حنا مجیب: میرے والد بہت محبت کرنے والے انسان تھے۔ اپنے بہن بھائیوں سے تو ان کی محبت فطری تھی وہ سب کو بہت چاہتے تھے سب کا احترام کرتے تھے ان کی اپنے سسرال یعنی میری ننھیال میں بھی سب سے بہت دوستی تھی۔

سوال: امی سے کیسے تعلقات تھے ان کے؟

حنا مجیب: امی اور ابو میں بہت زیادہ محبت تھی۔ مجھے کبھی کبھی ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ دونوں ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے کے باوجود ایک دوسرے کے لئے ہی بنے ہیں۔

سوال: کیا ان دونوں کے درمیان جھگڑا ہوتا تھا؟

حنا مجیب: ہاں! بہت ہوتا تھا۔ کچھ دن قبل ہی ابو اپنا سامان لے کر یہ کہہ کر گئے کہ اب میں کبھی گھر نہیں آؤں گا مگر گلشن معمار کا ایک چکر لگا کر واپس آ گئے کہ میں تم لوگوں کے بغیر کیسے رہ سکوں گا۔

سوال: آپ کو اپنے والد کا کون سا گانا بہت زیادہ پسند ہے؟

حنا مجیب: مجھے تو ان کے سارے ہی گانے پسند ہیں۔

سوال: کون سا گانا سب سے زیادہ پسند ہے؟

حنا مجیب: (کچھ سوچتے ہوئے) میں تیرا شہر چھوڑ جاؤں گا۔

سوال: جن فلموں میں ابو کے گانے شامل ہیں وہ فلمیں دیکھی ہیں آپ نے؟

حنا مجیب: نہیں فلمیں تو نہیں دیکھیں مگر گانے دیکھے ہیں کیوں کہ ان کا ریکارڈ ابو کے پاس محفوظ ہے۔ مجھے تو سارے گانے ہی اچھے لگتے ہیں۔

سوال: جب لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ مجیب عالم کی بیٹی ہیں تو آپ کو کیسا لگتا ہے؟

حنا مجیب: مجھے بہت فخر محسوس ہوتا ہے کہ میں اپنے بڑے انسان کی بیٹی ہوں۔ وہ ایک بڑے گلوکار تو تھے ہی ایک اچھے اور بڑے انسان بھی تھے۔

سوال: وہ کیسے؟

حنا مجیب: ویسے تو وہ ایک بڑے عرصے سے بیمار تھے جس کی وجہ سے مالی مسائل کا سامنا تھا لیکن اس کے باوجود کسی کو مشکل میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اتنے وضع دار تھے کہ پروگرام کرنے کے بعد اپنے منہ سے کسی سے پیسے نہیں مانگتے تھے۔ اپنی زندگی کا جو انہوں نے آخری پروگرام کیا تھا اس کے پیسے سلطان شیخ صاحب سے لینے تھے۔ ابو کو پیسوں کی بہت پرابلم ہوئی تو ان سے مجبوراً مانگے لیکن پہلے تو وہ ٹالتے رہے پھر آدھے پیسے دیے۔ ابھی بھی آدھے پیسے باقی ہیں۔

سوال: وہ آپ کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے؟

حنا مجیب: جی! ان کی بہت زیادہ خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ میں نے ان کی خواہش پوری کرنے کے لئے بہت زیادہ محنت کی ہے۔ میں نے سرسید سیکنڈری سکول گلشن معمار سے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ نویں جماعت میں میرے 86 فیصد نمبر آئے تھے ابھی میٹرک کا نتیجہ نہیں نکلا ہے۔ انتقال سے دو تین روز قبل ہی انہوں نے معین اختر انکل سے میرے ایڈمیشن کے حوالے سے بات کی تھی۔

سوال : آپ کو ان کی کون سی بات سب سے زیادہ یاد آتی ہے؟

حنا مجیب: (آنکھوں میں نمی لئے ہوئے) وہ کہتے تھے کہ حنا میری بیٹی نہیں بیٹا ہے۔ میں نے بھی انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا اور انشاءاللہ میں انہیں ایک بیٹے کا فرض پورا کر کے دکھاؤں گی۔

سوال: اپنے والد کے حوالے سے کچھ کہنا چاہیں گی؟

حنا مجیب: (آنسوؤں کے درمیان) میں جانتی ہوں کہ ابو ایک ایسے سفر پر رواں ہو چکے ہیں جہاں سے واپسی کی کوئی امید نہیں ہے۔ مگر وہ ہمارے دلوں سے کبھی دور نہیں ہوں گے۔ ان کی آوازیں زادِ راہ کے طور پر ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گی۔ میں اپنی امی کا خیال رکھوں گی، ابو کی یادوں کے سہارے ان کی خواہشوں کو پورا کروں گی۔ (انشاءاللہ)

❁❁❁


## سی ٹاپ

**سی ٹاپ**، مظہر کلیم کی عمران سیریز کا ایک ناول ہے جس میں پاکیشیا کا ایک انتہائی اہم سائنسی فارمولا یورپ کی مجرم تنظیم کے ہاتھ لگ گیا ہے جسے خریدنے کے لئے ایکریمیا اور اسرائیل سمیت تقریباً تمام سپر پاورز نے اس مجرم تنظیم سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ گو یہ مجرم تنظیم عام بدمعاشوں اور غنڈوں پر مشتمل تھی لیکن اس کے باوجود تمام سپر پاورز اس تنظیم سے فارمولا حاصل کرنے کے لئے اسے بھاری رقم دینے پر آمادہ تھیں حتیٰ کہ عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس کو بھی اس فارمولے کے حصول کے لئے اس تنظیم سے بار بار سودے بازی کرنا پڑی اور بھاری رقم دینے کے باوجود فارمولا حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ اس کے باوجود وہ اسے مزید رقومات دینے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ ایسا کیوں ہوا۔ کیا عمران اور پاکیشیا سیکرٹ سروس ایک عام سی مجرم تنظیم کے مقابل بے بس ہو گئے تھے؟ ہر لحاظ سے ایک منفرد کہانی، جس میں پیش آنے والے حیرت انگیز واقعات کے ساتھ ساتھ تیز رفتار ایکشن اور بے پناہ سسپنس نے اسے مزید منفرد اور ممتاز بنا دیا ہے۔ **سی ٹاپ** کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

# ہر دلعزیز پاکستانی پاپ گلوکار

# مشہور پاپ سنگر سلمان احمد

کہا جاتا ہے موسیقی روح کی غذا ہے اور یہ انسانی جسم میں حرکت پیدا کرتی ہے کیونکہ انسان موسیقی کی لے پر جب ہاتھ اور پاؤں کو جنبش دیتا ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا ہے اور جھومنے لگتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ موسیقی صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔

موسیقی کی دنیا میں جنون گروپ نے جو مقبولیت حاصل کی۔ ایسی شہرت کسی اور موسیقی گروپ کے حصہ میں نہیں آئی۔ کل کی طرح آج بھی جنون گروپ موسیقی کی دنیا میں چھایا ہوا ہے اور اس گروپ کے بنائے گئے گیت زبان زد عام ہیں۔ اس گروپ کے یوں تو بہت سے گیت اور نغمے لوگوں کی پسندیدگی کا باعث بنے ہوئے ہیں مگر یہاں چند گیتوں کے بول دیئے جا رہے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

ے سیونی، چین اک پل نہیں اور کوئی حل نہیں

ے نی ہیرے چھڈی نہ کدی بجاں نوں

ے بلھیا کیہ جاناں میں کون

ے خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

جنون گروپ کے لیڈر سلمان احمد کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ لاہور کے یہ سپوت پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں لیکن گلوکاری کا شوق انہیں موسیقی کی دنیا میں لے آیا اور پی ٹی وی کے نامور ڈائریکٹر شعیب منصور نے انہیں میوزک کی طرف مائل کیا۔ وہ جنون کی حد تک موسیقی سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان کا یہ انٹرویو خبریں سنڈے میگزین میں شائع ہوا جو قارئین کی نذر ہے۔

سوال: گانے کا شوق کب ہوا؟

سلمان احمد: یہ شوق مجھے شروع سے ہی ہے اور جب کالج میں زیر تعلیم تھا تو اس شوق نے جنون کی صورت اختیار کر لی اور جنون گروپ کے پلیٹ فارم سے اپنے شوق کو پایہ تکمیل تک پہنچا رہا ہوں۔

سوال: سنا ہے آپ گٹار بجانے کے ماہر ہیں؟

سلمان احمد: لوگ کہتے ہیں میں پاکستان کا سب سے بڑا گٹار کا ماہر ہوں، میں نے ہمیشہ موسیقی کی روح میں گم ہو کر اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے اور گٹار میرا پسندیدہ ہے۔

سوال: کیا آپ جانتے تھے کہ شہرت کی دیوی اس قدر جلد آپ پر مہربان ہو جائے گی؟

سلمان احمد: شہرت اور عزت یہ دونوں چیزیں انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہیں اور فرمان قدرت ہے کہ وہ انسان کو اس کی محنت کا صلہ دیتا ہے۔ میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہوں اور اللہ تعالیٰ نے مجھ پر جس قدر نوازشیں کیں میں ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔ شہرت خدا کی دین ہے، پہلے واقعی میں شہرت کے لیے گاتا تھا۔ اب اسے برقرار رکھنے کے لیے گاتا ہوں۔

سوال: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے گروپ نے موسیقی کی دنیا میں کوئی انقلاب برپا کیا ہے؟

سلمان احمد: جب جنون گروپ بنا اور ہم نے موسیقی کی ابتدا کی تو اس وقت پورے ملک میں غیر ملکی میوزک چھایا ہوا تھا جس کا سحر توڑنے کے لیے ایک حکمت عملی اختیار کی اور پھر جس موسیقی کو روشناس کرایا۔ لوگوں نے اسے پسند کرنا شروع کیا اور انقلاب یہ برپا

کیا کہ ہم نے غیر ملکی موسیقی کے مقابلے میں اپنے عوام کو علامہ اقبال اور بابا بلھے شاہ کا کلام سننے پر مجبور کیا جسے لوگ بھول چکے تھے۔

سوال: آپ کے گروپ کو قائم ہوئے کتنا عرصہ گزر گیا اور کیا یہ گروپ اب بھی قائم ہے؟

سلمان احمد: ہماری موسیقی میں زیادہ عارفانہ کلام ہوتا ہے اور یہ وہ کلام ہے جو دل پر اثر کرتا ہے اور ہمارے عارفانہ کلام کو اپنے ہی نہیں غیر بھی بھرپور دلچسپی سے سنتے بلکہ اس میں کھو جاتے ہیں جہاں تک گروپ کے قیام کا تعلق ہے تو یہ گروپ گزشتہ بارہ سال سے قائم دائم ہے اور یہ اعزاز جنون کو ہی حاصل ہے اتنا عرصہ کوئی بھی گروپ قائم نہیں رہ سکا۔

سوال: آپ کے گروپ کے بارے میں افواہیں پھیل رہی ہیں کہ یہ ٹوٹ گیا ہے؟

سلمان احمد: ایسی افواہیں ملٹی نیشنل کمپنیاں پھیلا رہی ہیں کہ ہمارا گروپ ٹوٹ گیا حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ صرف افواہیں ہی ہیں۔ اس میں حقیقت کوئی نہیں ہے اور میں واضح طور پر یہ کہوں گا کہ پاکستان کی طرح جنون گروپ بھی کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔

سوال: آپ کے بارے میں بھی افواہ ہے کہ آپ امریکہ منتقل ہو رہے ہیں؟

سلمان احمد: میرے بارے میں اگر کوئی افواہ ہے تو مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ پاکستان میرا وطن ہے اور میرا جینا مرنا اس دھرتی پر ہے۔ رہی امریکہ منتقل ہونے کی بات تو میں بتاتا چلوں کہ میری اہلیہ جولیڈی ڈاکٹر ہیں۔ امریکہ میں کورس کر رہی ہیں اور میں بچوں کو ملنے کے لیے اگر امریکہ چلا جاتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں وہاں شفٹ ہو رہا ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

سوال: کیا آپ کے گروپ میں کسی قسم کے اختلافات پائے جاتے ہیں؟

سلمان احمد: ہمارے گروپ میں کوئی اختلافات نہیں ہیں اور ہم سب ہمیشہ ایک ساتھ کام کرتے ہیں اور مل کر کرتے ہیں۔ علی عظمت اور برائن کے ساتھ میں کام کر رہا ہوں لہٰذا اختلافات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ابھی عائشہ عالم سے برائن کو طلاق ہو گئی ہے اس کے باوجود وہ ہمارے ساتھ گروپ میں رہیں گے۔

سوال: جنید جمشید سے بھی آپ کے اختلافات کی افواہ پھیلی تھی؟

سلمان احمد: جنید جمشید سے بھی میرے کوئی اختلافات نہیں ہیں۔ وہ میرے بھائیوں کی طرح ہے اور ہم آپس میں بھائیوں کی طرح ملتے ہیں۔

سوال: آپ کے گروپ کے کلام کو غیر ممالک میں بھی پذیرائی ملی ہے؟

سلمان احمد: ہمارے گروپ کا صوفیانہ کلام بہت عام ہے۔ ہمارے عوام بھارت کی فلمی موسیقی پر لگے ہوئے تھے مگر ہم نے انہیں عارفانہ کلام پر لگا دیا ہے۔ ہمارے کلام اور موسیقی کو امریکہ اور برطانیہ میں بہت زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ ہم نے تو بھارت میں بھی اپنا کلچر پروموٹ کیا ہے اور بھارتی بھی ہمارے گانے سنتے گاتے اور پسند کرتے ہیں۔

سوال: کیا آپ کے گروپ کو ایوارڈ بھی ملے ہیں؟

سلمان احمد: جنون پاکستان کا واحد گروپ ہے جسے انٹرنیشنل سطح پر دنیا کا سب سے بڑا اور بہترین ایوارڈ ملا ہے اور پوری دنیا میں جنون کا شہرہ ہے۔

سوال: مسئلہ کشمیر کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

سلمان احمد: مسئلہ کشمیر پاکستان کا بنیادی مسئلہ ہے اور میری رائے میں یہ مسئلہ حل ہونا چاہیے۔ بھارت مقبوضہ کشمیر پر زبردستی قابض ہے

اور کشمیریوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ اب یہ ظلم ختم ہونا چاہیے اور کشمیریوں کو ان کی منشا کے مطابق آزادی ملنی چاہیے جو ان کا حق ہے۔

سوال: عراق پر امریکی حملہ بارے آپ کے خیالات کیا ہیں؟

سلمان احمد: میں یو این او کا نمائندہ ہوں، امریکہ کا عراق پر حملہ غلط ہے۔ میں صدام کے حق میں نہیں مگر وہاں بے گناہ بچوں اور عورتوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ امریکہ کو چاہیے وہ اس سے باز آ جائے ورنہ امریکہ کے خلاف جو نفرت پیدا ہوگی اسے وہ کبھی دور نہیں کر پائے گا۔

سوال: آپ موسیقی میں کس حد تک جانا چاہتے ہیں بھارتی فلم انڈسٹری سے اشتراک عمل کے حوالے سے آپ کی رائے ہے کیا' ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنے پروفیشن کی طرف لوٹ سکیں گے شعبہ گلوکاری کی ترقی کے لیے آپ ذہن میں تجاویز ہیں؟

سلمان احمد: میوزک کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ موسیقی کی کوئی سرحد نہیں ہوتی اور اپنی پرفارمنس تب تک جاری کر رکھوں گا جب تک میری سانس چلے گی۔ میں دنیا کو یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ پاکستانی امن پسند قوم ہے اور ہم زندگی پیار سے گزارنے کے خواہاں ہیں لہٰذا دنیا میں امن کا قیام بہت ضروری ہے۔ ہمارے ملک میں ٹیلنٹ کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ فنکاروں کی قدر نہیں کی جاتی جس سے وہ دلبرداشتہ ہو جاتے ہیں۔ بھارت والے ہماری موسیقی کی قدر کرتے ہیں۔ اس لیے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ ان کے کلاسیکل سنگر بھی ہمارے ساتھ گانے کے لیے تیار ہیں۔ مجھے متعدد بار پاکستانی ڈائریکٹروں اور فلم سازوں نے فلموں کی موسیقی کے لیے کہا ہے لیکن میں اتنا زیادہ مصروف ہوں کہ وقت نہیں نکال سکتا۔ اب میں شعیب منصور کی فلم کے لیے موسیقی دوں گا جس میں شان اور ایمان کام کر رہے ہیں۔ اس فلم کا نام "خدا کے لیے" ہے۔ میری والدہ کی خواہش تھی کہ میں واپس میڈیکل شعبے میں چلا جاؤں۔ ہو سکتا ہے کہ میں پچاس سال بعد دل کے آپریشن کرنا شروع کر دوں۔ میں اپنا اگلا ویڈیو بھی انڈیا میں بناؤں گا۔ حال ہی میں میری ملاقات نیویارک میں شبانہ اعظمی سے ہوئی۔ انہوں نے میرے ساتھ کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ فلم انڈسٹری کو چاہیے کہ جدید ٹیکنالوجی منگوائیں، معمولی سی پروسیسنگ کے لیے بیرون ملک جانا پڑتا ہے۔ موسیقی کی ترویج کے لیے ضروری ہے کہ کالج اور یونیورسٹی میں میوزک سیکشن بنائے جائیں جہاں طلباء نہ صرف میوزک سن سکیں بلکہ سیکھ بھی سکیں۔ میری ذاتی رائے میں صرف داڑھی لمبی کرنے اور ٹوپی پہننے سے کوئی مسلمان نہیں بن جاتا اگر اسلام کو سمجھنا ہے تو قرآن پڑھیں اور اس کی تعلیمات پر عمل کریں۔ مجھے نصیرالدین شاہ نے اپنی ڈائریکشن میں بننے والی پہلی فلم میں اداکاری کے لیے کہا ہے جبکہ میرا نائر نے بھی اپنی فلم میں کام کے لیے پیش کی ہے۔ اصل میں مجھے ڈاکومنٹریز بنانے کا شوق ہے۔ میں بی بی سی کے لیے دو ڈاکومنٹری فلمیں بنا چکا ہوں۔ ایک چل چکی ہے جبکہ دوسری جلد ہی نشر ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ فنکار ہمارا سرمایہ ہیں ان کی قدر کرنی چاہیے مگر ایسا نہیں ہے بے شمار فنکار کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں لیکن حکومت ان کے لیے کچھ نہیں کر رہی۔ بولی وڈ میں میری بہت سے لوگوں سے دوستی ہے۔ تبو اور پریتی زنٹا سے اچھی دوستی ہے جبکہ نصیرالدین شاہ اور عامر خان بہت پسند ہیں۔

✿✿✿

# پرائیڈ آف فارمنس اور عظیم سماجی رہنما

# ابرار الحق

پاکستان میں اور پاکستان سے باہر جہاں جہاں پاپ سنا جاتا ہے وہاں ابرار الحق کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے نغموں سے پنجابی زبان کی مقبولیت لوٹ آئی ہے لیکن یہ بات بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے اردو نغمات بھی خوب گائے اور کچھ گانوں میں انگریزی کے امتزاج نے بھی ان کے نغموں کی مقبولیت میں اضافہ کیا مگر اس سے قطع نظر ہم نے ان لوگوں کو بھی ان کی دھنوں پر سر دھنتے دیکھا ہے جنھیں ان میں سے کوئی زبان بھی نہیں آتی' فقط دھنیں انہیں جھومنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ ابھی لوگ ان کی آواز کے سحر میں مدہوش تھے کہ انہوں نے "سہارا" کے نام سے ٹرسٹ ہسپتال کی تعمیر نہ صرف شروع کر دی بلکہ چند سالوں میں ہسپتال کے پروجیکٹ کو پایہ تکمیل تک بھی پہنچا دیا۔ اس وقت ہزاروں لوگ سہارا ٹرسٹ ہسپتال سے استفادہ کر رہے ہیں یوں ایک بار پھر اس حساس انسان نے اپنے فلاحی جذبے سے لوگوں کے دل جیت لیے شاید یہی وجہ ہے کہ جب پاکستان میں سیاستدانوں کے سوا مقبول ترین لوگوں کے لیے گیلپ سروے ہوا تو ابرار الحق تیسرے نمبر پر تھے۔ ان کی سب سے اچھی عادت یہ ہے کہ وہ اتنی شہرت کے باوجود مغرور نہیں ہوئے بلکہ وہ اسے اللہ کا کرم اور ماں کی دعاؤں کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے خداوند کریم کے حضور سجدہ شکر ادا کرتے ہیں۔

دلوں پر حکمرانی کرنے والے ابرار الحق سے کیا جانے والا ایک خوبصورت انٹرویو نذر قارئین ہے۔

**سوال:** ابرار الحق اپنی ابتدائی زندگی اور تعلیمی سفر کے بارے میں کچھ بتائیں؟

**ابرار الحق:** میری جائے پیدائش فیصل آباد ہے اور تاریخ پیدائش 21 جولائی ہے۔ کچھ عرصہ فیصل آباد رہنے کے بعد ہم سب گجرات آ گئے اور وہیں میونسپل جونیئر ماڈل سکول گجرات میں زیر تعلیم رہا' جس کے بعد اسلام آباد شفٹ ہو گئے اور سن رائز کیمبرج سکول اسلام آباد سے میٹرک کیا۔ سرسید کالج راولپنڈی سے گریجویشن کی اور قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم ایس سی کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد پنجاب لاء کالج راولپنڈی سے لاء کی ڈگری حاصل کی۔ میرا ایک مذہبی گھرانے سے تعلق ہے۔ بڑے بھائی ریٹائرڈ آرمی آفیسر ہیں جبکہ والد صاحب محکمہ ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن میں ملازم تھے۔ مجھ پر بھی سول سروسز میں جانے کے لیے بڑا دباؤ ڈالا گیا بلکہ بھائی نے تو یہاں تک کہا کہ اگر سول سروسز میں نہ گئے تو زمینوں پر بھیج دیا جاؤں گا مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس سے پہلے میں نے ایچی سن کالج میں لیکچرر شپ کی اور اب آپ لوگوں کے سامنے ہوں۔

**سوال:** لاہور کب آئے اور کیسا لگا؟

**ابرار الحق:** 1995ء میں گھر والوں نے لاہور آنے کا فیصلہ کیا اور ہم یہاں شفٹ ہو گئے لیکن سچ پوچھیں تو یہاں آ کر بہت بوریت محسوس ہوئی کیونکہ تمام دوست پنڈی میں تھے اور یہاں کوئی سوشل ایکٹویٹی (Acitvity) نہ تھی۔ میں بوریت کو دور کرنے کے لیے روزانہ دس کلومیٹر دوڑ لگاتا اور مستقبل کے بارے پلاننگ کرتا رہتا اور جو کچھ بھی آج کر رہا ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم

سے میرے چاہنے والوں کے سامنے ہے جس حوالے سے پلاننگ کر کے چل رہا ہوں۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ کامیاب کرے۔

سوال: بچپن کی کوئی خاص بات جو آج بھی کبھی کبھار آپ کو یاد آ جاتی ہو؟

ابرارالحق: بچپن سے ہی میں بہت حساس مگر بہت شرارتی تھا۔ مجھے آج بھی بچپن کی ایک بات یاد ہے جو میں عموماً شرارت میں کیا کرتا تھا۔ کہیں پر بھی کوئی گنجا شخص دیکھتا اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے کو جی چاہتا۔ یہ شوق اب بھی کبھی کبھی جاگ جاتا ہے۔

سوال: کونسا کھیل شوق سے کھیلنا پسند کرتے ہیں؟

ابرارالحق: بچپن سے کرکٹ کا بہت شوق تھا۔ سکول کے زمانے سے لے کر یونیورسٹی کے دور تک صرف دل لگا کر کرکٹ کھیلی۔ میں اتنی اچھی سپین باؤلنگ کرواتا تھا کہ کبھی کبھار والد صاحب بھی میرا کھیل دیکھنے گراؤنڈ میں آ جاتے تھے۔

سوال: جب اتنا اچھا کھیلتے تھے تو اسی میں کیریئر کیوں نہیں بنایا؟

ابرارالحق: بنا تو سکتا تھا لیکن جو عمر کرکٹر بننے کی تھی وہی عمر پڑھنے کی تھی اس لیے میں نے صرف تعلیم کو ہی ترجیح دی۔

سوال: کیا آپ اپنی موجودہ حیثیت اور شہرت سے مطمئن ہیں؟

ابرارالحق: جی ہاں! اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ اس نے مجھے بہت عزت دی۔ جس مقام پر میں آج کھڑا ہوں یہ سب کچھ اللہ کے کرم اور میری ماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے...... ہاں اگر میں آج صرف گلوکاری ہی کر رہا ہوتا تو شاید اپنے آپ سے اتنا مطمئن نہ ہوتا۔ میرے سوشل ورک نے مجھے اتنا اطمینان دیا ہے کہ میں اپنی گلوکاری میں بھی وقار کا خیال رکھتا ہوں کیونکہ میں پیسے کے لیے نہیں گاتا۔ نجی محفلوں' شادیوں وغیرہ میں جا کر پرفارم کرنا پسند نہیں کرتا۔

سوال: آپ کی گائیکی کا انداز بھارتی گلوکار دلیر مہدی سے بہت ملتا ہے۔ وہ آپ سے متاثر ہے یا آپ اس سے؟

ابرارالحق: میرے خیال میں ایسا نہیں ہے ویسے بھی میرا گانا ''بلو'' اس سے پہلے آیا تھا۔ اب آپ خود اندازہ کر لیں کہ کون کس سے متاثر ہے۔

سوال: کیا ''بلو'' کا گانا گانے سے پہلے آپ کو پتہ تھا کہ یہ اتنا ہٹ ہو جائے گا؟

ابرارالحق: نہیں' مجھے یہ اندازہ تھا کہ لوگ پوچھیں گے کہ یہ خیال تمہارے ذہن میں کیسے آیا مگر اتنا اندازہ نہیں تھا کہ اسے پاکستان کے علاوہ انڈیا اور چائنا میں بھی اتنا پسند کرنے کے ساتھ ساتھ کاپی کیا جائے گا۔

سوال: آپ کے اندر خدمت خلق کا جذبہ پہلے بھی موجود تھا یا ماں کی بیماری کی وجہ سے یہ جذبہ پیدا ہوا؟

ابرارالحق: میں بچپن ہی سے حساس طبع اور کچھ کرنے کا خواہشمند تھا۔ یونیورسٹی میں بھی میں نے ''ریڈیکلو'' کے نام سے اپنی مدد آپ کے تحت ایک تنظیم بنائی تھی جو مستحق طالب علموں کی مدد کرنے کی کوشش کرتی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ Motivation مجھے والدہ سے ہی ملی ہے۔ مجھے ان سے بہت انسیت تھی۔ وہ بہت محب وطن اور دلیر خاتون تھیں۔ مجھے ہمیشہ فرماتیں کہ کوشش کرنا جو عزت ملی ہے اس کا قرض اتار سکو۔ وہ موت سے نہیں ڈرتی تھیں لیکن جب وہ اس دنیا سے گئیں تو مجھے ایسا لگا جیسے زندگی آدھی رہ گئی ہو اگر آج بھی مجھے کوئی کہے کہ تمہارے پاس جو عزت' شہرت' دولت یا جو کچھ بھی ہے سب کچھ دے کر ماں لے لو تو میں بخوشی لے لوں گا۔ میں ان کی مغفرت کے لیے روزانہ چار نفل پڑھتا ہوں اور چار نفل اللہ کی نعمتوں کے شکرانے کے لیے' جس نے مجھے اتنی عزت اور حوصلہ دیا۔ میں ماں کی مغفرت کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ پہلے سوچا ان کے نام سے چائلڈ اینڈ مدر کیئر سنٹر شروع کروں' پھر ریسرچ کی تو پتہ چلا کہ جتنے لوگ پاکستان میں ٹی بی سے مرے ہیں اور کسی

بیماری سے نہیں مرے' چنانچہ اس کو بھی اس میں شامل کرلیا۔

سوال: اس ہسپتال کے بعد آپ کا اگلا منصوبہ کیا ہے؟

ابرارالحق: میں سکول بنانا چاہتا ہوں جو صرف ڈگری ہولڈر نہ پیدا کریں بلکہ بامقصد تعلیم دیں۔ بچوں میں نیشنلزم پیدا کریں۔

سوال: ہسپتال بنانے کے بعد کہیں آپ کا ارادہ بھی سیاست کی طرف آنے کا تو نہیں؟

ابرارالحق: ہرگز نہیں...... میں صرف سوشل کاموں کی طرف اپنے آپ کو محدود کرنا چاہتا ہوں۔

سوال: اگر آپ گلوکاری میں نہ ہوتے تو کیا اس وقت بھی آپ کے دل میں ایسا ہی جذبہ ہوتا؟

ابرارالحق: جی ہاں! بالکل ہوتا...... مگر اس شعبہ میں ہونے سے بہت آسانی پیدا ہوگئی ہے ورنہ بہت مشکل پیش آتی۔

سوال: آپ کے ساتھ اس ہسپتال کی تعمیر میں کس قسم کے لوگوں نے تعاون کیا؟

ابرارالحق: میں نام نہیں لینا چاہتا۔ میرے ساتھ بہت سے لوگ کھلے دل کے ساتھ تعاون کررہے ہیں۔ بالخصوص چھوٹے چھوٹے بچے جب چار آنے' آٹھ آنے جمع کرکے مجھے دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابرار بھائی کے ہسپتال میں ایک اینٹ لگانی ہے تو آنکھوں میں خوشی کے آنسو آجاتے ہیں دراصل یہاں جذبہ کی کمی نہیں' لیڈرشپ کی کمی ہے۔

سوال: اب میوزک کے متعلق کچھ اور بات ہوجائے۔ آپ کے گانے فوک ہوتے ہیں' پاپ یا کمبی نیشن؟

ابرارالحق: میں اپنے آپ کو پاپ سنگر سمجھتا ہوں لیکن میں نے کئی بار دونوں کو ملایا ہے۔ لوگ کہتے ہیں میرے گیتوں نے پنجابی زبان کو دوبارہ زندہ کردیا ہے۔

سوال: اگر آپ پاپ سنگر ہیں تو ان کی طرح لمبے بال اور پھٹی جینز کیوں نہیں پہنتے؟

ابرارالحق: میں فوک سنگرز کی طرح کے کپڑے بھی تو نہیں پہنتا ویسے بھی یہ تو اپنے موڈ پر منحصر ہوتا ہے۔ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

سوال: اپنے گیتوں میں شاعری کا کتنا خیال رکھتے ہیں؟

ابرارالحق: میں تو شاعری میں گیتوں کا خیال رکھتا ہوں۔ میں نے کشمیر کے حوالے سے جو ترانہ گایا تھا ''یہ علم بغاوت ہے یارو'' وہ میں نے خود ہی لکھا تھا۔

سوال: آپ نے اس حوالے سے اور ترانے کیوں نہیں بنائے؟

ابرارالحق: ملک کے لیے تو جان بھی حاضر ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں اتنی سڑکیں نہیں بنیں جتنے ترانے بنے ہیں۔ میں عملی طور پر کچھ کرنا چاہتا ہوں جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے۔

سوال: آئیڈیل کیا ہے؟

ابرارالحق: (سوچتے ہوئے) ذہین' انڈرسٹینڈنگ اور شریف لڑکی۔

سوال: کیا آپ کی اہلیہ میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں؟

ابرارالحق: میری اہلیہ میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کی میں ماضی میں تمنا کیا کرتا تھا۔

سوال: شادی کے بعد آپ کی زندگی میں کیا انقلاب برپا ہوا؟

ابرارالحق: اب جلدی گھر جانے کو دل کرتا ہے۔

سوال: آپ نے لیکچررشپ کو زیادہ انجوائے کیا یا گلوکاری کو؟

ابرارالحق: اس کا اپنا ایک مزہ ہے اور گلوکاری کا بھی اپنا ہی چارم ہے۔ مجھے چیلنج قبول کرنا اچھا لگتا ہے۔ اس میں بھی چیلنج تو ہوتا ہے مگر محدود جبکہ گلوکاری میں لامحدود چیلنجز ہیں۔ میں ویسے بھی اپنے گانے کو صرف تفریح نہیں بنانا چاہتا میں تو اس سے آگے جانا چاہتا ہوں۔ گلوکاری کو اپنے مشن کی تکمیل اور انسانیت کی بہبود کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

سوال: آپ کے دل میں "سہارا" کا آغاز کب اور کیسے پیدا ہوا؟

ابرارالحق: "سہارا" کا آغاز لوگوں کو صحت و تعلیم کی سہولیات سے آراستہ کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اس کا آغاز 15 جون 1998ء کو ہوا۔ ہمارا بنیادی مقصد یہی تھا کہ ہم ایسے ہیلتھ سنٹرز کا جال بچھائیں جو غریب لوگوں کو مفت طبی سہولیات فراہم کریں اور ایسے تعلیمی مراکز قائم کریں جو محروم لوگوں کو مفت بنیادی تعلیم سے آراستہ کریں۔

سوال: اپنے اس ہسپتال کے بارے میں کچھ قارئین کو بتانا پسند کریں گے؟

ابرارالحق: صغریٰ شفیع ہسپتال "سہارا" کا پہلا پراجیکٹ ہے۔ اس کے لیے تقریباً پانچ ایکڑ زمین حاصل کر کے 16 اکتوبر 2000ء کو کام شروع کیا گیا تھا جو خدا کے فضل سے پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے ہسپتال کا بنیادی مقصد موذی امراض (Tropical Diseases) سے نمٹنا تھا یہاں پر زچگی کے دوران ماؤں کی اموات کو کم سے کم کرنے کے لیے ماں اور بچے کو معیاری اور مفت طبی امداد دینا پہلی ترجیح تھی اور اس کے بعد TB جیسے موذی مرض کا علاج بہت اہم تھا۔ یہ 55 بیڈ کا ہسپتال ہے جس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹروں کی خدمات موجود ہیں۔

سوال: آپ نے ہسپتال کے لیے نارووال کا انتخاب ہی کیوں کیا؟

ابرارالحق: نارووال ایک چھوٹا سا علاقہ ہے جہاں پر لوگ غربت کی حد سے بھی نیچے کا معیار زندگی رکھتے ہیں۔ یہاں پر موذی امراض جیسے ٹی بی ہیپاٹائٹس، کینسر اور زچگی کے دوران اموات بہت زیادہ ہیں۔ صحت کی خاص سہولیات میسر نہیں۔ ایمرجنسی کی صورت میں مریض کو گوجرانوالہ یا لاہور جانے کو کہا جاتا ہے اور مریض کبھی وقت اور کبھی پیسے کی کمی کی وجہ سے لاہور پہنچے بغیر ہی دم توڑ جاتا ہے، اس لیے میرے خیال میں اس علاقہ میں ایک ایسے ہسپتال کی اشد ضرورت تھی۔

سوال: آپ کو گھر کی ڈیکوریشن کا شوق ہے؟

ابرارالحق: مجھے آرائش کا بالکل شوق نہیں ہے میں سادگی پر یقین رکھتا ہوں۔

سوال: ناشتہ کہاں کرتے ہیں؟

ابرارالحق: صبح عام طور پر دیر سے ہی آنکھ کھلتی ہے، میں اپنے بیڈ روم میں ہی ناشتہ کرتا ہوں۔

سوال: ناشتہ تیار کون تیار کرتا ہے؟

ابرارالحق: پہلے امی اور بھابی تیار کرتی تھیں اب یہ ڈیوٹی بیگم انجام دیتی ہیں۔

سوال: مہمانوں کا اچانک آنا برا نہیں لگتا؟

ابرارالحق: مہمان تو اللہ کی رحمت ہیں، اگر کوئی اچانک آجائے تو بہت خوشی ہوتی ہے۔

سوال: دوسروں کی دعوت جلد قبول کر لیتے ہیں؟

ابرارالحق: اگر فارغ ہوں تو فوراً قبول کر لیتا ہوں۔

سوال: کھانا تیار کر لیتے ہیں؟

ابرارالحق: مجھے صرف انڈا اور آلو ابالنا آتا ہے ابلے ہوئے آلو میں شوق سے کھاتا ہوں اور اس کے سوا مجھے کچھ پکانا نہیں آتا۔

سوال: گھر سے باہر گھر کی کون سی چیز زیادہ یاد آتی ہے؟

ابرارالحق: بھائی' بہن' بیگم اور سارے گھر والے یاد آتے ہیں اگر میں ملک سے باہر گیا ہوا ہوں تو پورے پاکستان کو یاد کرتا ہوں اس وقت تو اپنا بیگ بھی بہت پیارا لگتا ہے کیونکہ یہ پاکستان سے آیا ہوا ہوتا ہے۔

سوال: غصہ میں آ کر کوئی چیز توڑی ہے؟

ابرارالحق: مجھے بہت کم غصہ آتا ہے ہاں اگر کوئی ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کرے تو مجھے بہت غصہ آتا ہے وہ قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی جو روڈ سینس (Road Sense) نہ رکھتی ہو۔

سوال: بیرون ملک سے گھر والوں کے لیے کیا تحفے لے کر آتے ہیں؟

ابرارالحق: باہر جا کر اتنی مصروفیات ہوتی ہے کہ شاپنگ کے لیے وقت ہی نہیں ملتا۔ عام طور پر چاکلیٹ خرید کر لے آتا ہوں اگر وہ بھی نہ خرید سکوں تو لاہور آ کر لبرٹی مارکیٹ سے گھر والوں کے لیے تحفے خرید لیتا ہوں اور انہیں بتا بھی دیتا ہوں کہ یہ وہ تحفے نہیں ہیں جو میں نے برطانیہ سے خریدنے تھے اب یہ یہیں سے خریدے ہیں۔

سوال: آپ کو خواب کیسے آتے ہیں؟

ابرارالحق: میں اپنے خاندان میں سچے خواب دیکھنے کے لیے مشہور ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میں جو خواب دیکھتا ہوں وہ پورا ہو جاتا ہے۔ بہت سال پہلے میرے ایک دوست کی والدہ کا انتقال ہوا تھا جس دن ان کا انتقال ہوا اس سے ایک رات قبل میں نے اپنے خواب میں دیکھا تھا اور ایک دوسرے دوست کو اس کے بارے میں بتایا بھی تھا کچھ عرصہ پہلے میں نے خواب میں دیکھا کہ میں میدان عرفات میں ہوں اور وہاں پر بے شمار انسان چاول کے دانوں کی مانند زمین پر سفید کفن لپیٹے ہوئے پڑے ہیں۔ اس خواب کے فوراً بعد میں حج پر چلا گیا حالانکہ میرا اس وقت حج پر جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

سوال: مزاجاً نرم ہیں یا سخت؟

ابرارالحق: (سوچتے ہوئے) میں مزاجاً سخت مزاج ہوں لیکن میں اپنی سخت مزاجی سے مسلسل جہاد کرتا رہتا ہوں اور خود کو نرم مزاج بنائے رکھتا ہوں میں نے کبھی بھی اپنی سخت مزاجی کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا۔

سوال: گھر سے باہر کھانے کو دل چاہے تو کہاں جاتے ہیں؟

ابرارالحق: میں نے لاہور کا شاید ہی کوئی ریسٹورنٹ چھوڑا ہو۔ ویسے مجھے ولیج ریسٹورنٹ پسند ہے اس کے علاوہ لکشمی چوک سے کڑاہی گوشت اچھا مل جاتا ہے۔

سوال: شاپنگ کے دوران دکاندار نرخ کم کر دیتے ہیں یا زیادہ؟

ابرارالحق: بعض اوقات کم کر دیتے ہیں اور بعض اوقات بڑھا دیتے ہیں۔

سوال: اسٹار بننے کا سب سے بڑا فائدہ کیا ہوا؟

ابرارالحق: میرے خیال میں اپنے پرستاروں کی جانب سے مجھے بہت دعائیں ملتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ اپنی والدہ کے انتقال کے بعد میں نے ریڈیو پر انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ میرے چاہنے والے میرے لیے دعائیں کریں۔ اس روز سے لے کر آج تک میرے لیے عوام کی بہت دعائیں ہوتی ہیں۔ میرے خیال میں یہ سٹار بننے کا سب سے بڑا فائدہ ہے۔

سوال: شاپنگ کہاں سے کرتے ہیں؟

ابرارالحق: اچھی چیز جہاں سے ملے خرید لیتا ہوں یہ نہیں دیکھتا کہ یہ چیز مہنگی ہے یا سستی۔

سوال: کبھی رشوت دی ہے؟

ابرارالحق: آج تک ایسا نہیں کیا۔

سوال: کس بات پر بحث کرتے ہیں؟

ابرارالحق: میں عام طور پر بحث سے گریز کرتا ہوں لیکن جہاں پر کوئی شخص بلا جواز گفتگو کرے اور تکلیف دہ حد تک حقائق کو مسخ کرے تو پھر بھرپور جواب دیتا ہوں پھر میں یہ نہیں دیکھتا کہ دوسرا شخص کتنے اثر ورسوخ کا حامل ہے میں اپنی بات بھرپور طریقے سے کرتا ہوں۔

سوال: کسی چیز پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں؟

ابرارالحق: میرے خیال میں رفاحی کاموں پر دل کھول کر خرچ کرتا ہوں۔ سہارا ٹرسٹ ہسپتال کے لیے میں نے زمین بطور عطیہ دی ہے۔ اس کے دفتر کے لیے سارا ساز وسامان میں نے بطور عطیہ دیا ہے۔ اس کے علاوہ میری آمدنی میں سے چوتھا حصہ سہارا کے فنڈز میں جمع ہوتا رہتا ہے۔

سوال: اپنی بچت کا کیا کرتے ہیں؟

ابرارالحق: بچت بنک میں بھی جمع ہوتی رہتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ انسان کو اچھی زندگی گزارنا چاہیے اس کے پاس نارمل سا گھر اور آرام دہ گاڑی ضرور ہونا چاہیے لیکن میں دولت جمع کرنے اور دولت کے انبار لگانے کے خلاف ہوں۔ انسان کو اپنی جائز ضرورتیں پوری کرنے کے بعد باقی پیسے سے معاشرے میں فلاحی کام کرنے چاہئیں ہم نے اس دنیا میں کچھ عرصہ قیام کرنا ہے اور پھر قبر میں چلے جانا ہے۔ یہ سب کچھ یہیں رہ جائے گا پھر کیوں نہ اپنے ہاتھ سے یہ سب کچھ مستحقین میں تقسیم کر کے اس دنیا سے رخصت ہوا جائے۔

سوال: ڈرائیونگ خود کرتے ہیں؟

ابرارالحق: جی ہاں میں ڈرائیونگ خود کرتا ہوں۔

سوال: کبھی چالان ہوا ہے؟

ابرارالحق: یونیورسٹی دور میں بہت چالان ہوتے تھے اب عرصہ سے چالان نہیں ہوا۔

سوال: لانگ ڈرائیو کے لیے جاتے ہیں؟

ابرارالحق: اسلام آباد کے لیے اگر فلائٹ نہ ملے تو خود گاڑی لے کر نکل پڑتا ہوں۔

سوال: بہن بھائیوں سے آپ کا رویہ کیسا ہے؟

ابرارالحق: اللہ ہمارے پیار کو نظر نہ لگائے ہم سب بہن بھائیوں میں بہت پیار اور اتفاق ہے۔

سوال: سالگرہ مناتے ہیں؟

ابرارالحق: جی ہاں میں سالگرہ مناتا ہوں اور کیک بھی کاٹتا ہوں۔

سوال: والدین سے ڈانٹ پڑے تو کیسا لگتا ہے؟

ابرارالحق: کسی نے آج تک مجھے کبھی ڈانٹا نہیں۔

سوال: عزیز رشتہ دار آپ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

ابرارالحق: سب کو مجھ پر بہت فخر ہے وہ میرے بارے میں مثبت رائے رکھتے ہیں۔ خاندان میں اکثر معاملات طے بھی کرواتا ہوں اور

اگر کسی کی لڑائی ہو جائے تو صلح بھی کرواتا ہوں۔

سوال: کبھی موت کا خیال بھی آیا ہے؟

ابرارالحق: مجھے اپنی موت ہر وقت یاد رہتی ہے۔

سوال: اپنی کسی خامی سے پریشان ہیں؟

ابرارالحق: میں بہت حساس (Sensitive) ہوں۔

سوال: دولت کی تمنا ہے یا شہرت کی؟

ابرارالحق: مجھے صرف اپنی نیک نامی کی تمنا ہے۔

سوال: کوئی پریشانی درپیش ہو تو کس سے مشورہ کرتے ہیں؟

ابرارالحق: میں بس نماز پڑھتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں۔

سوال: کھانا اگر مرضی کا نہ ہو تو؟

ابرارالحق: صبر و شکر سے کھا لیتا ہوں۔

سوال: کتابیں پڑھتے ہیں؟

ابرارالحق: بہت کم۔

سوال: موجودہ زندگی سے مطمئن ہیں؟

ابرارالحق: الحمداللہ بہت مطمئن ہوں۔

سوال: آٹوگراف دیتے وقت کیا لکھتے ہیں؟

ابرارالحق: ''محبت'' لکھتا ہوں یا کوئی چھوٹا سا لطیفہ بھی لکھ دیتا ہوں۔

سوال: ستاروں اور قسمت کی لکیروں پر یقین ہے؟

ابرارالحق: یہ سارے علوم ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان اپنی محنت سے ہاتھ کی لکیروں کو بدل سکتا ہے۔

سوال: کوئی شخص جو شدت سے یاد آتا ہو؟

ابرارالحق: مجھے اپنی ماں باپ شدت سے یاد آتے ہیں کاش وہ آج دنیا میں ہوتے تو یہ دیکھ کر کتنے خوش ہوتے کہ ان کے نام سے میں نے اتنا بڑا ہسپتال بنایا ہے جس میں ہزاروں غریب مریضوں کا مفت علاج ہو رہا ہے۔

سوال: کوئی لمحہ جس کے گزر جانے کا افسوس اور لوٹ آنے کی تمنا ہو؟

ابرارالحق: کاش میرے ماں باپ اس دنیا میں واپس آ جائیں یہی وہ لمحہ ہے جس کے لوٹنے کی خواہش ہے لیکن یہی اللہ کی مرضی تھی۔

سوال: آپ کی دعائیں قبول ہوتی ہیں؟

ابرارالحق: میری دعائیں اتنی زیادہ قبول ہوتی ہیں کہ میں اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

سوال: حسن فطرت دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟

ابرارالحق: میں قدرتی ماحول سے بہت متاثر ہوں خاص طور پر سہانا موسم مجھے پسند ہے۔

سوال: بچپن کی کوئی یادگار شرارت؟

ابرارالحق: ایک دفعہ بازار میں ایک گنجے سر آدمی کے سر پر ہاتھ پھیر بیٹھا تھا۔ اس نے وہ سنائیں کہ میں نے آئندہ سے یہ حرکت دوبارہ

نہیں دہرائی۔

سوال: ناگواری کا اظہار کیسے کرتے ہیں؟

ابرارالحق: میں کوشش کرتا ہوں کہ کسی کا دل نہ دکھے اس لیے ناگواری کا اظہار نہیں کرتا۔

سوال: مٹی کی خوشبو کیسی لگتی ہے؟

ابرارالحق: میں اس مٹی کی پیداوار ہوں اس کی خوشبو کسے پسند نہیں۔

سوال: جاگتے میں خواب دیکھتے ہیں؟

ابرارالحق: بالکل دیکھتا ہوں' خواب دیکھے بغیر آپ کوئی بھی کارنامہ انجام نہیں دے سکتے۔ علامہ اقبال نے بھی پاکستان کا خواب دیکھا تھا۔

سوال: چاند کو دیکھ کر کیا کہتے ہیں؟

ابرارالحق: سبحان اللہ۔

سوال: ڈائری لکھنے کا شوق ہے؟

ابرارالحق: میرا پرس ہی میری ڈائری ہے۔ میں اپنی ضروری باتیں ڈائری میں بھی لکھ لیتا ہوں اکثر سفر کے دوران اچانک کوئی گانا ذہن میں آجاتا ہے۔ میں اسے فوراً کسی بھی کاغذ میں لکھ کر پرس میں رکھ لیتا ہوں اس کے علاوہ اپنا تمام شیڈول بھی کاغذوں میں لکھ کر پرس میں ہی رکھتا ہوں۔

سوال: اجنبی سے ملاقات کس طرح کرتے ہیں؟

ابرارالحق: میں ہر اجنبی سے محبت سے ملتا ہوں۔

سوال: سڑک پر اگر حادثہ ہوجائے تو آپ رک جاتے ہیں؟

ابرارالحق: ابھی چند دن پہلے کی بات ہے کہ میں نے ایک کنسرٹ میں جانا تھا کہ ایک حادثہ دیکھ کر رک گیا اور زخمی کو ہسپتال لے گیا اتنی دیر میں میرا کنسرٹ بھی ختم ہوگیا اور منتظمین بھی ناراض ہوئے لیکن میں خوش تھا کیونکہ ایک زخمی کی جان تو بچ گئی میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس کا اجر دے گا اس کے فوراً بعد برطانیہ چلا گیا وہاں مجھے بہت اچھا رسپانس ملا اور میرے نقصان کی تلافی کہیں زیادہ ہوگئی۔

سوال: آپ اچھے رازدان ہیں؟

ابرارالحق: جی ہاں۔

سوال: گلوکاری کا شوق کس عمر میں ہوا؟

ابرارالحق: مجھے بچپن ہی سے گلوکاری کا شوق تھا اور یہی وجہ تھی کہ میں سکول کے پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔

سوال: آپ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ میں ایک بہت شہرت یافتہ گلوکار بنوں گا؟

ابرارالحق: نہیں میرے ذہن میں تھا کہ میں پائلٹ اور فوجی بنوں گا۔

سوال: آپ نے بلو کے نام اکثر گیتوں میں شامل کیے ہیں کیا حقیقت میں واقعی کسی بلو سے واسطہ پڑا تھا؟

ابرارالحق: (مسکرا کر) نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔

سوال: آپ کے جتنے بھی البم مارکیٹ میں آئے ہیں ان کے نام آپ خود منتخب کرتے ہیں یا کوئی اور؟

ابرارالحق: جی ہاں میں خود منتخب کرتا ہوں۔

سوال: شاعری کس سے کرواتے ہیں؟

ابرارالحق: شاعری بھی خود ہی کرتا ہوں۔

سوال: آپ کس گلوکار سے زیادہ متاثر ہیں؟

ابرارالحق: میں نصرت فتح علی خان سے بہت متاثر ہوں۔

سوال: آپ نے بہت سے ممالک میں کنسرٹ کیے ہیں کوئی ایسا کنسرٹ جو آپ کی نظر میں یادگار ہو؟

ابرارالحق: ٹورنٹو میں میرے ایک شو میں 30 ہزار سے زائد لوگوں نے شرکت کی تھی جو مجھے ساری عمر نہیں بھولے گا۔

سوال: اب تک تقریباً کتنے ممالک میں پرفارمنس کر چکے ہیں۔

ابرارالحق: بے شمار ممالک میں جن میں امریکہ برطانیہ آسٹریلیا اور دبئی وغیرہ شامل ہیں۔

سوال: دنیا کے بہت سے ممالک کی آپ نے سیر کی ہے۔سب سے خوبصورت ملک کون سا لگا؟

ابرارالحق: اپنا ملک پاکستان۔

سوال: بیرون ملک میں کبھی انگلش گیت گایا؟

ابرارالحق: جی ہاں کئی مرتبہ۔

سوال: انگریزوں کو ہماری زبان سمجھ میں نہیں آتی تو وہ کیسے انجوائے کرتے ہیں؟

ابرارالحق: ڈانس اور بھنگڑا ڈال کر۔

سوال: گلوکاری سے ہٹ کر یہ بتائیں کہ سو کر اٹھتے ہیں تو کیا کرتے ہیں؟

ابرارالحق: غسل کرتا ہوں ناشتہ کرتا اور پھر آفس جاتا ہوں۔

سوال: ناشتے میں کیا پسند کرتے ہیں؟

ابرارالحق: سوکھی روٹی اور رات کا سالن۔

سوال: کیا ایکسرسائز بھی کرتے ہیں؟

ابرارالحق: مسکراتے ہوئے ہاں شام کو کرتا ہوں۔

سوال: کھانے میں کون سی ڈش پسند ہے؟

ابرارالحق: افغانی تکہ اور افغانی پلاؤ پسند ہیں۔

سوال: پھلوں میں کونسا پھل پسند ہے؟

ابرارالحق: آم لیچی اور جامن۔

سوال: رنگوں میں کون سا رنگ پسند ہے؟

ابرارالحق: بلیو بلیک اور گرے۔

سوال: کون سا موسم اچھا لگتا ہے؟

ابرارالحق: سردی کا موسم۔

سوال: بھارت کے ساتھ ثقافتی تعلقات کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ابرارالحق: ہاں ضرور ہونے چاہئیں لیکن یہ یکطرفہ نہیں دونوں ممالک کی طرف سے کوشش ہونی چاہیے۔

سوال: کبھی بھارتی فلم میں کام کرنے کی آفر ہوئی؟

ابرارالحق: جی ہاں مجھے بھارتی فلم ساز ادھم سنگھ نے فلموں میں کام کرنے کی آفر کی تھی لیکن میں نے رد کر دی۔

سوال: مستقبل میں کیا کچھ کرنے کا ارادہ ہے؟

ابرارالحق: اپنے ادارے سہارا کو مزید وسعت دینے کا ارادہ ہے اور اس سلسلے میں مزید ہسپتال تعمیر کروں گا۔

سوال: آج کل گلوکاروں میں عوام کے لیے کام کرنے کا جذبہ نمایاں ہو گیا ہے اس کی وجہ کیا ہے۔ آپ کس جذبے کے تحت کام کر رہے ہیں شہرت کے لیے یا انسانی خدمت کے لیے آئندہ مشن پلاننگ کیا ہے؟

ابرارالحق: شہرت تو مجھے اللہ تعالیٰ نے ویسے ہی بہت دے دی ہے جہاں تک ہسپتال بنانے کا تعلق ہے۔ صغریٰ شفیع ہسپتال کی تعمیر کا جو خواب دیکھا تھا وہ اللہ تعالیٰ نے مکمل کر دیا ہے جس میں ہر مکتبہ فکر کے لوگوں نے میری مدد کی بالخصوص صدر پاکستان جناب پرویز مشرف نے اپنی جیب سے اچھی خاصی رقم میرے پروجیکٹ میں عطیے کے طور پر دی۔ وزیراعلیٰ پنجاب اور گورنر نے بھی تعاون کیا۔ یہ کام میں خالصتاً انسانی خدمت کی وجہ سے کرتا ہوں۔ پوری دنیا میں بچوں کی مشقت کا نفرنس (ورکشاپ) کا انعقاد ہوتا ہے۔ ایسا نہیں کہ بطور فیشن یہ کانفرنسیں ہو رہی ہیں بلکہ ہر آدمی یہ محسوس کر رہا ہے کہ موجودہ دور کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔

ہمارا تعلق ایسے مذہب سے ہے جس میں زندگی گزارنے کے لیے وضع اصول موجود ہیں لیکن ان پر عمل کوئی نہیں کرتا' اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے معروف لوگوں نے انسانی خدمت کے امور کی ذمہ داری سنبھالی ہے کیونکہ ان کی آواز عام آدمی جلدی محسوس کرتا ہے۔ میں جامع پروگرام کے تحت کام کر رہا ہوں جس میں میرا آئندہ مشن یہ ہے کہ پورے ملک میں ہسپتالوں اور سکولوں کا جال بچھایا جائے گا۔ میرا خیال ہے حکومت کی مدد کے بغیر بھی ہم بے شمار کام اپنی ذمہ داری سمجھ کر سکتے ہیں کیونکہ پاکستان ہمارا ملک ہے اور اس ملک کو سنوارنے کی ذمہ داری ہر شہری پر عائد ہوتی ہے۔

سوال: آپ نے جو ہسپتال بنایا اس کی کارکردگی کے بارے میں بتائیں؟

ابرارالحق: لاکھوں مریضوں کا اب تک علاج ہو چکا ہے۔ ہم نے میں وہاں فری آئی کیمپ بھی لگایا تھا جہاں لاہور اور اسلام آباد سمیت بہت سے علاقوں کے لوگوں کی آنکھوں کے آپریشن ہوئے۔ ہم نے اس آئی کیمپ میں لوگوں کو نظر کے فری لینز بھی فراہم کیے۔ اب ہم دماغی امراض کے لیے کیمپ لگا رہے ہیں۔

سوال: ہسپتال بنانے میں کوئی دقت ہوئی؟

ابرارالحق: مجھے ہسپتال بنانے میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا' لیکن میں نے ان مشکلات کی پرواہ نہیں کی کیونکہ ہسپتال بنانا میرا ایک خواب تھا۔ یہ کس قدر دکھ کی بات ہے کہ پاکستان میں ہر 20 منٹ کے بعد ایک ماں طبی سہولیات کی عدم دستیابی کے باعث اس جہان فانی سے رخصت ہو جاتی ہے۔ اس صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے صغریٰ ہسپتال بنانے کی ٹھانی تھی اور پھر زچہ سے متعلق تمام پریشانیوں سے آگاہی اور ان کے تدارک کے سلسلے میں ٹیلی فلم سہارا بنائی جو آگاہی کے علاوہ تفریحی بھی ہوگی۔ اس ٹیلی فلم میں فنکاروں نے بلا معاوضہ کام کیا۔

سوال: صغریٰ شفیع میڈیکل ہسپتال کے حوالے سے آپ کی خدمات سے تو اب ہر پاکستانی آگاہ ہو چکا ہے 8 اکتوبر 2005 کو پاکستان کے وسیع علاقوں میں آنے والے زلزلے اور اس کے نتیجے میں ہونے والی ہولناک تباہی سے متاثرہ لوگوں کی مدد

کے حوالے سے آپ یا آپ کی سربراہی میں سہارا ٹرسٹ نے کیا کارکردگی دکھائی۔

ابرارالحق: 8 اکتوبر کو پاکستان میں آنے والے زلزلے کو اگر قیامت صغریٰ کا نام دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کے نتیجے میں اس قدر تباہی اور بربادی پھیلی کہ چند لمحوں میں ہی شہر اور قصبے قبرستان کا روپ دھار گئے اور ساتھ سے ستر ہزار افراد آناً فاناً ہلاک ہو گئے۔ اس زلزلے کے نتیجے میں جہاں ہزاروں انسانی جانیں ضائع ہوئیں وہاں زندہ بچ جانے باقی افراد در پیش مصیبتوں اور کبھی اپنے جدا ہونے والے پیاروں کو روتے اور کبھی اپنے گھربار کی تباہی پر نوحہ کناں تھے۔ ان حالات میں تمام پاکستانیوں کی طرح ہم نے بھی اپنے مصیبت زدہ دکھی بھائیوں کی مدد کے لیے اپنے تمام وسائل پیش کر دیے۔ سہارا فار لائف ٹرسٹ کی انتظامیہ نے کروڑوں روپوں پر مشتمل فوری طور پر ایک ریلیف فنڈ قائم کر دیا۔ اور مخصوص کردہ رقم سے فوری طور پر ٹینٹ، کمبل، رضائیاں اور کھانے پینے کی اشیاء ٹرکوں میں بھر کر مظفر آباد پہنچائیں۔ جہاں پہنچ کر سہارا اور کرزی کئی ریسکو ٹیمیں تشکیل دی گئیں جنہوں نے متاثرہ اور دشوار گزار علاقوں میں میلوں پیدل سفر کر کے لوگوں کو بستر اور کھانے پینے کی اشیاء پہنچائیں۔ وادی نیلم کے علاقے ''سراں'' میں فوری طور پر فیلڈ ہسپتال نے ہزاروں لوگوں کو روزانہ طبی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اس طرح سہارا فار لائف ٹرسٹ نے دوسرا میڈیکل ہسپتال بالاکوٹ میں قائم کیا وادی نیلم، گڑھی دوپٹہ، رحیم کوٹ، منگلی، بالاکوٹ، ہنگرائی اور ان سے ملحقہ علاقوں میں کھانے پینے کی اشیاء، ٹینٹ اور طبی امداد بہم پہنچائیں۔ میں نے سہارا لائف ٹرسٹ کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر میجر ابرارالحق کے ہمراہ بذات متاثرہ علاقوں میں پہنچ کر نہ صرف وہاں کام کرنے ورکروں کا ہاتھ بٹایا بلکہ اپنی ذات کو ممکن حد تک دکھی انسانیت کے لیے وقف کر دیا۔ ہمیں اس بات کا احساس تھا کہ بلند بالا علاقے جلد ہی شدید سردی کی لپیٹ میں آ جائیں گے۔ اور جو لوگ زلزلے کی منحوس گھڑی میں زندہ بچ گئے ہیں وہ موسمی صعوبتوں کی نذر نہ ہو جائیں۔ چنانچہ ہم نے اپنے رفقا کی مشاورت سے فوری طور پر لوہے کے فریم اور فائبر گلاس کے اشتراک سے ایک گھر کا ڈائزین تیار کیا جسے وزیراعظم پاکستان شوکت عزیز نے سہارا لائف ٹرسٹ کے تیار کردہ گھر اور جذبہ ہمدردی کو بے حد سراہا چنانچہ پاکستان آرمی کی مدد سے 1350 ایسے گھر متاثرہ علاقوں میں پہنچا دیے گئے۔

یہی نہیں بلکہ سہارا لائف ٹرسٹ نے متاثرہ علاقوں میں افسردہ ماحول کو تبدیل کرنے کے لیے بالاکوٹ میں اجتماعی شادیوں کا اہتمام بھی کیا اور 13 جوڑوں کی اہتمام سے شادیاں کروائیں۔ جہیز کے طور پر دلہن کو گھریلو اشیاء اور باراتیوں کے لیے کھانے کا بندوبست بھی کیا گیا۔ بعدازیں مظفر آباد میں ایک تقریب کے دوران پانچ ہزار کمبل بھی تقسیم کیے گئے مصیبت کی اس گھڑی میں سہارا لائف ٹرسٹ کی شاندار خدمات کے اعتراف میں نظریہ پاکستان کونسل نے مجھے بطور چیف ایگزیکٹو 22 مارچ 2006 کو گولڈ میڈل بھی عطا کیا جبکہ صدر پاکستان کی جانب سے تمغۂ ایثار بھی مجھے عطا کیا گیا ہے۔ یہاں میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ مصیبت کی گھڑی اور دکھی انسانیت کی خدمت میں سہارا لائف ٹرسٹ ہر جگہ پیش پیش ہے۔ بلکہ 5 مئی 2006 کو صغریٰ شفیع میڈیکل کمپلیکس نارووال میں ایک فری کیمپ لگایا گیا۔ جس میں 100 کے لگ بھگ پیدائشی معذوروں کے ہونٹوں اور کٹے ہوئے تالوں کے آپریشن کیے گئے۔ اس فری کیمپ میں پورے پاکستان کے لوگ علاج کی غرض سے آئے۔

حال ہی میں انڈونیشیا میں بھی شدید زلزلے نے تباہی مچادی سہارا لائف ٹرسٹ کے زیراہتمام صغریٰ شفیع میڈیکل کمپلیکس کے ڈاکٹروں کی ایک ٹیم زلزلے سے متاثرہ اپنے مسلمان انڈونیشیائی بھائیوں کے دکھوں کا ممکن حد تک مداوا کرنے کے لئے انڈونیشیا گئی۔ اب یہ عوام پر منحصر ہے کہ وہ سہارا لائف ٹرسٹ کے جذبہ خدمت کو کس قدر تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن

ہم نے اپنے طور پر دکھی انسانیت کی مدد کے حوالے سے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

سوال: کامیڈی' فوک اور صوفیانہ کلام کس کو زیادہ محنت سے گاتے ہیں؟

ابرارالحق: ملی نغمات ہوں یا کوئی دوسرا کلام محنت کے بغیر نہیں گاتا۔ عوام کا رسپانس یا پسندیدگی اسے مقبول بناتی ہے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ معیار کو برقرار رکھوں اور اس کے لیے محنت اور لگن کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔

سوال: آپ نے اب تک کتنے لائیو پروگرامز کیے؟

ابرارالحق: صحیح تعداد یاد نہیں۔ لاتعداد پروگرام کیے اندرون بیرون ملک روزانہ یا کئی دن میں پروگرام کرنا پڑتے ہیں۔

سوال: جب پرفارم کررہے ہوتے ہیں تو عوام کا رسپانس آپ پر اثر انداز ہوتا ہے؟

ابرارالحق: یقیناً ان کی تعریف حوصلہ بڑھاتی ہے لیکن جب وہ زیادہ رسپانس نہ دیں تو ان کے اندر جوش جگانے کے لیے ہمیں مزید محنت کرنی پڑتی ہے عموماً ایسا ہوتا نہیں اللہ کے فضل سے ہمیشہ عوام کا بہت پیار ملا۔

سوال: چیرٹی پروگرامز کے لیے وقت نکالتے ہیں؟

ابرارالحق: دوسروں کے کام آنا میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔

سوال: فیملی والے آپ کے کنسرٹ دیکھتے ہیں؟

ابرارالحق: کبھی کبھار......

سوال: شاعری کرتے اور دھنیں بناتے وقت عوام کی چوائس کو مدنظر رکھتے ہیں؟

ابرارالحق: یقیناً ہر طبقہ فکر کے لوگوں کی پسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کچھ لوگ ہلا گلا پسند کرتے ہیں' کچھ سوفٹ میوزک' کچھ صوفیانہ کلام سو سبھی قسم کے لوگوں کی پسند کا خیال رکھتے ہوئے شاعری کرتا ہوں۔

سوال: کیمرے اور ہزاروں لوگوں کا سامنا کرنے میں کیا فرق ہے اور کس جگہ گا کر زیادہ مزہ آتا ہے؟

ابرارالحق: ظاہر ہے عوام کے سامنے گا کر زیادہ مزہ آتا ہے کیونکہ اچھا برا رسپانس فوری مل جاتا ہے۔ ان کی محبتوں اور چاہتوں کا فوری طور پر پتہ چلتا ہے جبکہ کیمرے کے سامنے آپ صرف پرفارم کررہے ہوتے ہیں۔

سوال: آپ کو گلوکاروں میں کون پسند ہے؟

ابرارالحق: نصرت فتح علی خان میرے پسندیدہ گلوکار ہیں' میں ان سے بہت متاثر ہوں۔

سوال: کیا آپ شروع سے ہی پراعتماد تھے کیونکہ بقول آپ کے اپنے بچپن میں آپ زیادہ بات نہیں کرتے تھے؟

ابرارالحق: اسٹیج پر جو اعتماد میرے اندر آیا ہے اس کا کریڈٹ جونیئر ماڈل سکول گجرات کی پرنسپل فریدہ شیخ کو جاتا ہوں۔ انہوں نے مجھے بہت اعتماد دیا پھر میرے والدین کا بھی حصہ ہے۔ مجھے اپنے والدین سے بہت پیار تھا۔ ان کے دنیا سے جانے کے بعد لگتا ہے کہ جیسے میری دنیا سونی ہوگئی ہے خصوصاً میں اپنی والدہ کی کمی بہت شدت سے محسوس کرتا ہوں۔

سوال: کیا آپ کے سبھی بہن بھائی شادی شدہ ہیں؟

ابرارالحق: جی ہاں ہم تین بھائی اور ہماری پانچ بہنیں ہیں۔ سب شادی شدہ ہیں اور میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے سبھی بہنوں او بھائیوں کا بہت لاڈلا ہوں۔

سوال: ٹی وی پر فنکاروں کو کام بغیر سفارش کے مل جاتا ہے؟

ابرارالحق: میرا خیال ہے نہیں ٹی وی پر چند پروڈیوسروں کی اجارہ داری ہے۔ یہ لوگ صرف اپنی پسند کے لوگوں کو ہی ٹی وی پر مواقع

فراہم کرتے ہیں۔

سوال: آئندہ کے عزائم کیا ہیں؟

ابرارالحق: ہسپتال کے بعد ایجوکیشن کے حوالے سے ایسا کام کرنا چاہتا ہوں جو پہلے کبھی نہ ہوا ہو اس کے علاوہ بزرگ شہریوں، بیواؤں اور یتیموں کے لیے ایک رہائشی کالونی بنانے کا ارادہ ہے جس میں انہیں کھانا، رہائش اور میڈیکل کی سہولیات میسر ہوں۔

سوال: آپ کا قیمتی اثاثہ؟

ابرارالحق: میرا ٹیلنٹ۔

سوال: کوئی غلطی جس پر شرمندہ ہوں؟

ابرارالحق: میں شرمندہ نہیں ہوتا کیونکہ غلطیاں انسان سے ہی ہوتی ہیں۔

سوال: زندگی کی ایک خواہش جس کے پورا ہونے تک زندہ رہنے کی خواہش ہے؟

ابرارالحق: میں کوئی ایسا کام کر جاؤں جو ملک وقوم کے لیے بڑا اہم ہو۔ انسانی خدمت کے حوالے سے بھی عظیم تر ہو۔

سوال: انسان مغرور کب ہوتا ہے؟

ابرارالحق: جب وہ خود کو عقل کل سمجھنے لگے۔

ابرارالحق اکثر اپنے گانوں میں کبھی پرتیو کو خود سے شادی کی دعوت دیتے نظر آتے تھے اور کبھی ساری دنیا کو بلو کے گھر جانے کی دعوت دیتے تھے۔ لیکن 25 جون 2005ء کو ابرارالحق کی زندگی میں وہ پُرمسرت لمحہ بھی آ پہنچا جب وہ حقیقت میں اپنی خوابوں کی شہزادی "پرتیو" (جو حریم عابد کے نام سے) ان کی زندگی کا ہمیشہ کے لیے حصہ بن چکی ہے کو بیاہ لائے۔ آیئے اس حوالے سے ان کے بھائی میجر اسرارالحق سے گفتگو کرتے ہیں۔

سوال: کیا یہ شادی ابرارالحق کی پسند سے ہوئی یا ارینج شادی تھی؟

اسرارالحق: یہ شادی خالصتاً ارینج میرج تھی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ابرارالحق شہرت کی جن بلندیوں پر ہے وہ خود بھی اس کا فیصلہ کرسکتا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابرار کا یہ بڑا پن ہے اور خاندانی روایات کی پاسداری کہ ابرارالحق نے شادی کے تمام معاملات حتیٰ کہ لڑکی کے انتخاب تک کا فیصلہ خاندان کے بڑوں کے لیے چھوڑ دیا۔ ابرارالحق چونکہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہے اس لیے بھی اس کو بہت پیار کرتے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ بہت فرماں بردار ہے۔ یہ فرماں برداری کا اظہار ہی تو ہے کہ جب ہم نے اس کے لیے لڑکی پسند کی تو اس نے اس خواہش کا اظہار بھی نہیں کیا کہ وہ لڑکی کو دیکھنا چاہتا ہے۔ بس اتنا پوچھا کہ وہ کیسی ہے ہم نے بتادیا کہ بہت اچھی ہے تو وہ خوش ہوگیا۔

سوال: کیا یہ شادی خاندان میں ہوئی یا خاندان سے باہر؟

اسرارالحق: دراصل یہ شادی خاندان سے باہر ہی کہہ سکتے ہیں۔ ابرارالحق کے لیے رشتے تو بہت آئے لیکن ہمارا نظر انتخاب بریگیڈیئر عابد کا گھر ہی ٹھہرا۔

سوال: کیا یہ شادی سادگی سے ہوئی یا خاندانی تمام رسمیں ادا کی گئیں؟

اسرارالحق: چونکہ بہن بھائیوں میں یہ آخری شادی تھی اس لیے دل کے سبھی ارمان اس شادی میں نکالے گئے۔ شادی سے ایک ماہ پہلے ہی گھر میں ڈھولکی رکھ لی گئی تھی۔ اس ڈھولکی پر خاندان کی عورتوں نے ابرارالحق سمیت شادی کے روایتی گیت گائے۔ مایوں کی رسم میں ابرارالحق کو سرخ اور گولڈن دوپٹے کے سائے میں لاکر سجے ہوئے پیڑے پر بٹھایا گیا۔ تمام بہنوں اور عزیز رشتہ

دار خواتین نے ابرار کے سر پر تیل لگایا۔ اور سر سے نوٹ وارے۔ دلہن کی طرف سے رسماً مہندی ابرار کی بہنیں اور بھابھیاں لے کر آئیں۔ انہوں نے ہاتھوں میں مہندی' پھولوں اور موم بتیوں سے روشن تھال پکڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف ڈھولک بج رہی تھی تو دوسری طرف مہندی کے روایتی گیت گائے جا رہے تھے۔ ابرار یہ پُر مسرت سماں دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ خاندان کی تمام خواتین نے سٹیج پر بٹھا کر ابرار الحق کے ہاتھ پر مہندی لگائی بڑی بوڑھیوں نے ابرار کی بلائیں لیں۔ جب مہندی کی رسم کے اختتام پر میوزک شو شروع ہوا تو خوشی کے اظہار کے لیے ابرار اور اس کے بھی دوستوں نے بھنگڑا ڈالا۔ اس وقت رات کے 4 بج چکے تھے۔

سوال: ابرار الحق کی بارات لاہور سے کب روانہ ہوئی اور بارات کے موقع پر کیا رسومات ادا کی گئیں؟

اسرار الحق: ا گلی صبح ناشتے کے بعد سفر کی تیاری کا مرحلہ شروع ہو گیا۔ ابرار نے بکروں کا صدقہ دیا۔ بھائیوں نے ابرار کے سر پر کلہ پہنایا' ابرار نے ہلکے رنگ کی شیروانی پہن رکھی تھی۔ بھابھیوں نے آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ ابرار نے تمام بھابھیوں کو سونے کے سیٹ تحفے میں دیئے۔ اس کے بعد پانچوں بہنوں کو بھی ابرار کی طرف سے سونے کے سیٹ دیئے گئے۔ لاہور سے بارات سہ پہر چار بجے کھاریاں کے لیے روانہ ہوئی۔ بارات میں وفاقی اور صوبائی وزراء' اعلیٰ فوجی حکام اور ملک کی اہم سیاسی و سماجی شخصیات میں شریک تھیں۔

سوال: پیا کے گھر ابرار الحق کا سواگت کیسا ہوا اور کیا رسمیں ادا کی گئیں؟

اسرار الحق : بارات رات 9 بجے کھاریاں کے آرمی کلب میں پہنچی۔ لڑکی کے والد بریگیڈیئر عابد نے ابرار الحق' خاندان کے تمام بڑوں کے گلے میں ہار ڈال کر استقبال کیا۔ کچھ دیر بعد نکاح پڑھوایا گیا۔ پھر سرخ لباس میں ملبوس دولہن کو سٹیج پر لا کر ابرار کے ساتھ بٹھایا گیا۔ یہیں پر دودھ پلائی کی رسم ہوئی۔ پھر ابرار کی بہنوں نے دولہن کی بہنوں کو سونے کی انگوٹھیاں دیں۔ کھانے کے بعد ابرار الحق اپنی دولہن کو بیاہ کر اپنے گھر لاہور لے آئے۔

سوال: سنا ہے ولیمے والے دن بہت سے لوگ بغیر دعوت کے ہی شامل ہو گئے؟

اسرار الحق: ولیمے کا اہتمام گیریژن گالف کنٹری کلب میں کیا گیا تھا۔ چار ہزار مہمانوں کو مدعو کیا گیا تھا جبکہ انتظام پانچ ہزار افراد کا تھا۔ لیکن ہمیں حیرت اس وقت ہوئی جب چھ ہزار افراد کھانا کھا گئے۔ ہم خوش تھے کہ لوگ ہمارے بھائی ابرار الحق کو اس قدر والہانہ انداز میں محبت کرتے ہیں کہ بلائے بغیر ہی ہماری خوشی میں شریک ہو گئے۔

# صدارتی ایوارڈ تمغہ امتیاز اور تمغہ ایثار یافتہ

## عظیم گلوکار جواد احمد

موجودہ دور کے تقاضوں سے مطابقت رکھ کر شاعری کرنا، دھنیں بنانا پھر تنہا گیت گانا آسان کام نہیں ہے، پھر صوفیانہ کلام میں ایسی شاعری کرنا کہ روح میں اترتی محسوس ہو...... مگر جواد احمد نے پانچ سال کی محنت کے بعد جو نام اور مقام حاصل کر لیا ہے وہ کم خوش نصیبوں کو ملتا ہے اب جواد کا نام صف اول کے گلوکاروں میں لیا جانے لگا ہے اور قابل قدر بات یہ ہے کہ اتنی شہرت نے ان کا دماغ خراب نہیں کیا۔ خوبصورت گیت گا کر اس کی شخصیت مزید نکھر گئی ہے۔ لوگ اس کی ہر ادا کے دیوانے ہیں۔ شاید ہی کوئی روز ایسا جاتا ہو کہ اس کا کوئی پروگرام نہ ہو اور وہ فارغ اپنے کمرے میں بیٹھ کر اپنی مرضی سے انجوائے کرے پھر یونیسف کی پولیو مہم کے سلسلے میں حکومت نے اسے سفیر مقرر کر رکھا ہے وہ تعلیمی حوالے سے بھی کام کر رہا ہے، جس کا مقصد ہر شہری کی تعلیم اس حد تک عام کی جائے کہ وہ ملک کے لیے مفید ثابت ہو سکے۔ اس سلسلے میں جواد نے ایک ٹرسٹ بھی بنایا ہے، جس کا نام "ایجوکیشن فار آل" ہے جو فی الحال ان کی ذاتی آمدنی پر چل رہا ہے۔ یہ کس قدر خوشی کی بات ہے کہ موجودہ دور کے کئی نوجوان گلوکار گائیگی کے ساتھ ساتھ فلاحی کاموں میں بھی بھر پور دلچسپی لے رہے ہیں اور عوام کے دکھوں پر ان سب کا دل بھی تڑپتا ہے، یہ ایک روایت اور اچھی علامت ہے۔ یہی نہیں جواد احمد نے جہاں ایجوکیشن کے فروغ کے حوالے سے ایسے بچوں کو پیسے اور ترغیب دے کر سکول بھیجنے میں مدد کی وہاں انہوں نے 8 اکتوبر 2005 کو آنے والے ہولناک زلزلے کے نتیجے میں تباہ حال لوگوں کی مدد کے لیے قابل ذکر خدمات بھی انجام دیں۔ جن کے اعتراف میں انہیں تمغہ ایثار سے نوازا گیا۔ آیئے ان کی زندگی اور گلوکاری کے حوالے سے ان سے بات کریں۔

سوال: کچھ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بتائیں؟

جواد احمد: میں 29 ستمبر کو لاہور میں پیدا ہوا لہٰذا میرا برج میزان ہے۔ تعلیمی سفر بھی لاہور تک ہی محدود رہا۔ کیتھڈرل سے او لیول کیا اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف ایس سی کرنے کے بعد انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور (UET) میں مکینیکل انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا۔ فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلنے کے ساتھ ساتھ UET کی کرکٹ ٹیم کا کپتان بھی رہا۔ علاوہ ازیں UET کی میوزک سوسائٹی کا صدر بھی رہا۔ میرے والد توقیر احمد گورنمنٹ کالج لاہور شعبہ سیاسیات سے پروفیسر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے ہیں جبکہ والدہ لاہور کالج برائے خواتین میں اب بھی پولیٹیکل سائنس ڈیپارٹمنٹ کی سربراہ ہیں۔

سوال: اس فیلڈ میں آپ کیسے آئے، شوق کی خاطر یا حادثاتی طور پر؟

جواد احمد: گانا میری پہلی محبت ہے، گانے کا شوق تو بچپن سے ہی بہت تھا اکثر گھر میں جب چھوٹا تھا مہدی حسن کا گانا "مجھے کر دے نا دیوانہ" اور انشا کی غزل "انشا جی اٹھو" بڑے شوق سے گاتا تھا لیکن سکول میں شرمیلا بچہ تھا پھر انجینئرنگ کے دنوں میں "جوپیٹرز" کے ساتھ گانے لگ گیا۔ بس شغل میں گاتا تھا۔ ہم ایک کے بعد ایک شو کرتے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سال کے 365 دنوں میں کم از کم 200 شو کرتے اتنے زیادہ شو کرنے کی وجہ سے اکثر میرا گلا بند ہو جاتا۔ مجھے گانے کا اتنا شوق تھا کہ

اس کی وجہ سے میری انجینئرنگ کی ڈگری دو سال لیٹ ہوگئی۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ اب اپنی ڈگری استعمال کردیا آواز، جب میں مکمل طور پر گلوکاری کی طرف آ گیا۔

سوال: ڈگری لیٹ ہوئی تو گھر والوں نے آپ کو ڈانٹا نہیں؟

جواد احمد: نہیں! انہوں نے مجھے کبھی نہیں ڈانٹا، انہیں معلوم تھا کہ اب انجینئرنگ یونیورسٹی میں چلا گیا ہوں تو انشاء اللہ ڈگری تو حاصل کر ہی لوں گا کیونکہ پڑھائی میں اتنا نکما نہیں تھا۔ شروع سے ہی بہت ذہین تھا پھر گلوکاری بھی میرا شوق تھا۔ گھر والوں نے میرے شوق کو دیکھتے ہوئے کبھی کچھ نہیں کہا۔

سوال: آپ کا پہلا البم کب آیا؟

جواد احمد: پہلا البم 2000ء میں آیا اور اب تک بک رہا ہے۔ اس کی کئی لاکھ کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں اور دوسرا البم 2002ء میں مارکیٹ میں آیا۔ وہ بھی دھڑا دھڑ بک رہا ہے۔ تیسرا البم 2004ء میں آیا یہ سب اللہ کا کرم اور والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ آج جو کچھ بھی ہوں صرف انہی کی بدولت ہوں۔

سوال: آپ کے گانوں کے بول کون لکھتا ہے؟

جواد احمد: تمام گانوں کی شاعری میں خود ہی کرتا ہوں کیونکہ میں بہت سوچنے والا بندہ ہوں۔ جب کمپوز کر رہا ہوتا ہوں تو خود بخود بول بنتے جاتے ہیں۔

سوال: اچھا یہ بتائیں آپ کے پہلے البم میں تصوف کے گانے اور پوری کیسٹ میں پنجابی نمبر صرف ایک ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

جواد احمد: بالکل درست! دراصل میں ایسے ہی Thought ful songs پسند کرتا ہوں۔ پنجابی نمبر تو صرف Taste کے لیے ڈالا تھا مگر وہی میری پہچان بن گیا۔

سوال: آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے کہ عوام نے عشق حقیقی سے زیادہ پنجابی نمبر پسند کیے؟

جواد احمد: دراصل لوگوں میں تعلیم کی کمی ہے جس کی وجہ وہ Thoughtful نہیں۔ وہ صرف بیٹ کو دیکھتے ہیں اور جو بیٹ پنجابی کی اٹھتی ہے کسی اور کی نہیں اٹھ سکتی۔ یہ مسئلہ صرف یہاں نہیں باہر بھی ہے۔ میڈونا اور مائیکل جیکسن کے ہٹ ہونے کی بڑی وجہ اٹھتی ہوئی بیٹ ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں یہ رجحان درست ہے؟

جواد احمد: ہرگز نہیں میرے نزدیک تو یہ لمحہ فکریہ ہے۔ اس کی وجہ سے لوگ شاعری کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں اور نہایت سطحی گانوں کو مقبولیت دیتے ہیں لیکن ان گانوں کی مقبولیت بھی وقتی ہوتی ہے۔ ہمیشہ یاد رہنے والے گانے وہی ہوتے ہیں جن کی شاعری بھی مضبوط ہو۔

سوال: اس کی وجہ کیا ہے کہ لوگ اقبال کے کلام کی بجائے ڈانس نمبر پسند کرتے ہیں؟

جواد احمد: دراصل معاشی وسماجی مسائل کی وجہ سے لوگ بے حد تھکے ہوئے ہیں وہ سوچنا نہیں چاہتے۔ لوگ تفریح چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اقبال کے کلام کی بجائے ایسی بیٹ چاہتے ہیں جس پر تھوڑی بہت ہلچل محسوس ہو۔

سوال: لیکن ان تمام باتوں کے باوجود آپ کے دوسرے البم میں تقریباً پانچ گانے پنجابی کیوں ہیں؟

جواد احمد: ظاہر ہے کمرشل وجہ ہے اور لوگوں کی بے حد پسندیدگی۔ لیکن میرے پنجابی گانوں میں بھی شاعری مضبوط ہے۔ میں سطحی گانے نہیں گاتا۔ میری تو گتھی میں پنجابی گانے تھے۔ ''جوپیٹرز'' کے ساتھ بہت گانے گائے بلکہ ان کا تو پنجابی گانا ''سارے

گدے وجوں' بہت ہٹ گیا تھا جو پاکستان کا پہلا پاپولر پنجابی گیت تھا۔

سوال: "جوپیٹرز" کے ساتھ اتنے شو کرنے سے کیا آپ کو کوئی فائدہ ہوا؟

جواد احمد: جی ہاں! بہت زیادہ، ان کے ساتھ شوز کرنے سے میری اچھی خاصی ٹریننگ ہوگئی۔ سٹیج پر لائیو گاتے تھے چنانچہ اب لائیو سے بھی ڈر نہیں لگتا اور زیادہ گانے کا سٹیمنا بھی بن گیا ہے اور وہی بات کہ اب تو میں پنجابی گانوں میں بھی بہت ماہر ہو گیا ہوں۔

سوال: اچھا یہ بتائیں "موسیٰ خان" فلم کا میوزک دے کر کیسا لگا؟

جواد احمد: بہت اچھا! یہ میرے لیے اعزاز ہے کیونکہ پاپ گلوکاروں پر عموماً اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ نصرت فتح علی خاں، عدنان سمیع خان اور صرف میں جنہوں نے خود میوزک دیا اور خود گایا اور خدا کا شکر ہے کہ "موسیٰ خان" کا میوزک فلم سے زیادہ ہٹ ہوا اور میرا پہلا البم اس فلم کی ریلیز کے بعد دوبارہ تیزی سے فروخت ہونا شروع ہو گیا جبکہ میرے دوسرے البم بھی مارکیٹ میں توقع سے زیادہ بک رہے ہیں۔

سوال: آپ کی تربیت میں کس کا زیادہ ہاتھ ہے۔ والد کا یا والدہ صاحبہ کا؟

جواد احمد: نہیں یہ کریڈٹ کسی ایک کو نہیں جاتا بلکہ دونوں کا برابر حصہ ہے۔ تعلیم میں ہمیں والدین نے کبھی نہیں ڈانٹا مگر تربیت میں بہت ڈانٹ پڑی مثلاً کسی سے لڑائی کر لی تو سرزنش ہوگئی وغیرہ

سوال: آپ کتنے بہن بھائی ہیں؟

جواد احمد: ہم چار بہن بھائی ہیں۔ بڑی بہن ہے پھر میں ہوں۔ میرے بعد فواد جو آرکیٹیکٹ ہے اور اس سے چھوٹا بھائی عماد جو ڈاکٹر ہے، میرے بہن بھائی مجھ سے زیادہ اچھے ہیں۔

سوال: والدین سے ڈانٹ پڑتی ہے تو کیا کرتے ہیں؟

جواد احمد: کچھ نہیں اول تو پڑتی نہیں اور اگر پڑ جائے تو چپ کر جاتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ والدین کے آگے اف تک نہ کہو بلکہ اگر مجھ سے والدین ناراض ہو جائیں تو گلے لگ کر انہیں منا لیتا ہوں ویسے بھی جو لوگ ماں باپ سے محبت نہیں کرتے وہ کسی سے بھی محبت نہیں کر سکتے۔

سوال: مرضی کا کھانا کھاتے ہیں یا جو مل جائے؟

جواد احمد: کھانے کے معاملے میں ویسے ہی کافی Selective ہوں۔ کوشش تو کرتا ہوں کہ وہی کھاؤں جو پسند ہو بعض اوقات وہ بھی کھانا پڑتا ہے جو باقی گھر والے کھا رہے ہوں۔

سوال: بچپن کی کونسی عادت بری لگتی ہے؟

جواد احمد: بچپن میں لڑائیاں بہت کیں اور اس کی وجہ سے سکول سے سزا بھی ملی بلکہ اب بھی کسی کی بات بری لگے تو لڑنے کا دل کرتا ہے۔ یہ کوئی اچھی عادت نہیں لیکن اب سوچتا ہوں کہ یہ لڑائی جھگڑے والی عادت مجھ میں بہت بری تھی۔

سوال: اچھا! جب پریشان ہوں تو اپنی پریشانی کس سے شیئر کرتے ہیں؟

جواد احمد: اول تو شیئر کرتا نہیں، ہاں اگر بہت زیادہ پریشان ہوں اور کچھ سمجھ نہ آ رہی ہو کہ اب کیا کروں تو صرف اپنے والدین سے شیئر کرتا ہوں۔

سوال: آپ اچھا سنگر کسے کہتے ہیں؟

جواد احمد: صرف اچھی آواز ہونا اچھے گانے کی ضمانت نہیں۔ اچھی آواز کے ساتھ تکنیکی مہارت اور سروں کی سمجھ بھی ضروری ہے۔

سوال: بیرون ملک دورے پر کس چیز کی کمی محسوس کرتے ہیں؟

جواد احمد: میں تو اپنے وطن کو بالخصوص لاہور کو بہت یاد کرتا ہوں۔ مجھے لاہور سے بہت پیار ہے۔ یہاں کی سڑکوں، گلیوں، درختوں سب کو بہت مس کرتا ہوں۔

سوال: شدید غصہ میں کیا کرتے ہیں؟

جواد احمد: غصہ نکال دیتا ہوں۔ پہلے تو لڑ پڑتا تھا۔ اب لڑتا نہیں ہوں لیکن بول بال کر اپنا غصہ ضرور نکال دیتا ہوں، البتہ والدین کے معاملے میں چپ کر جاتا ہوں۔

سوال: خواب دیکھتے ہیں؟

جواد احمد: سوچتے ہوئے...... سوتے میں تو نہیں جاگتے میں ضرور دیکھتا ہوں لیکن ہر حال میں اللہ کی رضا پر راضی ہوتا ہوں مجھے اس بات پر یقین ہے کہ اس کی رضا پر راضی ہونا ہی عقلمندی ہے اور وہ اسی کو پسند کرتا ہے۔

سوال: کبھی ٹریفک پولیس وغیرہ کو کوئی چھوٹی موٹی رشوت دی؟

جواد احمد: نہیں! میں نے تو کبھی رشوت نہیں دی مگر میرے خیال میں پولیس والوں کا رشوت لینا کوئی اتنا غلط بھی نہیں۔ مجھے ان لوگوں پر ترس آتا ہے۔ بہت تھوڑی تنخواہ میں یہ دن رات کام کرتے ہیں پھر بیوی بچوں، ماں باپ، سب کی محبت سے محروم یہ لوگ ظاہر ہے تھوڑا سا سخت دل بھی ہو جاتے ہیں۔ کبھی تھانے جا کر دیکھیں کیسے لائن سے چار پائیاں بچھا کر وہ بیچارے چھوٹے سے کمرے میں بے سدھ پڑے ہوتے ہیں، اس لیے کوئی انہیں سنگدل کہے یا رشوت لینے پر گالیاں دے۔ تو یہ بات درست نہیں۔ ان پر تنقید کرنے سے پہلے ان کی تنخواہیں بڑھانا بہت ضروری ہے۔

سوال: کبھی کسی بات پر پچھتائے ہوں؟

جواد احمد: بالکل! جب بھی کسی سے زیادتی کرتا ہوں بعد میں بہت پچھتایا ہوں کیونکہ میری تربیت ہی ایسی ہوئی ہے کہ کبھی کسی سے زیادتی نہ کروں۔ جب کبھی دانستہ یا نادانستہ ہو جائے تو بہت پچھتاتا ہوں۔

سوال: فضول خرچ ہیں یا اعتدال پسند؟

جواد احمد: اپنے اوپر تو کوئی خاص خرچ نہیں کرتا البتہ لوگوں کی مدد کے لیے خرچ کرنے کو دل چاہتا ہے کیونکہ میں فطرتاً غریب اور انسان دوست ہوں۔

سوال: کیا آپ کے خیال میں عشق ضروری ہے؟

جواد احمد: جی ہاں! عشق بہت ضروری ہے اور اس کی کئی صورتیں ہیں۔ ضروری نہیں کہ عشق لڑکی سے ہی ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ سے بھی عشق ہوتا ہے، گھر والوں، والوں اور پرستاروں کے علاوہ کسی سے بھی ہو سکتا ہے۔

سوال: لیکن ہم عشق مجازی کی بات کر رہے ہیں؟

جواد احمد: ہاں! اگر آپ کو ایسی مددگار خاتون مل جاتی ہے جو آپ کی ترقی میں اضافہ کا باعث بنے تو یہ بھی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ ہر آدمی کی ترقی کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے، چاہے وہ عورت ماں ہی کیوں نہ ہو۔

سوال: یہ بتائیں کہ شادی کب کریں گے؟

جواد احمد: (مسکراتے ہوئے) ابھی تو اس بارے میں سوچا نہیں۔ بہرحال دیکھیں یہ تو دل کے اوپر منحصر ہے جب کہے۔

سوال: شادی اپنی پسند سے کریں گے یا گھر والوں کی مرضی سے؟

جواد احمد: میری پسند ہوگی لیکن اس میں گھر والوں کی مرضی بھی ضرور شامل ہوگی۔ جب مجھے کوئی خاتون ایسی لگی جس کے ساتھ شادی کرنی چاہیے تو اس سے پوچھ لوں گا اگر وہ بھی مجھ سے شادی کرنے پر راضی ہوئی تو کر لیں گے لیکن ایسی شادی جو گھر والوں کی مرضی کے خلاف ہو اس کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا ہوں۔

سوال: خواتین کی آزادی کے کس حد تک قائل ہیں؟

جواد احمد: سب سے پہلے خواتین کو Educate کرنے کی ضرورت ہے۔ انہیں تعلیم دیں اور اچھی تربیت کریں۔ اس سے انہیں خود شعور آجائے گا کہ اب انہیں کیا کرنا ہے، پھر دین کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے جیسی آزادی وہ مانگیں دے دینی چاہیے۔

سوال: مستقبل کے کیا ارادے ہیں؟

جواد احمد: میں کوئی نیکی کا کام کرنا چاہتا ہوں، میں اپنے ملک کے مسائل حل کرنا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک نیکی کی تعریف وہ نہیں جو باقی لوگوں کے نزدیک ہے۔ صرف گلی میں ایک پیاسے کتے کو پانی پلا دیا تو لوگ اسے بھی کہتے ہیں کہ ہم نے نیکی کی ہے مگر میں کسی اور قسم کی نیکی کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہاں ہر سطح پر مساوی تعلیم متعارف کروانا چاہتا ہوں۔

سوال: مساوی تعلیم کا مطلب کیا ہے؟

جواد احمد: اس کا مطلب ہے برابری کی سطح پر تعلیم دینا یعنی میں چاہتا ہوں کہ سب کو یکساں تعلیم ملے، امیر کو بھی اور غریب کو بھی، اور ان بچوں کو بھی جو سارا دن خود محنت کرتے ہیں۔ ان کا بھی تعلیم پر اتنا ہی حق ہے جتنا امیر آدمی کے بچے کا۔ اس کے علاوہ تعلیم با مقصد ہونی چاہیے جس میں تربیت بھی شامل ہو۔

سوال: آپ نے تعلیم کے مسئلہ کا ہی انتخاب کیوں کیا؟

جواد احمد: اس لیے کہ میرے خیال میں اس وقت پاکستان کا سب سے بڑا ہی مسئلہ تعلیم ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ یہ منصوبہ آسان نہیں ہوگا کیونکہ کئی لوگوں کے مفاد اس سے وابستہ ہیں کہ عوام ناخواندہ رہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ صحت کا مسئلہ بھی اتنا اہم نہیں جتنا تعلیم کا ہے اب وہ وقت آگیا ہے کہ تعلیمی انقلاب لایا جائے اگر اب بھی تعلیمی انقلاب نہ آیا تو خونی انقلاب آئے گا۔

سوال: آپ نے اس ٹرسٹ کا نام تو سوچا ہوگا؟

جواد احمد: اس ٹرسٹ کا نام تعلیم فار آل ہے۔

سوال: آپ سائنس و ٹیکنالوجی پر ہی اتنا زور کیوں دے رہے ہیں؟

جواد احمد: ہمارے پیش نظر صرف سائنس یا ٹیکنالوجی نہیں ہے بلکہ لسانی تعلیم اور سوشل سائنس بھی اس میں شامل ہے۔

سوال: اس منصوبے کا باقاعدہ اعلان کب تک کرنے کا ارادہ ہے؟

جواد احمد: مجھے یقین ہے جب بھی اس کا آغاز کیا گیا قوم میرا ساتھ دے گی۔

سوال: کیا یہ منصوبہ صرف لاہور کے لیے ہوگا؟

جواد احمد: نہیں! صرف ہیڈ آفس لاہور میں ہوگا۔ ہمارا اصل مقصد دیہاتوں اور چھوٹے چھوٹے قصبوں میں سائنس کی جدید تعلیم کو پہنچانا ہے اور انشاء اللہ ہم اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔

سوال: 8 اکتوبر 2005 کو پاکستان میں جو ہولناک زلزلہ آیا اور اس کے نتیجے میں ہنستے بستے ہزاروں گھر قبرستانوں میں بدل گئے دکھی اور مصیبت زدہ ہم وطنوں کی مدد کے لیے آپ نے کیا خدمات سرانجام دیں؟

جواد احمد: یہ درست ہے کہ 8 اکتوبر کو آنے والا زلزلہ ہماری زندگی کا شدید اور بدترین زلزلہ تھا۔ آناً فاناً سب کچھ تبدیل ہوگیا۔ وہ

خوبصورت وادیاں جو کبھی دنیا بھر میں اپنی خوبصورتی اور ماحولیاتی دلکشی کے اعتبار سے مشہور تھیں اور وہاں کے حسن کو ایک نظر دیکھنے کے لیے دنیا بھر کے سیاح کھینچے چلے آتے تھے چند سیکنڈوں میں وہ سب ملبے کا ڈھیر بن گئے۔ شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس کا کوئی نہ کوئی فرد اس ہولناک زلزلے کی نذر نہ ہوا چنانچہ اس دکھ بھری گھڑی میں جہاں تمام پاکستانی اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہوئے وہاں میرا دل بھی اپنے ہم وطنوں کے غم میں خون کے آنسو روتا رہا۔ لیکن صرف رونے سے کچھ نہیں ہوتا چنانچہ اپنی تنظیم کے پلیٹ فارم پر میں نے متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا اور ممکن حد تک ان کی نہ صرف فوری مدد کی بلکہ بالاکوٹ، مانسہرہ، مظفر آباد اور باغ کے علاقوں میں اڑھائی سو کے لگ بھگ (شیلٹر ہوئز) گھر بھی فراہم کر دیے۔ اب بھی ہمارے کارکن ان علاقوں میں تعلیم سے متعلقہ ذمہ داریاں پوری کر رہے ہیں۔ میں نے یہ سب کچھ کر کے کوئی احسان نہیں کیا بلکہ ایک محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے اپنے ہم وطنوں کے لیے یہ میرا معمولی سا خراج تھا۔ جس کا اظہار میں نے دکھ کی اس گھڑی میں کیا میری انہی خدمات کی بوقت صدر پاکستان نے مجھے تمغہ ایثار سے نوازا۔

سوال: آپ "ایجوکیشن فار آل" کے نظریے کو کہاں تک نافذ کر چکے ہیں اور مستقبل میں آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟

جواد احمد: تعلیم فار آل نے بنیادی تعلیم کے میدان میں ایک کامیاب ماڈل کی شکل دی لیکن ہمارے نزدیک تعلیم کا مطلب وسیع معنوں میں ہے اس میں پورے معاشرے کی تعلیم ہے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے صرف استاد ہی نہیں بلکہ پڑھے لکھے افراد کا فرض ہے کہ وہ تعلیم کا کام کرے اور اس کے لیے روایتی طریقہ کار بھی کافی نہیں بلکہ ایک لحاظ سے ایسی تعلیم ہے جس کے ذریعے معاشرے بذات خود انسانی اقدار کے حصول اور ان کی تکمیل کے لیے اپنی سمت کا تعین کرنے کے قابل ہو سکے۔ تعلیم فار آل ٹرسٹ اپنے اس اگلے مرحلے کا آغاز کر رہا ہے جسے ہم نے ٹیلنٹ بینک آف پاکستان کا نام دیا ہے۔ ٹیلنٹ بینک آف پاکستان بالکل ایک بینک کی طرح ہی کام کرے گا لیکن اس میں ہم معاشرے کے قابل، ذہین اور اپنے اپنے شعبوں میں اعلیٰ استعداد کے مالک لوگوں کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کو جمع کر کے ان کے تجزیئے اور تجربے کے بعد صحیح شعبوں میں ان کی افادیت کے بارے منصوبہ بندی کریں گے اور انہیں سمت مہیا کریں گے۔ پاکستان میں اعلیٰ دماغ اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک افراد کی کمی نہیں لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کو تلاش کر کے ایک دھارے کی شکل دی جائے اور ایک مربوط اور باقاعدہ سسٹم کے ساتھ جوڑا جائے تاکہ انفرادی سطح پر یہ قابلیتیں بے سمتی کا شکار ہو کر ضائع نہ ہو جائیں۔ ٹیلنٹ بینک آف پاکستان بنیادی طور پر تین حصوں پر مشتمل ہو گا جن میں فیوچر بینک، یوتھ بینک اور برین بینک شامل ہیں جبکہ ٹیلنٹ بینک میں متعدد کمیٹیاں بھی قائم کی جائیں گی جس میں اپنے اپنے شعبے کے ماہر لوگ شامل ہوں گے جو ملک وقوم کے حقیقی مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے اور مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کریں گے۔ ان میں ایجوکیشن، ہیلتھ کیئر، سمال بزنس، لیگل، انجینئرنگ انفراسٹرکچر اور ایڈورٹائزنگ اینڈ میڈیا شامل ہیں۔ کمیٹیاں تشکیل دیتے ہوئے ہم اس بات کا خاص خیال رکھیں گے کہ ہمارے ممبران تعلیمی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ کردار کے حامل اور وطن کو محبت کرنے والے ہوں۔ ہماری یہ کمیٹیاں ہر ضلع میں موجود ہوں گی جو کہ مرکزی کمیٹی سے رہنمائی حاصل کریں گی اور ایسے باصلاحیت لوگوں کو اپنے پلیٹ فارم پر لانے کے لیے ہم نے ایک خصوصی ویب سائٹ بنائی ہے جو کہ بہت جلد لانچ کر دی جائے گی۔

سوال: کیا آپ کو یقین تھا کہ شہرت کی دیوی اس قدر اور اتنی جلدی آپ پر مہربان ہو جائے گی؟

جواد احمد: بالکل یقین نہیں تھا۔ یہ سب اللہ کا کرم اور پرستاروں کی مہربانی ہے۔

سوال: کیا آپ نے باقاعدہ گانا سیکھا ہے۔ ریاض کرتے ہیں؟

جواداحمد: باقاعدہ سیکھا نہیں مگر استادوں کو بہت سنا۔ بچپن سے گاتے، گاتے ریاض بھی ہو گیا۔ میں نے استاد امانت علی، میڈم نور جہاں، نصرت فتح علی، مہدی حسن، استاد سلامت علی خان طفیل نیازی، لتا منگیشکر، کشور کمار، محمد رفیع اور بہت سے دوسرے سینئر گلوکاروں کو سنا اور ان سے بہت سیکھا؟

سوال: اب تک آپ کے کتنے البم آ چکے ہیں؟

جواداحمد: اب تک میرے تین البم آ چکے ہیں۔ تیسرے البم کا نام ''جند جان سوہنیئے'' ہے چوتھا البم آنے میں ابھی وقت لگے گا۔

سوال: آپ کے گیتوں میں اکثر خوابوں کی رانی کا ذکر ملتا ہے۔ یہ بتائیں وہ ''خوابوں کی رانی'' کون ہے؟

جواداحمد: شاعری میں خود کرتا ہوں۔ ''خوابوں کی رانی'' ابھی ملی نہیں۔ یہ سب فرضی گیت ہوتے ہیں۔

سوال: کیا کلاسیکی موسیقی کے بغیر گلوکاری ادھوری ہے؟

جواداحمد: بالکل نہیں۔ اپنا اپنا ٹیسٹ ہوتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ سُر ہونا چاہیے جو آپ گا رہے ہیں وہ لوگوں کی سمجھ میں آنا چاہیے۔ کیا ''اے نیر'' کی گلوکاری مشہور نہیں ہوئی۔

سوال: کہاں تک جانا چاہتے ہیں۔ کیا منزل ہے۔ اس فیلڈ میں کس سے متاثر ہیں؟

جواداحمد: کچھ پتہ نہیں ہے۔ منزل بہت آگے ہے۔ میں کسی سے متاثر نہیں ہوں۔

سوال: پاکستان میں پوپ میوزک کا کیا مستقبل دیکھتے ہیں؟

جواداحمد: پوپ میوزک کا مستقبل بہت اچھا ہے مگر آپ عوام کو پرکھ دیں۔ موسیقی اچھی ہو گیت اچھے ہوں جو کانوں کو بھلے لگیں۔

سوال: اگر کوئی لڑکی اچانک کہہ دے I Love You تو کیا کہیں گے؟

جواداحمد: میں سمجھوں گا کہ وہ بہت بیوقوف لڑکی ہے۔ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے اظہار محبت کا۔

سوال: پرستار لڑکیوں کے فون آتے ہوں گے۔ کیا جواب دیتے ہیں؟

جواداحمد: کبھی کو آتے ہیں۔ مجھے بھی فونز آتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ بس آپ میرے لیے دعا کریں۔

سوال: لوگ کہتے ہیں کہ زیادہ شہرت مل جانے پر آپ مغرور ہو گئے ہیں۔ آپ پرستاروں اور صحافیوں سے الجھ پڑتے ہیں۔ کیا شہرت نے آپ کا بھی دماغ خراب کر دیا ہے؟

جواداحمد: میں بالکل مغرور نہیں ہوں بلکہ اس فیلڈ میں آنے سے پہلے میں سخت مزاج تھا مگر اب میں سمجھتا ہوں کہ لوگوں کا مجھ پر حق ہے۔

سوال: آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آج کے دور میں گلوکار کو معاشی تحفظ میسر ہے۔ آپ گلوکاری سے گھر کا چولہا جلا سکتے ہیں؟

جواداحمد: بالکل، معاشی تحفظ میسر ہے دیگر شعبوں کی طرح گھر کا چولہا جلایا جا سکتا ہے۔

سوال: اپنے ہم عصر کن گلوکاروں کو پسند کرتے ہیں؟

جواداحمد: مجھے نجم شیراز اور سجاد علی پسند ہیں۔ اچھا گاتے ہیں اور سر میں گاتے ہیں۔

سوال: کبھی فلموں میں آنے کا سوچا اگر آپ ہیرو آ جائیں تو معمر رانا اور شان کی چھٹی کرا سکتے ہیں؟

جواداحمد: میرے خیال میں جو کام وہ کر رہے ہیں بہتر کر رہے ہیں اور جو کام میں کر رہا ہوں وہ بھی صحیح کر رہا ہوں۔

سوال: سیاست میں آنے کا کبھی سوچا؟

جواداحمد: کبھی نہیں۔

سوال: کبھی "محبت" کی؟

جواد احمد: محبت کبھی کرتے ہیں۔ مجھے اپنے والدین، بہن بھائیوں، وطن اور عوام سے محبت ہے۔

سوال: حلقہ دوستی وسیع یا محدود ہے۔ آپ کا برتھ سٹار کیا ہے؟

جواد احمد: میرے خاص دوست بہت کم ہیں۔ برتھ سٹار لبرا (میزان) ہے۔

سوال: کبھی ڈپریس ہوتے ہیں تو ڈپریشن دور کس طرح کرتے ہیں؟

جواد احمد: میں بھی انسان ہوں، ڈپریس ضرور ہوتا ہے مگر خود بخود نارمل بھی ہو جاتا ہے۔

سوال: پسندیدہ کلر، پسندیدہ موسم، پسندیدہ ڈش؟

جواد احمد: کلر میں بلیک، بلیو، ریڈ پسند ہے۔ سبھی موسم اچھے لگتے ہیں۔ پسندیدہ ڈش بریانی پلاؤ۔

سوال: آپ کی کامیابی میں کیا چیز اہمیت رکھتی ہے؟

جواد احمد: محنت، لگن، ایمانداری، والدین کی دعائیں۔

سوال: آپ کے ساتھ پریس کا رویہ کیسا ہے؟

جواد احمد: پریس کا رویہ بہت اچھا ہے مگر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ بغیر تصدیق کے خبر نہ لگائیں اس سے اخبار کی کریڈبلٹی بھی متاثر ہوتی ہے اور دوسرے کی شخصیت بھی۔

سوال: آپ نے جوپیٹرز کے ساتھ کتنے لائیو پروگرامز کیے؟

جواد احمد: میں نے تقریباً ایک ہزار تک پروگرام کیے اور کسی سفارش کے بغیر کام کیا پھر جب سوچا کہ الگ سے کام کروں تو علیحدہ ہو گیا اور پچھلے چار سالوں سے (Solo Cariere) الگ پروگرام کر رہا ہوں۔

سوال: اپنا گروپ کیوں نہیں بنایا؟

جواد احمد: گروپ کی نسبت انسان انفرادی طور پر اپنی صلاحیتوں کا زیادہ بہتر طریقے سے اظہار کرتا ہے اور پھر اپنی محنت کا پورا پورا صلہ بھی موصول ہو جاتا ہے۔ جن دنوں میں گروپ کے ساتھ تھا تو اس زمانے میں زیادہ Establish نہیں تھا، لوگ میرے بارے میں اتنا زیادہ نہیں جانتے تھے لیکن اب خدا کا شکر ہے میں سیٹ ہو گیا ہوں، لوگ مجھے جاننے لگے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسان کو اپنی پہچان مل جائے۔ انفرادی پہچان سے بہت سکون محسوس ہوتا ہے۔

سوال: آپ نے موسیقی کو کیوں اپنایا؟

جواد احمد: میرے خیال میں تو فنکار جو کام کرتا ہے۔ اطمینان اور ذاتی سکون کے لیے کرتا ہے یا کہہ لیں کہ یہ ایک طرح کی تفریح ہے اگر آپ کا موڈ موسیقی سننے کا ہو تو آپ کو اچھا لگے گا اگر نہیں۔ تو آپ نہیں سنیں گے، سارا معاملہ موڈ پر Depend کرتا ہے، ہر انسان کی اپنی اپنی پسند ہوتی ہے۔

سوال: آپ شاعری، گائیکی اور دھنیں بناتے وقت ہر شخص کی چوائس کو مدنظر رکھتے ہیں؟

جواد احمد: جی بالکل، سننے والوں کی پسند کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ کوئی فاسٹ میوزک پسند کرتا ہے اور کوئی لائٹ، تو اب یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ایک ہی طرح کے لوگوں کی چوائس کو سامنے رکھ کر کام کروں اس لیے میوزک کو Moderat رکھنا پڑتا ہے۔

سوال: کیا آپ گاتے ہوئے خود بھی اس کے اثر میں ڈوب جاتے ہیں؟

جواد احمد: زیادہ تر تو میرے ساتھ ایسا نہیں ہوتا کہ میں گاؤں تو ارد گرد کا ہوش نہ رہے۔ کبھی کبھی پروگرام کرتے وقت جب مجمع زیادہ

ہوتا ہے تو یہ کیفیت آرٹسٹ پر خود بخود غالب آ جاتی ہے اور وہ اس ماحول میں مکمل ڈوب جاتا ہے مگر میں اس وقت بھی ہوش میں رہتا ہوں۔

سوال: جب آپ نے گلوکاری کا آغاز کیا تھا تو آپ کو اتنی زبردست پذیرائی کی توقع تھی؟

جواد احمد: بالکل نہیں، میرے رب نے مجھے میری توقع سے بہت زیادہ نوازا ہے۔

سوال: کامیڈی، فوک اور صوفیانہ کلام..... کس میں زیادہ محنت سے گاتے ہیں؟

جواد احمد: محنت تو ہر قسم کے کلام کے لیے کرتا ہوں مگر صوفیانہ کلام میں کسی حد تک ڈوب بھی جاتا ہوں۔ کافی لگن اور محنت کرتا ہوں۔

سوال: آپ نے اب تک کتنے لائیو پروگرام کیے؟

جواد احمد: بخدا تعداد یاد نہیں ہے۔

سوال: کسی فلم کے لیے بھی گایا؟

جواد احمد: نہیں میں نے گایا نہیں البتہ فلم موسیٰ خان کا صرف میوزک دیا تھا۔

سوال: کسی فلم یا ڈرامے میں کام کرنے کی آفر ملی تو آپ کیا کریں گے؟

جواد احمد: میں انکار کر دوں گا۔

سوال: پاکستان کے علاوہ کسی ملک میں گایا اور کہاں زیادہ رسپانس ملا؟

جواد احمد: میں نے تقریباً تمام یورپ میں گایا اور ہر جگہ لوگوں کی ڈھیروں محبتیں وصول کیں۔

سوال: کیمرے کو Face کرنے اور کئی سو کی تعداد میں سامنے بیٹھے ہوئے سامعین کا سامنا کرنے میں کیا فرق ہے، اور آپ کس جگہ گا کر بہتر محسوس کرتے ہیں؟

جواد احمد: سامعین کے سامنے گا کر زیادہ مزہ آتا ہے، رسپانس فوری مل جاتا ہے اور خود اعتمادی بھی بڑھتی ہے۔

سوال: چیریٹی شو کرتے ہیں؟

جواد احمد: بالکل کرتا ہوں۔

سوال: کسی مقصد کے لیے۔ یا نام کے لیے......؟

جواد احمد: میں نام کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کی خدمت کے لیے کرتا ہوں نام تو اللہ نے دے دیا شہرت بھی مل گئی تو اگر انسانیت کی خدمت کے لیے بھی کچھ کر سکوں تو یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہوگی۔

سوال: آپ کا آئیڈیل کیا ہے؟

جواد احمد: جو ہر شریف آدمی کا ہونا چاہیے۔ مخلص ہمدرد اور وفادار......

سوال: آپ کو اپنا گایا ہوا کون سا گیت پسند ہے؟

جواد احمد: صوفیانہ کلام ہے "اللہ میرے دل کے اندر" اور "لائی میں اچیاں نال یاری وے"

(اب جواد کی والدہ سے ہونے والی گفتگو ملاحظہ فرمائیں:)

سوال: جواد کب پیدا ہوئے تھے؟

جواد کی والدہ: 29 ستمبر کو۔

سوال: گھر میں کیسا ہے؟

جواد کی والدہ: بہت محبت کرنے والا، خیال رکھنے والا، والدین کے علاوہ بہن بھائیوں، بھابیوں اور ان کے بچوں سب کی خوشیوں میں ان کا ساتھ دینے والا۔

سوال: کیا آپ بچوں کی سالگرہ مناتی ہیں؟

جواد کی والدہ: کبھی منا لیتے ہیں، کبھی نہیں لیکن سالگرہ کا دن یاد رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کو وش بھی کرتے ہیں۔

سوال: جواد آپ کو کیا گفٹ دیتا ہے؟

جواد کی والدہ: صرف وش کرتا ہے۔

سوال: بیرون ملک جائیں تو آپ کے لیے تحائف لاتا ہے؟

جواد کی والدہ: اسے خریداری کا اتنا تجربہ نہیں اور نہ گفٹ لانے کی عادت ہے، اس لیے وہ خریداری نہیں کرتا۔

سوال: بچپن میں جواد شرارتی تھا؟

جواد کی والدہ: شرارتی تو نہیں تھا البتہ پڑھنے کا شوقین تھا اور فرسٹ کلاس نمبروں میں امتحان پاس کرتا تھا۔

سوال: جواد کی شادی کب کریں گی؟

جواد کی والدہ: اس اسٹیج پر وہ خود ہی شادی کرے گا؟ جب بھی چاہے۔

سوال: کیا مطلب؟

جواد کی والدہ: بھئی جب وہ کہے گا، ہم شادی کر دیں گے۔

سوال: آپ کو جواد کی شہرت کیسی لگتی ہے اور اس کا کون سا گایا ہوا گیت پسند ہے؟

جواد کی والدہ: شہرت تو ظاہر ہے اچھی لگتی ہے اور مجھے اس کا گایا ہوا یہ گیت "بن تیرے کیا جینا" بہت پسند ہے۔

سوال: آپ جواد کے بارے میں کچھ اور بتائیں؟

جواد کی والدہ: جواد میرے لیے قابل فخر سرمایہ ہے اس نے کلاس ون سے لے کر سینئر کیمرج اولیول کیا ہوا ہے۔کوئی کلاس ایسی نہیں تھی کہ ٹاپ نہ کیا ہو۔ گانے کا شوق تھا، اس کے باوجود اس نے میکینکل انجینئر تعلیم مکمل کی کیونکہ اپنے بچوں کی تعلیم مکمل کرنا ہمارا خواب تھا۔

سوال: آپ کی فیملی پڑھی لکھی ہے، کیا آپ کے رشتہ داروں میں بھی اعلیٰ عہدوں پر لوگ موجود ہیں؟

جواد کی والدہ: میرا ایک تایا ایس پی رہ کر ریٹائر ہو چکا ہے۔ ایک چچا 20 ویں گریڈ میں سرکاری آفسر ہیں ایک ماموں مکینکل انجینئر دوسرا ماموں ٹیکسٹائل انجینئر ہیں جبکہ خالائیں اور پھوپھیاں بھی کم از کم ایم اے پاس ضرور ہیں۔ میری نند مس کوثر کوئین میری کالج میں ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ تھیں۔

سوال: جواد کا رویہ رشتہ داروں کے ساتھ کیسا ہے؟

جواد کی والدہ: چچاؤں، پھوپھیوں اور سب سے بہت محبت کرتا ہے، ہمارا بھی بہت خیال رکھتا ہے۔ اپنے پروگرام کے حوالے سے وہ آدھی رات کے بعد ہی گھر آتا ہے اور جب واپس آتا ہے تو ہمیں جگا کر دعائیں لیتا ہے۔ جب کہیں جاتا ہے تو دونوں کو پروٹوکول دیتا ہے اور دعائیں لے کر جاتا ہے۔ دوستوں والا رویہ ہے۔ گھر میں سادگی کے ساتھ پیار و محبت سے رہتا ہے۔ کبھی اپنی بڑائی کا احساس نہیں ہونے دیتا، سب کے ساتھ رویہ دوستانہ ہوتا ہے۔

(جواد کے والد سے چند سوال):

سوال: آپ بتائیں کہ بچپن میں جواد کیسا بچہ تھا، کیا شرارتی تھا؟

جواد کے والد: جی ہاں شرارتی تھا اور اکثر لوگوں کے گھروں کی بیل دے کر بھاگ جایا کرتا تھا اور آپ دیکھیں آج بھی وہ لوگوں کے گھروں کی "بیل" دے رہا ہے۔ پولیو مہم میں شامل ہو کر بچوں کو قطرے پلانے اور بچوں کی تعلیم کے لیے پسماندہ علاقوں میں جا کر انہیں شعور کی آگاہی دینے اور مفید شہری بنانے کے سلسلے میں مصروف ہے۔

سوال: بچپن میں اور کیا کیا شرارتیں کیا کرتا تھا؟

جواد کے والد: وہ بے ضرر قسم کی شرارتیں کرتا تھا مگر ایک دوست کو دوسرے سے لڑا دیتا تھا، پھر انجوائے کر کے صلح بھی کروا دیتا تھا۔

سوال: آپ کی فیملی میں صرف جواد کو گانے کا شوق ہے یا کسی اور کو بھی؟

جواد کے والد: شوق میرے تمام بیٹوں کو ہے لیکن گلوکاری کو پروفیشن صرف جواد نے بنایا۔

سوال: اپنے باقی بچوں کے بارے میں بتائیں، وہ کیا کرتے ہیں؟

جواد کے والد: میری بیٹی ایم ایس سی اکنامکس ہے ایک سکول میں پرنسپل ہے اس کا خاوند کیمیکل انجینئر ہے۔ ایک بیٹا ڈاکٹر ہے اور اس کی بیگم بھی ڈاکٹر ہے۔ دوسرا آرکیٹیکٹ اس کی بیوی بھی آرکیٹیکٹ ہے۔ جواد بھی مکینیکل انجینئر ہے لیکن وہ اپنے پروفیشن میں نہیں گیا اور گلوکار بن گیا۔

سوال: آپ کو اس کا گلوکار بننا کیسا لگا؟

جواد کے والد: میں نے اعتراض نہیں کیا، بس یہی کہا کہ پہلے تعلیم مکمل کر لو، پھر جو دل چاہے بن جانا اور الحمدللہ میرے سب بچوں نے تعلیم مکمل کی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

سوال: آپ کیا کرتے ہیں؟

جواد کے والد: میں اور جواد کی والدہ دونوں پروفیسر ہیں۔ میری بیوی لاہور کالج میں پولیٹیکل سائنس کی ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ اور میں گورنمنٹ کالج میں (پولیٹیکل سائنس کا) پروفیسر تھا اب اگرچہ ہم دونوں ریٹائر ہو چکے ہیں تاہم یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے لیکچر دے رہے ہیں۔


www.pdfbooksfree.pk

# منفرد پاپ گلوکار
# علی ظفر

بعض لوگ اتنے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ کوئی ایک واقعہ یا کوئی ایک چیز انہیں شہرت کی بلندیوں تک لے جانے کا باعث بن جاتی ہے۔ ابھرتے ہوئے نوجوان گلوکار علی ظفر کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔علی ظفر این سی اے سے پینٹنگز کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے گلوکاری کی طرف آئے ان کی پہلی البم کا ایک گانا ''چھنوں کی آنکھ میں'' ان کی مقبولیت کا باعث بن گیا۔علی ظفر کو شاعری سے بھی تھوڑی بہت دلچسپی ہے۔اس لیے اپنی اس البم کے زیادہ تر گانے انہوں نے خود ہی لکھے ہیں۔علی ظفر سے کیا جانے والا انٹرویو قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

سوال: اپنے خاندان اور تعلیمی پس منظر کے بارے میں بتایئے؟

علی ظفر: میرے خاندان کا تعلق لاہور سے ہے میں لاہور میں 18 مئی 1980ء کو پیدا ہوا اور ساری تعلیم بھی یہیں حاصل کی۔میٹرک میں اپنے اسکول میں ٹاپ کیا تھا۔گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف اے کیا اور پھر نیشنل کالج آف آرٹس (این سی اے) سے میں نے 2002ء میں پینٹنگز میں گریجویشن کیا۔میرے والد خود بھی فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ پنجاب یونیورسٹی میں استاد ہیں، جبکہ والدہ نے حال ہی میں لائبریری سائنس میں پی ایچ ڈی مکمل کیا ہے اور وہ بھی پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس میں پڑھاتی ہیں۔میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہوں کہ میرا تعلق ایک تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔

سوال: آپ کا بچپن کیسا گزرا؟

علی ظفر: میں ایک شرمیلا سا لاڈلا بچہ تھا۔چونکہ فیملی میں زیادہ بچے نہیں تھے،اس لیے سب سے زیادہ پیار بھی مجھے ہی ملتا تھا۔

سوال: آپ کا کہنا ہے کہ آپ ایک شرمیلے بچے تھے لیکن اب تو آپ ہزاروں لوگوں کے سامنے اسٹیج پر گا رہے ہوتے ہیں، تو کیا اب آپ شرمیلے نہیں رہے؟

علی ظفر: دراصل اسٹیج پر گانا تو میرا پروفیشن ہے وہاں شرمانا میں afford نہیں کر سکتا۔

سوال: کیا آپ شرارتی بھی تھے؟

علی ظفر: شرارت کرنے کے لیے کوئی ساتھی ہی نہیں ہوتا تھا۔اس لیے آرام سے اپنے کام میں لگا رہتا تھا۔چونکہ زیادہ وقت بڑوں کے ساتھ گزرتا تھا،اس لیے کم عمری سے ہی بڑوں کی طرح سوچنے لگا تھا۔

سوال: پڑھائی میں کیسے تھے؟

علی ظفر: اچھا تھا۔اپنے تعلیمی کیریئر میں زیادہ تر امتیازی پوزیشن حاصل کرتا رہا۔

سوال: آپ کتنے بہن بھائی ہیں؟

علی ظفر: ہم تین بھائی ہیں۔دوسرے دونوں مجھ سے چھوٹے ہیں، زین آئی ٹی کر رہا ہے، جبکہ سب سے چھوٹا بھائی دانیال 10 سال کا

ہے اور پڑھ رہا ہے۔

سوال: کیا ان دونوں بھائیوں کو بھی گانے کا شوق ہے؟

علی ظفر: مجھ سے چھوٹے بھائی زین کو کمپیوٹرز کا زیادہ شوق ہے لیکن موسیقی سمجھتا ضرور ہے۔ سب سے چھوٹے بھائی دانیال کے بارے میں مجھے پورا یقین ہے کہ اس کے اندر ایک فنکار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

سوال: آپ کو گانے کا شوق کیسے ہوا؟

علی ظفر: گانے کا شوق کالج میں ہوا خصوصاً جب میں نے گورنمنٹ کالج کی میوزک سوسائٹی جوائن کی۔ اس وقت میری عمر تقریباً 16 سال ہوگی۔

سوال: کیا شروع سے ہی گلوکار بننے کا شوق تھا؟

علی ظفر: جی نہیں۔ مجھے بچپن سے پینٹر اور کرکٹر بننے کا شوق تھا مگر جب میوزک سوسائٹی جوائن کی تو میں اس میں بہت زیادہ سیریس ہو گیا پھر اس پروفیشن میں آ گیا۔

سوال: آپ نے پینٹنگ یا کرکٹ کو پروفیشن کیوں نہیں بنایا؟

علی ظفر: ویسے تو میں میوزک کے ساتھ ساتھ پینٹنگ بھی کرتا ہوں لیکن میں پروفیشن میوزک کو بنانا چاہتا تھا دراصل میوزک مجھے اپنی شخصیت کے بھرپور اظہار کا بہترین ذریعہ لگتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ جن لوگوں کو میں سنتا ہوں، وہ میری زندگی کا حصہ ہیں اسی طرح میری خواہش تھی کہ میں کچھ ایسا کروں کہ میں بھی میوزک کے ذریعے دوسرے لوگوں کی زندگی کا حصہ بن جاؤں۔

سوال: آپ نے میوزک کی باقاعدہ تربیت بھی حاصل کی؟

علی ظفر: جی ہاں! میں نے دو سال گورنمنٹ کالج میوزک سوسائٹی میں ٹریننگ لی۔ بعد میں این سی اے کی میوزک سوسائٹی میں بھی سیکھتا رہا۔ اس کے علاوہ میں نے اسرار چشتی، باقر عباس اور فریدہ خانم اور جاوید بشیر سے بھی سیکھا۔

سوال: آپ نے پاپ میوزک کا ہی انتخاب کیوں کیا؟

علی ظفر: میرے خیال میں پاپ میوزک نے میرا انتخاب کیا ہے۔

سوال: تو کیا آپ پرانی موسیقی کو پسند نہیں کرتے؟

علی ظفر: ایسی کوئی بات نہیں۔ میرے خیال میں فن کے ہر شعبے میں جدت پیدا کرتے رہنا ہی فنکار کا اصل کام ہے۔ جہاں تک بات ہے پرانی موسیقی کی تو اچھی موسیقی کبھی پرانی نہیں ہوتی!

سوال: آپ کے پسندیدہ گلوکار کون سے ہیں؟

علی ظفر: میں مہدی حسن، استاد بڑے غلام علی خاں، فریدہ خانم، اقبال بانو، لتا، محمد رفیع، طفیل نیازی، کشور کمار کو بہت شوق سے سنتا ہوں۔

سوال: پسندیدہ اداکار کون سے ہیں؟

علی ظفر: فردوس جمال، خیام سرحدی، دلیپ کمار، امیتابھ بچن، ایل پچینو میرے پسندیدہ اداکار ہیں۔

سوال: کبھی اداکاری کا خیال بھی آیا؟

علی ظفر: جی میں باقاعدہ چند ٹی وی ڈراموں میں اداکاری کر چکا ہوں۔ جن میں لنڈا بازار، کانچ کے پر اور جیو ٹی وی پر چلنے والا ڈراما

ضد شامل ہیں۔

سوال: فلم میں کام کرنے کی آفر ہوئی؟

علی ظفر: میں ثاقب ملک کی فلم ''اجنبی شہر میں'' اداکاری کا آغاز کر رہا ہوں۔

سوال: کیا گلوکاری کی نسبت اداکاری میں زیادہ کشش نہیں ہے؟

علی ظفر: میرے خیال میں پاکستان میں پاپ سنگنگ زیادہ پرکشش ہے۔

سوال: کبھی سوچا تھا کہ آپ اتنی چھوٹی عمر میں اتنے بڑے اسٹار بن جائیں گے؟

علی ظفر: انسان اپنے بارے میں سوچتا تو بہت کچھ ہے۔ ظاہر ہے میں نے بھی سوچا تو ہوگا لیکن ایسی چیزوں کا حقیقت بن جانے کا ایک اپنا ہی مزہ ہے۔

سوال: اتنی زیادہ شہرت حاصل کر لینے کے بعد کیا محسوس کرتے ہیں؟

علی ظفر: بڑا مطمئن محسوس کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں سمجھتا ہوں کہ میری ذمہ داری بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ ساری دنیا کو علم ہے کہ میں پاکستان کا سنگر ہوں اگر میں برا پرفارم کروں گا تو اس کا اثر میرے ملک پر پڑے گا لہٰذا اب میری ذمہ داری ہے کہ میں اچھے سے اچھا پرفارم کروں اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے مجھے پہلے سے زیادہ محنت کرنا پڑ رہی ہے، تاکہ میں لوگوں کی توقعات پر پورا اتر سکوں۔

سوال: ابھی تک کتنے گانے گا چکے ہیں؟

علی ظفر: میری دو البم مارکیٹ میں آ چکی ہیں۔

سوال: آپ نے ایک گانا گایا ''چھنوں کی آنکھ'' یہ گانا بہت ہٹ ہوا اور آپ کی وجہ شہرت بن گیا۔ کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ یہ ''چھنوں'' آخر ہے کون؟

علی ظفر: (ہنستے ہوئے) چھنوں ایک خیال ہے، ایک آئیڈیا ہے۔ کوئی انسان نہیں ہے۔ دراصل شاعری میں اس طرح کی تخیلاتی چیزیں ہوتی ہیں، جن کا وجود نہیں ہوتا۔

سوال: یہ گانا کس نے لکھا؟

علی ظفر: میں نے خود لکھا ہے۔

سوال: اپنا پسندیدہ گانا کون سا ہے؟

علی ظفر: میرے دو گانے مجھے بہت پسند ہیں۔ ''تیری یاد آئی''، اور ''رنگین''۔

سوال: فیملی کی موجودگی میں پرفارم کرتے وقت نروس ہو جاتے ہیں؟

علی ظفر: بالکل نہیں بلکہ میں زیادہ انجوائے کرتا ہوں اور میرا حوصلہ بڑھتا ہے۔

سوال: اخبار شوق سے پڑھتے ہیں؟

علی ظفر: کوئی خاص شوق نہیں۔ ویسے میں نے بڑی کوشش کی کہ اخبار پڑھنے کی عادت ڈالوں۔

سوال: دوست بناتے وقت کن خوبیوں کو مدنظر رکھتے ہیں؟

علی ظفر: بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی خاص مقصد کے تحت دوستی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے میں اس کا بڑا خیال رکھتا ہوں اور

بہت سوچ سمجھ کر دوست بناتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے ایک یا دو دوست ہوں لیکن اچھے اور مخلص ہونے چاہئیں۔

سوال: تنہائی پسند ہیں یا سوشل؟

علی ظفر: میں ایک تنہائی پسند انسان ہوں اور بہت زیادہ لوگوں سے ملنے سے ہچکچاتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آج کے دور میں بہت سے ملنے والے مفاد پرست ہوتے ہیں جو آپ سے کسی نہ کسی مقصد کے لیے ملتے ہیں، اس لیے سطحی لیول پر لوگوں سے ملنے کا قائل نہیں ہوں۔

سوال: کبھی جھوٹ بولنے کا اتفاق ہوا؟

علی ظفر: بہت دفعہ (ہنستے ہوئے) میں نے اس وقت جھوٹا بولا جب مجھے محسوس ہوا کہ میرے سچ بولنے سے دوسرے کو دکھ ہو یا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

سوال: زندگی میں کبھی کسی چیز کی کمی محسوس ہوئی؟

علی ظفر: جب کبھی کوئی ایسا خیال دل میں آ جائے تو میں ان چیزوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا ہوں جو میرے پاس ہیں مگر دوسروں کے پاس نہیں ہیں اور میں اس پر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔

سوال: کبھی اپنے کسی فیصلے پر پچھتاوا ہوا؟

علی ظفر: جی نہیں، دراصل میں نے ہمیشہ دوسروں کی غلطیوں سے سیکھنے کی کوشش کی ہے بجائے اس کے کہ خود غلطی کروں اور اس سے نقصان اٹھاؤں۔

سوال: شادی کب تک کرنے کا ارادہ ہے؟

علی ظفر: فی الحال شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور نہ ہی ابھی اس بارے میں کچھ سوچا ہے۔

سوال: شادی اپنی مرضی سے کریں گے یا والدین کی مرضی سے؟

علی ظفر: میں سمجھتا ہوں کہ میری مرضی میں والدین کی مرضی بھی شامل ہوگی، کیونکہ اس معاملے میں میری اپنے والدین سے بڑی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ وہ میری مرضی کو ضرور ترجیح دیں گے۔

سوال: کھانے کے شوقین ہیں؟

علی ظفر: جی ہاں! ظاہر ہے کہ لاہور میں رہتا ہوں، اس لیے کھانے کا بہت شوقین ہوں۔

سوال: کون سی ڈش زیادہ پسند ہے؟

علی ظفر: زیادہ تر ایسے کھانے کھاتا ہوں، جن میں گھی کم ہو ویسے آلو میتھی، آلو پالک، ساگ اور چکن کی تمام ڈشیں شوق سے کھاتا ہوں۔

سوال: کیا خود بھی کھانا پکانا آتا ہے؟

علی ظفر: جی ہاں! دلچسپ بات یہ ہے کہ مجھے آٹا گوندھنا اور روٹی پکانا بھی آتا ہے اور گھیا توریاں پکانی بھی آتی ہیں۔

سوال: زندگی میں کبھی ندامت کا احساس ہوا؟

علی ظفر: ایک دفعہ اپنے والدین سے اونچی آواز میں بات کی تھی تو اپنے والدین کے تاثرات دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ انہیں بڑا دکھ ہوا ہے، جس پر مجھے بڑی ندامت ہوئی اور میں نے قسم کھائی کہ آئندہ کبھی ایسا نہیں کروں گا۔

سوال: عملی زندگی شروع کرتے وقت کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا؟

علی ظفر: بظاہر لوگوں کو یہی محسوس ہوتا ہوگا کہ میں نے بڑے آرام سے گانا بنایا، اسے گایا اور میں ہٹ ہوگیا، ایسا بالکل نہیں ہے۔ مجھے عملی زندگی میں بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ جتنی مشکلات سے میں گزرا ہوں، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں نے 18 سال کی عمر میں کام شروع کر دیا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ جس مسئلے کا سامنا کرنا پڑا، وہ لوگوں کا منافقانہ رویہ تھا۔ یہاں ٹیلنٹ کی حوصلہ افزائی کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ میرے خیال میں اس طرح کے باقاعدہ ادارے ضرور ہونے چاہئیں۔

سوال: غصہ آتا ہے؟

علی ظفر: اب تو میچور ہوگیا ہوں۔ شروع میں بہت غصہ آتا تھا۔ اب بھی آتا ہے لیکن اسے کنٹرول کرنا بھی آ گیا ہے۔

سوال: کن باتوں پر غصہ آتا ہے؟

علی ظفر: جب کوئی صبر یا برداشت کا مظاہرہ نہیں کرتا تو پھر بہت غصہ آتا ہے۔

سوال: جب کبھی ملک سے باہر جاتے ہیں تو کس کی یاد سب سے زیادہ آتی ہے؟

علی ظفر: گھر والوں کی۔

سوال: گھر میں سب سے زیادہ کس کے قریب ہیں؟

علی ظفر: ویسے سارے گھر والوں کے ساتھ میری اچھی بنتی ہے، تاہم چھوٹے بھائی دانیال کے بہت زیادہ قریب ہوں۔ اس کے ساتھ بہت زیادہ دوستی ہے۔

سوال: فلمیں دیکھتے ہیں؟

علی ظفر: جب کبھی وقت ملتا ہے تو انگلش فلمیں دیکھتا ہوں البتہ کبھی کبھار بھارتی اور پاکستانی فلمیں بھی دیکھ لیتا ہوں۔

سوال: والد کے حوالہ سے علی ظفر کی کامیابیوں پر کیا تاثرات ہیں؟

والد علی ظفر: میں سمجھتا ہوں کہ علی نے مجھے مکمل کر دیا ہے۔ میری زندگی میں جو شوق اور خواہشیں تھیں، وہ اس نے پوری کر دی ہیں۔ میں اس میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں اور ہمیں اس پر فخر ہے کہ اسے جس فن کی وجہ سے شہرت ملی، اس نے اس فن کی تکمیل کی ہے۔

سوال: فلم میں گانے کی آفر ہوئی؟

علی ظفر: فلم ''شرارت'' میں گانا گا چکا ہوں۔

سوال: کوئی ایسا گانا جو آپ اکثر گنگناتے ہوں؟

علی ظفر: مہدی حسن صاحب کی ایک غزل ''یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے'' میں اکثر گنگناتا ہوں۔

سوال: حالات حاضرہ پر گفتگو کرنا اچھا لگتا ہے؟

علی ظفر: یہ موضوع پر منحصر ہے ویسے مجھے سیاست بالکل پسند نہیں ہے۔

سوال: مذہب سے لگاؤ ہے؟

علی ظفر: مذہب سے میرا تعلق ذاتی ہے۔

سوال: آپ کی زندگی پر کن شخصیات نے اثر ڈالا؟

علی ظفر: شعیب منصور، میرے کالج کے استاد آر ایم نعیم، میرے والد اور میرے نانا ابو کی شخصیات کی میری زندگی پر گہرے اثرات

ہیں۔

سوال: وہ کون سے کام ہیں، جن کے کرنے کی تا حال آرزو ہے؟

علی ظفر: میری بہت بڑی خواہش ہے کہ میں مرنے سے پہلے اپنے ملک کو ترقی اور استحکام کے حوالے سے اس مقام پر دیکھوں، جس مقام پر میں باہر کے ممالک کو دیکھ کر آتا ہوں۔

سوال: کتابیں پڑھنے کا شوق ہے؟

علی ظفر: وقت کی قلت کی وجہ سے بہت کم پڑھتا ہوں تاہم منٹو اور کرشن چندر کی تحریریں شوق سے پڑھتا ہوں۔

سوال: آپ کی زندگی کا کوئی معین اصول؟

علی ظفر: میرا اصول ہے کہ کبھی کسی کے بارے میں برا نہ سوچا جائے اور نہ ہی کسی کو جان بوجھ کر نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے۔

سوال: کبھی رونا آتا ہے؟

علی ظفر: جی ہاں! بہت رونا آتا ہے۔ خاص طور پر جب کوئی آپ کا اپنا آپ کو دکھ پہنچاتا ہے تو پھر بہت رونا آتا ہے۔

سوال: ماں کی حیثیت سے آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

والدہ علی ظفر: مجھے خوشی ہے کہ جو یہ چاہتا تھا، خدا نے اسے دے دیا ہے۔ اس نے جو خواب دیکھے تھے، وہ پورے ہو گئے ہیں۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں شوکت خانم کینسر ہسپتال کے لیے کچھ کروں اور جب علی نے اس ہسپتال کے لیے شو میں گایا تو عمران خان نے ہمارا بہت شکریہ ادا کیا۔ اس وقت مجھے یوں لگا کہ میرے بیٹے نے میرے اس خواب کی تکمیل کر دی ہے کہ یہ صرف اپنے ہی نہیں بلکہ دوسروں کے بھی کچھ کام آئے۔

سوال: اپنے مسائل اور پریشانیاں کس سے شیئر کرتے ہیں؟

علی ظفر: اپنے ابو، امی اور اپنے بہترین دوست ہارون سے شیئر کرتا ہوں۔

سوال: موت سے خوف آتا ہے؟

علی ظفر: بالکل نہیں۔

سوال: آپ کا قیمتی اثاثہ کیا ہے؟

علی ظفر: میری آواز میرا سب سے قیمتی اثاثہ ہے۔

سوال: غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟

علی ظفر: اپنی غلطی کا فوراً اعتراف کر لیتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی غلطی پر معافی مانگ لینے سے انسان چھوٹا نہیں ہوتا بلکہ بڑا ہوتا ہے۔

سوال: زندگی کا خوب صورت ترین دن؟

علی ظفر: جس دن میری البم ریلیز ہوئی۔ وہ میری زندگی کا خوبصورت دن تھا۔

سوال: آپ کی کون سی عادت سے گھر والے بیزار رہتے ہیں؟

علی ظفر: میں کھویا کھویا رہتا ہوں۔ خود کہیں ہوتا ہوں اور دماغ کہیں اور ہوتا ہے۔

سوال: کیا اس کی کوئی ''خاص'' وجہ ہے؟

علی ظفر: جی نہیں، بس کام کی وجہ سے ہے۔ ہر وقت اپنے کام کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔

سوال: کبھی عشق کیا؟

علی ظفر: جی نہیں! کبھی عشق وشق کے چکروں میں نہیں پڑا۔ بڑا پریکٹیکل آدمی ہوں۔

سوال: گھر کی تزئین وآرائش میں حصہ لیتے ہیں؟

علی ظفر: مجھے شوق بہت ہے لیکن وقت نہ ہونے کی وجہ سے یہ شوق پورا نہیں کر پاتا۔

سوال: مزاجاً نرم ہیں یا سخت؟

علی ظفر: دن کے مختلف حصوں میں میرا مزاج مختلف ہوتا ہے ویسے درمیانے مزاج کا آدمی ہوں۔

سوال: آپ کے کپڑے کون ڈیزائن کرتا ہے؟

علی ظفر: مختلف لوگ ہیں جن میں دیپک پروانی، حسن شہریار، عمار بلال شامل ہیں جو میرے کپڑے ڈیزائن کرتے ہیں۔

سوال: کبھی رشوت دے کر کوئی کام کروایا؟

علی ظفر: کبھی نہیں، اور نہ ہی کبھی ایسا کروں گا، چاہے اس طرح میرا نقصان ہی کیوں نہ ہو جائے۔

سوال: کن چیزوں پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں؟

علی ظفر: کپڑوں اور کھانے پینے پر بہت خرچ کرتا ہوں۔

سوال: آپ کی دعائیں قبول ہوتی ہیں؟

علی ظفر: ابھی تک تو ساری ہوگئی ہیں۔

سوال: ناگواری کا اظہار کیسے کرتے ہیں؟

علی ظفر: چپ ہو جاتا ہوں۔

سوال: مٹی کی خوشبو کیسی لگتی ہے؟

علی ظفر: اس وطن کی مٹی نے سب کچھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ میٹھی کوئی اور خوشبو ہو ہی نہیں سکتی۔

سوال: محبت کے بارے میں کیا خیالات ہیں؟

علی ظفر: میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ بہتر چیز اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کے دل میں پیار ہے خواہ وہ کسی کے لیے بھی ہو۔

سوال: آپ کو خوبی متاثر کرتی ہے یا خوبصورتی؟

علی ظفر: میرے خیال میں صرف "خوبی" ہونا بھی کسی حد تک بہتر ہے اور اگر خوبی کے ساتھ خوبصورتی بھی شامل ہو تو پھر گویا سونے پر سہاگے والی بات ہے۔

❁❁❁

# میوزیشن' شاعر' کمپوزر اور پاپ گلوکار ہارون

ہارون نہ صرف پاکستان بلکہ ایشیاء کے پاپ اسٹار ہیں۔جن کو پرنس آف پاکستان بھی کہا جاتا ہے۔ہارون گلوکار ہونے کے ساتھ ساتھ کمپوزر اور اچھے شاعر بھی ہیں۔اپنے گانے خود ہی بناتے ہیں اور خود ہی ریکارڈ کرتے ہیں۔اچھے سنگر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت اچھے پرفارمر Performer بھی ہیں۔وہ جب اسٹیج پر آتے ہیں تو دیکھنے والے ان کی پرفارمنس دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور شائقین خود بھی جھومنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔اب تک ان کے تیس 30 لاکھ سے زیادہ سی ڈیز اور آڈیو ٹیپ پوری دنیا میں فروخت ہو چکے ہیں۔پوری دنیا میں لاکھوں کی تعداد میں ان کے چاہنے والے اور مداح موجود ہیں جو ان کی پرفارمنس کو بے انتہا پسند کرتے ہیں۔

ہارون 11 مئی کو لندن میں پیدا ہوئے۔ان کی والدہ کا تعلق نیوزی لینڈ اور والد پاکستانی ہیں۔ہارون کا تعلق ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے اسی وجہ سے ہارون ایک صاف اور اچھے ذہن کے مالک ہیں۔جو اپنے ارادوں میں بے حد مضبوط اور کام میں مخلص ہیں۔اپنا کام پوری دیانتداری اور ایمانداری سے انجام دیتے ہیں۔موسیقی ایسا کام ہے جس میں سچی لگن اور دیانت شرط ہے اگر سچی لگن اور دیانت سے موسیقی کو انجام نہ دیا جائے تو وہ کبھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ پاتی۔ہارون نے ہمیشہ میوزک کو سچی لگن سے انجام دیا جس کا ثبوت یہ ہے کہ پچھلے پندرہ سال سے وہ موسیقی کے میدان میں اپنا اور ملک کا نام روشن کر رہے ہیں۔وہ بہت خوش اخلاق اور ملنسار انسان ہیں اور ہر کسی سے مسکرا کر اور دوستانہ انداز میں بات کرتے ہیں روایتی خوش اخلاقی سے اپنے مداحوں پر بہت اچھا تاثر چھوڑتے ہیں۔

## بحیثیت میوزیشن:

ہارون گٹار اور کی بورڈ بہت اچھا Play کرتے ہیں انہوں نے پندرہ سال کی عمر میں اپنا پہلا سکول بینڈ بنایا۔پچھلے بارہ سالوں میں ہارون نے بے شمار گانے کمپوز کئے جو تمام سُپر ہٹ ہوئے۔پاپ میوزک انڈسٹری میں یہ گانے سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔جن میں مسٹر فراڈیئے' اے جواں' میں نہ مانوں ہار' جادو کا چراغ' یارا' پیاریا' مہندی' محبوبہ' اور (وطن کا گیت) دل سے میں نے دیکھا پاکستان سپر ہٹ ہوئے۔

1990 میں جارج واشنگٹن امریکہ سے بزنس ایڈمنسٹریشن میں گریجویشن کرنے کے بعد ہارون نے سولہ سال کی عمر میں ایک گانا کمپوز کیا" جانِ من" جو اس نے پندرہ ہزار میں اس کا ویڈیو بنایا اور ٹی وی اسٹیشن پہ گانا چلانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اس کو چلانے میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی تو ہارون نے وہ ویڈیو M.T.V کو بھیج دیا۔ہارون کا یہ گانا پہلا اُردو اور ہندی زبان کا گانا تھا(پہلا پاپ سانگ) جو ایم ٹی وی پر خوب چلا اور سپر ہٹ ہوا

آواز بینڈ کے ساتھ ہارون نے پوری دنیا کے دورے کئے اور اپنی پرفارمنس سے پوری دنیا کے شائقین کے دل جیت لیئے۔

## تنہا پرفارمنس کی ابتداء:

ہارون نے اپنا پہلا البم اپنی ہی آواز کے نام سے نکالا جس کو انہوں نے خود ہی پروڈیوس کیا۔خود ریکارڈ کیا اور اپنے ذاتی اسٹوڈیو میں اس کا

تمام کام مکمل کیا۔ اکتوبر 2000ء میں یہ البم ریلیز ہوا جس کے تقریباً پانچ لاکھ کیسٹ فروخت ہوئے۔ اس البم میں ہارون نے پوری جان لگا کر اور محنت سے میوزک کے سننے والوں کو سپرہٹ گانے اور دیکھنے کے لئے سپر ویڈیوز دیے جن میں یارا' پیاریا' جی کے دیکھا اور بہت سے ہٹ گانے شامل ہیں۔

2001ء اور 2002ء میں ہارون نے انگلینڈ اور امریکہ میں بے شار شوز' کنسرٹ کیے۔ 2001ء میں ہارون نے بی بی سی ایشیاء ایوارڈ حاصل کیا اور یہ شو BBC ٹیلی ویژن سے نشر کیا گیا۔ جس کو لاکھوں لوگوں نے دیکھا۔

ہارون نے پوری دنیا کینیڈا' یورپ میں بے مثال میوزیکل پروگرام کیے جن میں سے چند یادگار کنسرٹ Wembley Arena (Lndon) (Birmingham) BBC Asia Award میں ہوئے جن کو شائقین آج تک نہیں بھولے۔

## دوسرا البم:

ہارون کا دوسرا سولو البم لگن تھا جن کی خاص بات یا خاص پہچان مصر میں بنایا گیا وہ ویڈیو ہے جن کے میوزک پر آج بھی لوگ بے ساختہ جھومنے لگتے ہیں اور ہر طرف سے یہ آواز آ رہی ہوتی ہے۔

"لے لے دل محبوبہ' لے لے جان محبوبہ"

یہ وہ پہلا پاکستانی ویڈیو تھا جو اہرام مصر میں فلمایا گیا اور کثیر سرمایہ سے تیار ہوا۔ اس گانے کی بدولت ہارون کا نام پوری دنیا میں روشن ہوا اور یہ لوگ انہیں اور زیادہ پسند کرنے لگے۔

## تیسرا البم:

اور اب آ رہا ہے ہارون کا تیسرا البم' ہارون کا نشہ" اس البم پر ہارون نے 2005ء میں کام شروع کیا اور اپنے ذاتی اسٹوڈیو میں دن رات محنت اور لگن سے ان البم کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ایک ایک گانے اس کی شاعری اور اس کے میوزک پر بھرپور توجہ دی ہے۔ سارا کام تمام کمپوزنگ پروڈسنگ' انجیئرنگ اور مکسنگ کے فرائض انہوں نے خود ہی سرانجام دیئے۔

اس البم میں ان کے سننے اور چاہنے والوں کو ہارون کی محنت کا نچوڑ سُنائی دے گا اور محسوس ہوگا کہ ہر گانا اپنی جگہ بے مثال ہے اس میں جہاں فن نظر آئے گا وہاں دلوں کو مسحور کرنے والا میوزک بھی ان گانوں میں لوگوں کو بہت شاندار گانے سننے کو ملیں گے۔ ان میں سے چند گانے یہ ہیں۔

1- جیا جائے۔ جیا جائے۔ ایک ایسا گانا ہے جس میں امن' محبت' چاہت' اور درگزر کا پیغام ہے۔ کہ دنیا میں سب کو سکون اور امن سے رہنا چاہیے۔ ہر سطح پر محبت اور پیار کو عام کرنا چاہیے۔

2- دوسرا سپرہٹ گانا جو اکیلا: ہارون نے گایا اس گانے میں ایک الگ انداز پیش کیا گیا ہے جو بڑا منفرد اور تکنیکی ہے۔ شائقین اور ناظرین کو ضرور پسند آئے گا۔

اس کے علاوہ البم میں ہمیں ہے یہ پیار Love Song بھی شامل ہیں۔ جو سب کے دلوں کو اپنی مٹھی میں بند کر لے گا۔

پاپ موسیقی کی دنیا میں انہی خدمات کی بنا پر انہیں ایشیاء کا سپر سٹار گلوکار قرار دیا جاتا ہے۔

# تمغہ امتیاز اور تمغہ ایثار حاصل کرنے والا
# عظیم گلوکار شہزاد رائے

فن موسیقی میں تھوڑی سی بھی آشنائی رکھنے والے شہزاد رائے کو منفرد گلوکار کی حیثیت سے یقیناً جانتے ہیں وہ 16 فروری 1980ء کو کراچی میں ایک کاروباری خاندان میں پیدا ہوئے بچپن سے ہی گٹار بجانے کا شوق تھا تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نصرت فتح علی خان' ریشماں' اُستاد سلامت علی خان اور عابدہ پروین کو شوق سے سنتے سکول کے زمانے میں ہی بزم ادب اور سکول کی دیگر تقریبات میں موسیقی کے حوالے سے بھرپور شرکت کر کے اپنے شوق کی تکمیل کرتے رہے۔ میٹرک کا امتحان بہترین نمبروں سے پاس کرنے کے بعد پرئمیر کالج کراچی میں حصول تعلیم کے لئے داخل ہوگئے جہاں سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی آپ کا شمار کالج کے بہترین ٹیبل ٹینس کھلاڑیوں میں ہوتا تھا اس کے باوجود کہ خاندان میں اس سے پہلے کوئی بھی فرد گلوکاری کی طرف راغب نہیں ہوا تھا۔ شہزاد رائے کی خوبصورت آواز پرکشش شکل وجاہت اور گٹار بجانے کا شوق انہیں گلوکاری کی طرف لے آیا غالباً یہ 1994ء کا سال تھا ایک سال کے عرصے میں انہوں نے اپنی ذات میں گلوکاری کے حوالے سے چھپی ہوئی خصوصیات اور خوبیوں کو نیا رخ عطا کیا جس کی وجہ سے 1995ء میں "زندگی" کے نام سے آپ کا پہلا البم مارکیٹ میں متعارف ہوا۔ حالانکہ یہ شہزاد رائے کا سب سے پہلا البم تھا جس کو عوام الناس نے اتنی پسندیدگی سے نوازا کہ البم کی چھ لاکھ کاپیاں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئیں۔ اس البم کی کامیابی کے بعد شہزاد رائے میں مزید خود اعتمادی پیدا ہوئی اور وہ گائیکی کے ساتھ ساتھ میوزک کی کمپوزنگ کی طرف بھی متوجہ ہوئے کہ پھر کامیابیوں کی شاہراہ پر اُنہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ فن گائیکی میں اُنہوں نے ایسا منفرد انداز اپنایا کہ بہت جلد ان کا شمار پاکستان کے ممتاز اور ہردلعزیز گلوکاروں میں ہونے لگا بلکہ انہیں پاکستان کی میوزک انڈسٹری کے لئے لازم قرار دے دیا گیا جب بھی پاکستان میں پاپ گائیکی کے حوالے سے بات کی جائے گی تو شہزاد رائے کے ذکر کے بغیر نامکمل تصور کی جائے گی ان کا سب سے پہلا ویڈیو البم (رب جانے) تھا جس کی شوٹنگ کا تمام تر حصہ انگلینڈ میں ہی فلمایا گیا اس ویڈیو میں بھی عوام الناس کے لئے ایک خاص پیغام پنہاں تھا جسے بخوبی طور پر امن و آشتی کے ساتھ ساتھ معاشرتی ہم آہنگی' باہمی دوستی اور بردباری سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ (رب جانے) ویڈیو کی ریکارڈنگ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کہنہ مشق ڈائریکٹر احسن رحیم کا کردار قابل ذکر تھا جبکہ اداکارہ نادیہ حسن نے پرفارم کرکے ویڈیو کو چار چاند لگا دیئے۔ اس ویڈیو کا میوزک خود شہزاد رائے نے دیا جسے ہر سطح پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔

شہزاد رائے کا دوسرا البم 1997ء میں ورشن کے نام سے مارکیٹ میں آیا جس میں دس معروف سانگ اور فوک گانے شامل تھے جس میں ورشن' کاجل' چال تیری مستانی' یادیں' سنگنا' سدا خوشی' اک خدا قابل ذکر تھے۔ جبکہ تیسرا البم 1999 میں تیری صورت لانچ کیا گیا جس میں تیری صورت' ہار گئے' آج' یارب' دم علی دم' مشکل' بے وفا قابل ذکر تھے۔ 2002ء میں شہزاد رائے کا تیسرا البم رب جانے کے نام سے متعارف ہوا جس میں بارہ مختلف نوعیت کے پاپ میوزک سے آراستہ گانے' غزلیں اور نغمے شامل تھے۔ جس میں تیرے نال' بھول جا' ترچھی نظر' آس پاس' روشنی کا یقین' تیرے دل میں' مکھڑا' جند جان' وغیرہ شامل تھے۔ یہ البم بھی سابقہ البموں کی طرح عوام الناس میں بے حد مقبول ہوا۔ چوتھا البم 2005ء میں

لانچ کیا گیا جس کا نام "بری بات ہے"۔ تھا جس میں آنکھیں' یاد' بری بات ہے' تو بہار' تیرے بن' ہم ایک ہیں' کیسے' پاکستان بحریہ سے متعلق قومی نغمہ' شعلہ نمایاں تھے پانچویں البم پر ان دنوں کام چل رہا ہے۔ علامہ اقبال کے لئے مخصوص کردہ سال کے موقع پر کلام اقبال اتنے اہتمام سے گایا کہ شہزاد رائے کی پہچان ہی کلام اقبال بن گیا۔

ملک میں موسیقی کے نئے رجحان کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے شہزاد رائے نے بتایا کہ مقابلے کار رجحان صحت مند روایت کی علامت ہے ملک میں موسیقی کی صنعت تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ میوزک میں کمپیوٹر کا استعمال بڑھنے سے گلوکاروں کے لئے بے حد آسانیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ جبکہ میوزک کی دنیا میں نئے آنے والے نت نئی تبدیلیاں بھی اپنے ساتھ لا رہے ہیں۔ جو ایک اچھا شگون ہے۔ انہوں نے کہا کہ پہلے گائیکی کی دنیا میں موجود لوگ صرف اپنے وطن ہی تک محدود ہوا کرتے تھے۔ لیکن دور جدید نے پوری دنیا کو ایک گلوبل ولیج کی صورت دے کر جغرافیائی سرحدوں کو ساری دنیا تک وسعت فراہم کردی ہے کہ جہاں پاکستانی گلوکاروں کو پاکستان کے اندر بے حد مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہاں انہیں دنیا بھر شناسائی بھی حاصل ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ ان پاکستانی گلوکاروں کی مصروفیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اگر آج کوئی پاپ گلوکار لاہور میں پرفارم کر رہا ہے تو اگلے ہفتے لندن میں اس کا پروگرام ہوتا ہے وہاں سے وطن پہنچنے سے پہلے ہی امریکہ کینیڈا دوبئی متحدہ عرب امارات میں پروموٹروں کے توسط سے پروگرام ترتیب پا چکے ہوتے ہیں چنانچہ پاپ گلوکار کی زندگی اتنی مصروف ہو چکی ہے کہ نئے ویڈیو اور البم پر کام کرنے کے لئے ان کے زیادہ وقت نہیں بچتا۔ شہزاد رائے نے مزید بتایا کہ میں جہاں اپنے ویڈیوں کے ذریعے عوام الناس بالخصوص نوجوان نسل کو امن ومحبت کا پیغام دیتا ہوں وہاں اپنی گائیکی کے ذریعے کلام اقبال کو متعارف کروانے کا کریڈٹ بھی مجھے ہی جاتا ہے۔ اس حوالے سے ممتاز سماجی رہنما عبدالستار ایدھی کا گراں قدر تعاون مجھے ہر قدم پر حاصل رہا ہے اس

تعاون کو بطور مثال اس طرح پیش کیا جاسکتا ہے کہ ایدھی پہلی مرتبہ کسی گانے میں بذات خود نمودار ہوئے جو یقیناً میرے لئے ایک اعزاز سے کم نہیں جس پر میں ان کا تہہ دل سے مشکور ہوں انہی عظیم سماجی شخصیات کی قربت میں رہ کر میں نے ایک غیر سرکاری تنظیم (زندگی) کی بنیاد رکھی زندگی ٹرسٹ کے قیام کا مقصد تعلیم کو بطور خاص ایسے بچوں تک پہنچانا ہے جو وسائل کی عدم دستیابی کی بنا پر تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کر سکتے اور عمر بھر کے لئے ناخواندہ رہ جاتے ہیں ابتدائی طور پر ملک کے مختلف علاقوں میں سات سکول قائم کئے گئے تھے جس میں سے دو کراچی' دو لاہور اور دو راولپنڈی میں تھے چونکہ ہمیں زندگی کے پلیٹ فارم پر پاکستانی عوام کا بھرپور اعتماد حاصل رہا ہے بلکہ دن بدن اس میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ اس لئے اب ان سکولوں کی تعداد بڑھ کر 36 ہو چکی ہے 13 کراچی' 11 لاہور' 12 اسلام آباد کے پسماندہ اور کچی آبادیوں میں قائم ہیں جہاں کے لوگ اپنے کی وسائل کی بنا پر بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے سکول نہیں بھیج پاتے ان سکولوں میں تعلیم کے لئے ہر آنے والے بچے کو صرف تین گھنٹے سکول میں پڑھنے کے عوض بیس روپے روزانہ ادا کئے جاتے ہیں تاکہ پڑھنے کی وجہ سے اس بچے کی محنت اور مزدوری کا جو نقصان ہوتا ہے اسے کسی حد تک پورا کیا جاسکے اور وہ بچے جو صرف تعلیمی اخراجات برداشت نہ ہونے کی بنا پر سکول نہیں جاسکتے ان کی "زندگی" کے پلیٹ فارم پر ہر ممکن سرپرستی کی جائے۔ اس وقت تک دس ہزار بچے زندگی ٹرسٹ کے زیر اہتمام سکولوں میں سہ پہر کے وقت تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

یہاں یہ ذکر بے محل نہیں کہ "زندگی" کے پلیٹ فارم پر صرف تعلیم پر ہی خصوصی توجہ مرکوز نہیں کی جا رہی بلکہ جب بھی ملک وقوم پر کوئی آفت ٹوٹتی ہے تو "زندگی" ٹرسٹ نے ممکن حد تک متاثرہ اور مصیبت زدہ افراد کی مدد کی۔ شہزاد رائے کے مطابق اس کے باوجود کہ پاکستان اور بھارت کے مابین ہمیشہ سے تعلقات خوشگوار نہیں رہے انہوں نے تعلقات کو نئی جہتوں سے متعارف کروانے کے لئے بھارتی گلوکار سکھبیر سنگھ کے ساتھ ایک گانا جس کے بول (بری بات تھے) گایا اس گانے میں چھوٹی سی بات پر دو بھائیوں میں لڑائی جھگڑے کا تاثر دیا گیا تھا لیکن بڑوں کی لڑائی کے باوجود بچے پھر ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں جن دنوں یہ گانا الیکٹرونکس میڈیا پر کثرت سے نشر کیا جا رہا تھا اتفاق سے انہی دنوں بھارتی وزیر اعظم' خیر سگالی دورے سے پاکستان آرہے تھے گویا دوستی اور باہمی محبت کی جو فضا دونوں ملکوں کے مابین حکومتی سطح پر استوار ہو رہی تھی

شہزاد نے کوشش کی کہ فن کی دنیا میں بھی دوستی کے اس رشتے کو اور مضبوط کر دیا جائے شہزاد کے مطابق میری اس پیشکش کو ہر سطح پر بے حد سراہا گیا چونکہ اس کا میوزک بھی میں نے خود ہی دیا تھا اس لئے آج بھی اسکی بازگشت میرے ذہن میں موجود ہے جبکہ اس کا اہتمام شانی اور شجاع نے کیا تھا۔

اسی طرح ایک اور گیت جس کے بول (کیسے) تھے ہر سطح پر اس لئے پسند کیا گیا کہ اس میں امت مسلمہ کو متحد ہو کر تمام چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کا پیغام دیا گیا تھا اگر ہم خلوص دل سے کاوشیں کریں تو اللہ تعالیٰ بھی شرف قبولیت بخشتا ہے اس البم میں کل بارہ گانے تھے جن میں سے کچھ میوزیکل اور کچھ مختلف قسم کے سانگ تھے پاکستان بحریہ کے حوالے سے ایک ترانہ جو میں نے گایا تھا (طوفان اٹھے جہاں میرا مسکن وہاں) بطور خاص بحریہ کے افسروں اور جوانوں کے ساتھ قوم کی یکجہتی کی علامت تھا جو ہماری وسیع سمندری سرحدوں کی حفاظت کرتی ہے بلکہ دشمن سے ہمیں تحفظ بھی فراہم کرتی ہے اس ترانے کا میوزک ندیم شاہ نے کمپوز کیا تھا جبکہ کمپوزنگ کے تمام تر انتظامات شانی نے کئے اور احسن رحیم نے اسے ڈائریکٹ کیا اس میں چونکہ سٹوڈیو سے باہر سمندری جہازوں، ہیلی کاپٹرز اور پاکستان کی بحریہ کی چند اہم تنصیبات کے مناظر بھی فلمائے جانے تھے اس لئے اس اہم ذمہ داری سے بہترین ٹیم ورک کے نتیجے میں ہی عہدہ برآ ہوا جا سکتا تھا مجھے خوشی ہے کہ قوم نے ہماری اس کاوش کو ساری بے حد پسندیدگی سے نوازا۔

شہزاد رائے سے جب پسندیدہ گلوکاروں کے بارے میں پوچھا گیا جن سے وہ متاثر ہیں تو انہوں نے عابدہ پروین اور ممتاز گلوکار مہدی حسن کا نام لیا انہوں نے کہا کہ جہاں عابدہ پروین کی گائیکی میں صوفیا کرام کا دلوں کو چھو لینے والا کلام سننے کو ملتا ہے وہاں مہدی حسن کی غزل گوئی مجھے بے حد متاثر کرتی ہے جبکہ کلام اقبال میرے پسندیدہ کلام میں شامل ہے اور جب بھی مجھے وقت ملتا ہے میں مسلم امہ کے لئے علامہ اقبال کا کلام ضرور پڑھتا ہوں جسے پڑھ کر مجھے دلی سکون میسر آتا ہے۔

شادی کے بارے میں جب سوال کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ ابھی دو سال اور لگیں گے شادی میں میری پسند بھی شامل ہو گی لیکن فیصلہ والدین حتمی تصور کیا جائے گا انہوں نے کہا کہ شادی سے زیادہ اہم کام وہ ہے جو زندگی ٹرسٹ کے پلیٹ فارم پر پاکستان کے ان غریب اور محنت کش بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے کر رہے ہیں بلکہ صلاحیتوں اور اہلیتوں کو زندگی کی مثبت راہوں پر گامزن کرنے کی جستجو کی جا رہی ہے۔

حالانکہ گلوکاری کا پیشہ بہت ہی مصروف ترین ہے لیکن سماجی خدمت کے لئے وقت نکالنا میری اولین ترجیح ہے۔ انہوں نے کہا کہ 8 اکتوبر 2005 کو شمالی علاقہ جات میں جو قیامت خیز زلزلہ آیا تھا اور اس میں 80 ہزار کے لگ بھگ انسانوں نے جانوں کا نذرانہ پیش کیا ڈیڑھ لاکھ عورتیں بچے اور مرد شدید زخمی ہوئے چار سے پانچ لاکھ تک مکانات ملبے کا ڈھیر بن گئے۔ مصیبت کی اس گھڑی میں جہاں ساری قوم نے اپنے دکھی بھائیوں کی مدد کے لئے دل کھول کر رکھ دیئے وہاں زندگی ٹرسٹ کے زیر اہتمام بھی ممکن حد تک امدادی سرگرمیوں میں حصہ لیا گیا جس کے اعتراف میں ماہ جون 2006ء میں صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف نے مجھے تمغہ ایثار عطا کیا جبکہ اس سے پہلے حکومت پاکستان کی جانب سے میں تمغہ امتیاز بھی حاصل کر چکا ہوں جسے میں اللہ تعالیٰ کا خود پر احسان تصور کرتا ہوں۔

مستقبل کے حوالے سے جب شہزاد رائے سے سوال کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ علم کی روشنی ملک کے کونے کونے تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ ہیلتھ کیئر سنٹرز کے ملک بھر میں قیام کا پروگرام ہے جس کے لئے مجھے بہت والنٹئر درکار ہیں میں تمام پاکستانی باصلاحیت نوجوانوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ علم کی روشنی اور صحت کی بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے لئے عملی طور پر میرا ساتھ دیں اگر اللہ نے چاہا تو کوئی بچہ پاکستان میں علم کے بغیر نہیں رہے گا جبکہ علاج کی سہولتوں سے کوئی غریب محروم نہیں رہے گا انشاء اللہ۔ اس وقت کراچی میں زندگی ٹرسٹ کے زیر اہتمام ایک ڈسپنسری کام کر رہی ہے جہاں سے بے شمار لوگ علاج معالجے کی سہولتیں کر رہے ہیں لیکن جوں جوں اس حوالے سے فنڈ میسر آتے گئے تو ملک کے مختلف شہروں میں ہسپتالوں کی تعمیر کا کام بھی شروع کر دیا جائے گا۔

# برصغیر پاک و ہند کے عظیم پاپ گلوکار

## عدنان سمیع

گلوکار تو پاکستان میں اتنے ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے لیکن جن چند ایک گلوکاروں کو نہ صرف پاکستان بلکہ عالمی سطح پر بے حد پذیرائی حاصل ہوئی ان میں ایک معتبر نام عدنان سمیع کا بھی ہے۔

عدنان سمیع انگلینڈ میں ایک پاکستانی گھر میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد اپنے پیشہ وارانہ فرائض کی انجام دہی کے لئے ان دنوں قیام پذیر تھے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ عدنان کے دادا عبدالسمیع خان پشاور میں ایس ایس پی تھے جبکہ ان کے نانا افغانستان کے شہر ہرات کے گورنر رہے ان کے گورنر ہرات بننے میں جو پس پردہ عوامل پوشیدہ تھے ان کے مطابق محفوظ جان کے والد احمد خان بنیادی طور پر ڈاکٹر (معالج) تھے اور پشاور میں قیام پذیر تھے۔ اس وقت کے افغان حکمران امان اللہ خاں، جب بھی بیمار ہوتے تو ڈاکٹر احمد جان کو ہی پشاور سے بلوایا جاتا۔ امان اللہ خان، ڈاکٹر احمد جان کی شخصیت قابلیت اور پیشہ ورانہ مہارت سے بے حد متاثر تھے۔ اس لئے انہوں نے1928 ڈاکٹر احمد جان کو اپنے پاس رکھنے کے لیے بطور خاص ان کے بیٹے اور عدنان سمیع کے نانا محفوظ جان کو ہرات کے گورنر کے عہدہ کی پیشکش کی جسے ڈاکٹر احمد جان نے خوشدلی سے قبول کر کے اپنے بیٹے کو گورنر ہرات کا منصب سونپ دیا پھر جب امان اللہ خان کی حکومت کا تختہ بچہ سقہ نے الٹ دیا تو گورنر ہرات محفوظ جان کو پہلے کابل کے قلعے میں قید کر دیا گیا پھر ایک سازش کے تحت قتل بھی کروا دیا۔ اس لئے یہ خاندان کابل کو خیر باد کہہ کر ایک بار پھر پشاور شہر میں آبسا۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ عدنان سمیع کی والدہ کا تعلق جموں شہر سے تھا لیکن حقائق یہ ہیں کہ ان کا آبائی تعلق سرگودھا کے قریب ایک گاؤں "جمالی بلوچاں" سے ہے۔

اقلیم اختر رانی ان کی خالہ جبکہ پاکستان آرمی کے پہلے میڈیکل چیف جنرل فاروقی ان کے ماموں ہیں جی معین الدین ان کے چچا اور صدر پاکستان کے دست راست الطاف گوہران کے چچازاد ہیں۔

خود عدنان سمیع کے والد پاکستان کے تین صدور کے ساتھ اے ڈی سی کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں۔ عدنان سمیع کے پاکستانی ہونے پر کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن وہ پاکستان میں اپنے لئے حالات ناسازگار تصور کر کے ان دنوں بھارت کے شہر بمبئی جا بسے ہیں۔ ان کے بقول فنکار کا کوئی ملک نہیں ہوتا وہ معاشرتی اور تہذیبی اختلافات سے بالاتر ہو کر اپنے فن کو پروان چڑھانے کے لئے ہر ممکن کاوشیں کرتا ہے۔ ان کی اس سوچ نے ان کو وقتی طور پر اپنا ملک "پاکستان" چھوڑنے پر مجبور کیا لیکن یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ خون میں شامل ہونے والی مٹی کی خوشبو انہیں ایک بار پھر پاکستان لائے گی۔ جو حقیقت میں ان کا اپنا وطن ہے۔ بھارتی میڈیا اور فنکارانہ دنیا کا ہمیشہ یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ پاکستان کو چھوڑ کر جانے والوں کے لئے ابتدا میں آنکھیں بچھا کر دنیا کو یہ تاثر دینے کی جستجو کرتے ہیں کہ فنکاروں کے لئے پاکستان میں حالات سازگار نہیں ہیں یا پاکستان میں فنکارانہ سوچ کو پنپنے نہیں دیا جاتا۔ میری ذاتی رائے میں ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ نصرت فتح علی خاں، مہدی حسن، ابرار الحق اور نور جہاں جیسے کئی گلوکاروں نے خود کو بھارتی فلمی دنیا کی چکا چوند روشنی (بلکہ اندھیرا کہا جائے تو زیادہ مناسب لگتا ہے) کی نذر نہیں کیا بلکہ پاکستان میں رہ کر اپنے وطن سے محبت کرتے ہوئے اپنے فن کی پہچان کروائی ہے۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ عدنان کے ساتھ سمیع کا لفظ بھی دادا کی مناسبت سے ہے۔عدنان کو آج نہ صرف ایشیاء بلکہ ساری دنیا میں پاپ سٹار موسیقار اور گلوکار کی حیثیت سے جانا اور پہچانا جاتا ہے انہوں نے 5 سال کی عمر میں پیانو بجانا سیکھی، عدنان کے بقول وہ بھارتی گلوکارہ آشا بھونسلے کو اپنا رہنما قرار دیتے ہیں اس اقرار کی پس پردہ کہانی یہ ہے کہ بچپن میں جب آشا بھونسلے لندن میں ان کے گھر آئیں تو اس وقت عدنان ابھی کمسن تھا۔عدنان کو سننے کے بعد آشا بھونسلے نے کہا کہ "عدنان اگر تم اسی طرح محنت کرتے رہے تو ایک دن تم بہت نامور کمپوزر بن جاؤ گے"

عدنان کے مطابق وہ جہاں بھی گیے آشا کے تحسینی الفاظ ان کے ذہن میں تازہ بلکہ پختہ رہے۔بعدازاں آشا عدنان کی بنائی ہوئی دھنوں کو سنتی اور انہیں پسند کرتی ایک مرتبہ عدنان نے جرات کرکے آشا کو اپنے ساتھ گانے کے لیے کہا تو آشا فوراً رضامند ہوگئیں۔یہ عدنان کی زندگی کا خوش کن لمحہ تھا۔

سمیع کے اکثر گانے محبت اور تعلق کے موضوع پر ہوتے ہیں، ان گانوں میں جذباتی پن پایا جاتا ہے۔عدنان سمیع نے یہ گانے مغربی اور مشرقی موسیقی کو مکس کرکے بنائے ہیں۔سمیع نے 5 برس کی عمر میں اپنے والد کے پیانو کو بجانا شروع کردیا تھا۔آج وہ دنیا میں تیز ترین پیانو بجانے والے مانے جاتے ہیں۔بعدازاں سمیع نے انگلینڈ کے مشہور Rugby School سے بھی تعلیم حاصل کی اور گریجوایشن کی ڈگری لندن یونیورسٹی سے حاصل کی۔کنسرٹ پیانو پلیئر کی حیثیت سے عدنان نے سویڈن اور متحدہ عرب امارات میں پرفارم کیا۔

عدنان سمیع نے کئی ایوارڈز بھی حاصل کیے ہیں۔جن میں یونیسیف کا خصوصی ایوارڈ، گریجوایٹ ایوارڈ اور اقوام متحدہ کا امن تمغہ جو افریقہ کے لوگوں کے لیے گیت لکھنے اور کمپوز کرنے کی وجہ سے عدنان سمیع کو بطور خاص دیا گیا۔آیئے ان کی کامیابیوں کی کہانی انکی اپنی زبان سنتے ہیں۔

سوال: ہر فنکار عروج پانے کے خواب دیکھتا ہے اس وقت دنیا میں آپ کا جتنا نام اور کریز ہے کیا آپ نے کبھی اس قدر سوچا تھا؟

عدنان سمیع: (اپنی مخصوص مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے) بالکل نہیں......شاید اس طرح سے جیسے جارج اسٹفین سن انجن بنانا نہیں چاہتے تھے۔مگر ان کی دیوانگی نے انہیں یہ راستہ دکھایا اور وہ انجن کے موجد بن گئے، فنکار اپنے عشق اور جنون میں اپنے فن کو پوج رہا ہوتا ہے، اسے ہوش نہیں ہوتی کہ اسے اپنے فن کی مارکیٹنگ بھی کرنی چاہیے مگر اوپر والا اسے اسکی سچائی کا انعام ضرور دیتا ہے۔

سوال: "تیری اونچی شان ہے مولیٰ" نے آپکو ایشیاء سمیت پوری دنیا میں مقبول اور فیورٹ بنا دیا ہے، اسکے بعد آپکے دوسرے البم "تیرا چہرہ" نے آپ کی کامیابیوں کے گراف کو اور بڑھایا، اپنے پہلے البم کے متعلق بتائیں جو لاہور میں ریکارڈ ہوا اور غالباً یہ میوزک جسے آپ نے بھارت سے کیسٹ کی صورت میں ریکارڈ کیا اصل میں فلم ساز ایس بی حسین کی فلم "برسات" کے لئے ریکارڈ کیا گیا تھا؟

عدنان سمیع: یہ بالکل درست ہے میرا پہلا البم پاکستان میں ساؤنڈ ماسٹر نے ریلیز کیا تھا، فلمساز ایس بی حسین "برسات" کے نام سے ایک فلم بنانا چاہتے تھے۔بعدازاں اسکا نام "موسم" اور پھر "بدلتے موسم" فائنل ہوا تھا، میں نے انہیں واضح کیا تھا کہ میں ان کے لئے میوزک ضرور بناؤں گا مگر فلم کے آڈیو کے ساتھ ان کا ان کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔یہ میوزک میرا ہوگا، ریاض الرحمٰن ساغر نے اس کے تمام گیت لکھے تھے، جہاں ہم نے (1) کبھی تو نظر ملاؤ (2) بھیگی بھیگی راتوں میں (3) پہلی واری نہر والے پل تے ملی (4) دل تو میرا گھڑیاں گنے (5) مجھ کو بھی تو لفٹ کرادے سمیت دوسرے گیت شامل تھے۔جہاں تک "لفٹ کرادے" کی بات ہے تو اسکے متعلق بتاؤں یہ میرا آئیڈیا تھا جسے ریاض الرحمٰن ساغر نے بہت خوب لکھا، میں نے

انہیں ایک بہت پرانی انگریزی فلم دکھائی جس میں ایک کردار خلق خدا کی خدمت کرتا رہتا ہے وہ ایک دن خدا سے بڑے پیار اور مان سے کہتا ہے، اے میرے خدا میں تیرے بندوں کی اتنی خدمت کرتا رہتا ہوں تو نے اپنی دنیا میں لاکھوں اور کروڑوں ایسے ویسوں کو دیا ہے مجھے بھی عطا کر، وہ شخص اپنے پروردگار سے گاڑی، بنگلہ، جہاز اور بنک بیلنس مانگتا ہے، جب میں نے ساغر صاحب کو یہ فلم دکھائی تو انہوں نے یہ گیت لکھا، میرا ایمان ہے کہ یہ گیت میرے دل سے نکلی سچی دعا تھی جسے میرے مولی نے قریب ہو کہ سنا اور مجھ پر اپنے مال و دولت کے چھپر پھاڑ دیئے۔

پرانی انگریزی، ہندی اور اردو فلمیں دیکھنے کا جنون کی حد تک مجھے شوق تھا لاہور میں سید نور کی فلم ''سرگم'' میں کام کر کے میں نے بڑا انجوائے کیا، فلم میں ڈبنگ اداکار شان کی تھی اس بات کا اعتراف میں بلاشبہ کرتا ہوں کہ میں نے پاکستانی ہونے سے کبھی انکار نہیں کیا اور نہ ہی بھارت میں مجھے کسی نے پاکستانی سمجھ کر تنگ کیا ہے، بھارت ایک سیکولر نظریات کا حامل ملک ہے اور خاص طور پر فلم انڈسٹری میں سب لوگ مل جل کر رہتے ہیں، یہ سچ ہے کہ مجھے ''ایکٹنگ'' کا جنون ہے اور اپنے اس شوق کی تسکین اس وقت بھی ہوئی جب مجھے ایکٹنگ کے بادشاہ امیتابھ بچن کے ہمراہ کیمروں کے سامنے کھڑا کر دیا گیا، خدا کا شکر ہے ''مولیٰ کبھی مجھے چھوڑ نا نہیں'' والی ویڈیو میں مجھے امیتابھ بچن کے سامنے بے حد پسند کیا گیا اس کے لئے میں اپنے چاہنے والوں کا بھی بے حد ممنون ہوں۔ اگر بھارتی اور پاکستانی میڈیا کا موازنہ کیا جائے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ بھارتی میڈیا پروگریسو ہے جبکہ اس کے برعکس پاکستانی میڈیا دنیا میں پیدا ہونے والے نئے نظریات اور رجحانات کو قبول نہیں کرتا، وہ ان تجربات اور تکنیک کو بھی قبول نہیں کرتا جنہیں اپنانے سے آپ کی نظریاتی اساس بھی متاثر نہیں ہوتی، پاکستان اور بھارت دونوں ملک دنیا کے نقشے میں ساتھ، ساتھ ہیں انہیں یہیں رہنا ہے 60 سال سے زیادہ عرصہ تک ان اصولوں کو آزما لیا گیا ہے لہٰذا اب غور کرنا چاہئے کہ ہمیں نئی صدی میں کیسے جینا ہے جنگ کر کے یا آپس میں محبت اور پیار سے۔

سوال: آپ جب اپنے اگلے البم پر کام کر رہے تھے اس وقت کیا آپ لوگوں کی بہت زیادہ توقعات کی وجہ سے دباؤ کا شکار تھے؟

عدنان سمیع: جیسے کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ ''کبھی تو نظر ملاؤ'' کے حوالے سے زبردست ردعمل دیکھنے میں آیا تھا۔ لیکن اس کامیابی کی وجہ سے مجھ پر کچھ اتنا زیادہ دباؤ نہیں تھا۔

سوال: آپ کے پہلے البم ''کبھی تو......'' اور ''تیرا چہرہ'' کی موسیقی کے درمیان مماثلت نظر آتی ہے۔ کیا آپ نے ایسا اس مقصد کے لیے کیا کہ لوگ آپ کے سٹائل سے واقف رہیں؟

عدنان سمیع: ''کبھی تو نظر ملاؤ'' سے اس بات کی عکاسی ہوتی ہے کہ اس وقت میں کیا سوچتا تھا۔ ''تیرا چہرہ'' اس بات کا عکاس ہے کہ اب میں کیا سوچتا ہوں۔ اگر اس میں کسی قسم کی کوئی مماثلت ہے تو یہ غیر ارادی ہے۔

سوال: آپ نے رانی مکھرجی کو ویڈیو کے لیے کیوں منتخب کیا؟

عدنان سمیع: جب میں نے اپنی سوچ کو حتمی شکل دی تھی تو میری خواہش تھی کہ مجھے ایسا چہرہ ملے جو اپنی آنکھوں سے جذبات کا اظہار کرتا ہو۔ اس تصور کے حوالے سے میرے ذہن میں جو پہلی تصویر ابھری وہ رانی مکھرجی کی تھی۔ اس کا شکریہ کہ وہ راضی ہو گئی اور ایسا چہرہ ثابت ہوئی جس کی مجھے تلاش تھی۔

✿✿✿

# پشتو' اُردو اور پنجابی کے پاپ اور لوک گلوکار

## رحیم شاہ

بے شک رحیم شاہ کا آبائی گھر صوبہ سرحد کے خوبصورت گوشہ ''سوات'' میں ہے لیکن ایک عرصہ ہوا آپ کے خاندان کے لوگ کاروباری سلسلے میں کراچی آ بسے جہاں رحیم شاہ اپریل 1976 میں ہوئے زندگی کا بڑا حصہ کراچی میں گزارنے کی وجہ سے اُنہیں پشتو اور اُردو سمیت کئی زبانوں پر عبور حاصل ہے اُردو اتنی اچھی بولتا ہے کہ ان کی گفتگو میں پشتو کا عنصر بالکل دکھائی نہیں دیتا۔ گائیک گھرانے سے تعلق نہ رکھنے کے باوجود بچپن سے گانے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔

رحیم شاہ نے گائیکی میں اپنے کریئر کا آغاز 1990 میں شروع کیا کسی بینڈ کا حصہ بننے کی بجائے انہوں نے تنہا گانا پسند کیا اور ابتداء ہی میں ان کا ایک گانا (غم) بہت مشہور ہوا جس نے رحیم شاہ کو نہ صرف شہرت کی بلندیوں پر پہنچایا بلکہ اس گانے نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے حالانکہ (غم) رحیم شاہ کی اپنی کمپوزیشن نہیں تھا بلکہ یہ ایک افغانی لوک گیت یا ٹپہ تھا جو ایک بے نام سنگر نے گایا تھا اس کے بعد اس گانے کو مشہور پشتو گلوکار (ہارون بچہ) نے گایا لیکن یہ گانا قابل ذکر مقبولیت حاصل نہ کر سکا یہ اعزاز صرف رحیم شاہ کو جاتا ہے کہ جنہوں نے اس ٹپے نما گانے کو اُردو زبان میں تبدیل کر کے ہمیشہ کے لئے امر کر دیا لیکن (غم) جیسے پاپولر گیت کو کمپوز کرنے میں اُنہیں سلمان علوی کا تعاون حاصل کرنا پڑا۔ جن کی نگرانی میں رحیم شاہ نے البم ریکارڈ کروایا اور اس دوران اُنہوں نے کوشش کی کہ اس البم کو دوسروں سے مختلف رکھیں یہ گانا سپر ہٹ ہوا جس نے بھی سنا اس نے اسے پسند کیا۔

یہ بات رحیم شاہ کو اس وقت ناگوار گزری جب ان کے اس مقبول عام گانے کو ایک بھارتی گلوکار ''الطاف راجہ'' نے چرایا اور اس گانے کو سیڑھی بنا کر انڈیا کے ہر چینل پر بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ رحیم شاہ کے مطابق پاکستان میں دنیا کے بہترین میوزیشن موجود ہیں۔ وہ اہلیت کے اعتبار سے کسی بھی جگہ اور دنیا کے کسی بھی گلوکار کے ساتھ پرفارم کر سکتے ہیں۔ ابتدائی سالوں میں بیماری کی وجہ سے میوزک کے لئے کام نہ کر سکے لیکن اب میں اسی طرف توجہ مرکوز کر رہے ہیں۔ رحیم شاہ نے کہا کہ میں پٹھان ضرور ہوں لیکن میری پہچان پاکستان ہے۔ ان کے مطابق ابرارالحق دور حاضر کا سب سے بڑا پاپ گلوکار ہے انہوں نے کہا کہ میں نے ہمیشہ لائیو پرفارم کیا ہے۔ اس وقت تک رحیم شاہ کی کل آٹھ البم ریلیز ہو چکے ہیں جن میں سے چار پشتو اور چار اُردو میں ہیں۔

رحیم شاہ نے اس کے بعد ایک پشتو البم ریلیز کیا جو بہت ہٹ ثابت ہوا اس کے بعد ایک اور البم ریلیز کیا جس کا ٹائٹل سہارو تھا اس البم میں بہت اچھے گانے شامل تھے۔ جیسے ٹپ ٹپ اور پائل بعد ازاں اسی سال اس نے ایک پشتو البم پر کام کیا اسی اثنا میں رحیم نے کچھ عرصے کے لئے مزید کسی البم یا گانے پر کام نہ کیا اس کا فائدہ یہ ہوا کہ لوگ اس کے نئے گانے اور البم کا شدت سے انتظار کرنے لگے وقفے کے بعد ان کا جو البم منظر عام پر آیا اس کا نام چنا تھا بعد ازاں اُنہوں نے تین مختلف ویڈیوز پر کام شروع کیا جن میں سے دو پریا اور رنگلی مہندی شامل تھا جسے سرور نے مکمل کیا جبکہ ''تیرے عشق'' کو سہیل جاوید نے ڈائریکٹ کیا ''جھولا'' رحیم شاہ کا پسندیدہ ترین گانا ہے یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ رحیم شاہ سب سے زیادہ اپنی

ماں سے پیار کرتا ہے اور اسی کے پیار میں ہمیشہ کھویا رہتا ہے۔

رحیم شاہ کے مطابق ان کی پہلی اور آخری البم میں صرف اور صرف میوزک کمپوزیشن کا ہی فرق ہے ابتدا میں وہ پلے بیک سنگر بننا چاہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے زیادہ مقبولیت عطا کردی جس کی تمنا انہوں نے اپنے دل میں کی تھی رحیم شاہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بہت کم لوگ ہیں جو پروفیشنل میوزک پر کام کر رہے ہیں کچھ کمرشل میوزک بنانا چاہتے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہے ان کا گانا سپرہٹ ہو جائے جس کے کچھ الفاظ بہت مقبول عام ہو جائیں۔

رحیم شاہ نے اپنی ایک البم پر کام شروع کیا ہے جسے مکمل کرنے میں ابھی ایک سال لگے گا یہ ٹی ایم کمپنی کی مدد سے ریلیز ہوگا جس میں انہوں نے اپنے گانوں کو حقیقی میوزک دینے کی کوشش کی ہے یہ البم فلمی میوزک لوک میوزک اور پاپ میوزک پر مشتمل ہے اس کے ساتھ ساتھ رحیم شاہ اپنے ویڈیوں پر بھی کام کر رہے ہیں۔

# ہر دلعزیز پاپ گلوکار

## فاخر محمود

وہ آیا، اس نے دیکھا اور فتح کر لیا لیکن اس شخص کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں ہوگا، کیوں کہ وہ آیا، اس نے دیکھا، لکھا، سُروں کو جگایا، گانا گایا، پرفارمنس دی اور پھر فاتح بن گیا۔ یہ شخص معروف پاپ گلوکار، فاخر محمود ہے۔ موسیقی ان کی رگ رگ میں بسی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ موسیقی سمجھائی نہیں جاسکتی اسے سنا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔''

فاخر صرف گلوکار ہی نہیں بلکہ کمپوزر اور شاعر بھی ہیں۔ بہ ظاہر سخت مزاج نظر آنے والا یہ شخص ہنس مکھ اور خوش مزاج ہے لیکن اپنے کام کے معاملے میں خاصا سنجیدہ ہے شاید اسی وجہ سے ناقدین نے انہیں Pakistan's latest Pop sensation کے خطاب سے نوازا ہے۔ فاخر نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز 1992ء میں کیا۔ اس وقت وہ معروف پاپ گروپ ''آواز'' میں شامل تھے۔ مئی 1993ء میں اس گروپ کا پہلا البم ''آواز'' جنوری 1995ء میں، دوسرا البم ''جادو کا چراغ'' اور اگست 1996ء میں تیسرا البم اور آخری البم ''شعلہ'' ریلیز ہوا۔ بعد ازاں ''آواز گروپ'' ٹوٹ گیا اور پھر فاخر نے تنہا اپنے کیریئر کا آغاز کیا اور اپنا الگ البم ''آتش'' ریلیز کیا، جس میں دس گانے ہیں۔ فاخر 20 اپریل کو اسلام آباد میں پیدا ہوئے۔ پیشے کے اعتبار سے الیکٹریکل انجینئر ہیں۔ ان کا ایک بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ فاخر سے کیے جانے والے انٹرویو کی تفصیل قارئین کی نذر ہے۔

**سوال:** الیکٹریکل انجینئر بننے کے بعد ہاتھوں میں گٹار کیوں تھام لیا؟

**فاخر محمود:** میں نے سات برس کی عمر میں گٹار خرید کر موسیقی کی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ پڑھائی تو چلتی رہی لیکن موسیقی سے میرا لگاؤ کم نہ ہوا۔ انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد سوچا کہ میرا مستقبل موسیقی ہی سے وابستہ ہے۔ بہ حیثیت الیکٹرانک انجینئر موسیقی کے برقیاتی آلات مجھے اپنی طرف متوجہ کرتے تھے اور بالآخر میں نے کراچی میں اپنا اسٹوڈیو قائم کر لیا۔

**سوال:** اسٹوڈیو کا نام Twentyfour Seven رکھنے کی کوئی خاص وجہ؟

**فاخر محمود:** دراصل میرا اسٹوڈیو ہفتے میں سات دن چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے یہاں 24 گھنٹے مسلسل کام ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے اس سے زیادہ مناسب نام نہیں ملا۔

**سوال:** آج کل پاپ گلوکاروں کے گائے ہوئے گانوں کو فلموں میں لینے کے رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

**فاخر محمود:** میرے خیال میں یہ رجحان اچھا ہے۔ ہماری فلم انڈسٹری میں کام کرنے والے لوگ ذمے دار ہیں اگر وہ کسی گلوکار کے گانے اپنی فلم میں شامل کر رہے ہیں تو اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کریں گے۔ ہماری فلمیں لوگوں میں بہت مقبول ہیں۔

**سوال:** اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کے کسی گانے کو کوئی فلم ساز اپنی فلم میں شامل کرنا چاہے تو آپ فوراً راضی ہو جائیں گے؟

فاخر محمود: میں پہلے فلم دیکھوں گا کہ کیسی ہے۔ ٹیم کیسی ہے؟ پروڈکشن صحیح ہے یا نہیں، اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔

سوال: کلاسیکل گلوکاروں کا کہنا ہے کہ آواز میں نکھار پیدا کرنے کے لیے ریاض بہت ضروری ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

فاخر محمود: یہ بات درست ہے۔ میں بھی لے درست رکھنے کے لیے ریاض کرتا ہوں۔

سوال: دن میں کتنے گھنٹے ریاض کرتے ہیں؟

فاخر محمود: آدھا گھنٹہ۔

سوال: دن کا آغاز کب ہوتا ہے؟

فاخر محمود: میرے دن کا آغاز دوپہر ایک بجے ہوتا ہے، ناشتہ کرتا ہوں، تھوڑا ریاض کرتا ہوں، پھر جاگنگ کے لیے پارک چلا جاتا ہوں اور اپنے کام میں مصروف ہو جاتا ہوں۔

سوال: اپنی ڈائٹ کا خیال رکھتے ہیں؟

فاخر محمود: جی نہیں۔ جو چیز مل جاتی ہے، کھا لیتا ہوں۔

سوال: سالگرہ مناتے ہیں؟

فاخر محمود: اگر سالگرہ والے دن مصروف نہ ہوں تو منا لیتا ہوں، لیکن بعض اوقات مصروفیت کی وجہ سے یہ دن بھی یاد نہیں رہتا۔

سوال: موت سے خوف آتا ہے؟

فاخر محمود: موت برحق ہے لیکن پھر بھی اس کا تصور کر کے خوف آتا ہے۔

سوال: جانور پالنے کا شوق ہے؟

فاخر محمود: جی ہاں، بالکل میرے پاس ایک کتا ہے جس کا نام Simba ہے۔

سوال: آپ کا قیمتی اثاثہ؟

فاخر محمود: میرا خاندان۔

سوال: کتابیں پڑھنے کا شوق ہے؟

فاخر محمود: جی ہاں۔

سوال: کس قسم کی کتابیں پڑھتے ہیں؟

فاخر محمود: میں زیادہ تر فکشن کی کتابیں پڑھتا ہوں۔

سوال: زندگی کا کوئی اصول ہے؟

فاخر محمود: ایمانداری، اس خوبی یا اصول کے بغیر کامیابی کی سیڑھیاں چڑھنا بہت مشکل ہے۔

سوال: اپنی غلطی کا اعتراف فوراً کر لیتے ہیں یا نہیں؟

فاخر محمود: اگر مجھے احساس ہو جائے کہ میری غلطی تھی تو میں اعتراف کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

سوال: کبھی تفریحاً کچھ پکایا؟

فاخر محمود: جی ہاں، میں چھولے اور قیمہ بنا لیتا ہوں۔

سوال: زندگی کا خوبصورت ترین دن؟

فاخر محمود: جس دن میری سولو البم ''آتش'' ریلیز ہوئی تھی۔

سوال: کوئی ایسی عادت جس سے گھر والے بیزار رہتے ہیں؟

فاخر محمود: وقت کی پابندی کی عادت سے شاید گھر والے بیزار رہتے ہیں۔

سوال: گھر کی تزئین و آرائش میں حصہ لیتے ہیں؟

فاخر محمود: جی ہاں، بالکل لیتا ہوں، اکثر بیرون ملک جاتا ہوں تو آرائش کی اشیاء خرید لیتا ہوں۔

سوال: دوست احباب کو کھانے پر مدعو کرتے ہیں؟

فاخر محمود: جی ہاں، کرتا ہوں۔

سوال: مہمانوں کی اچانک آمد سے گھبرا جاتے ہیں؟

فاخر محمود: ہرگز نہیں، بلکہ مہمانوں کی آمد سے تو گھر کی رونق میں اضافہ ہوتا ہے۔

سوال: وطن یا شہر سے باہر جاتے ہیں تو کس چیز کو مس کرتے ہیں؟

فاخر محمود: گھر کو۔

سوال: مزاجاً نرم ہیں یا سخت؟

فاخر محمود: میرے خیال میں، میں نرم مزاج ہوں۔

سوال: کس ڈریس ڈیزائنر کے کپڑے پہنتے ہیں؟

فاخر محمود: دیپک پروانی۔

سوال: کبھی رشوت دے کر کوئی کام کرایا؟

فاخر محمود: مجھے رشوت سے شدید نفرت ہے۔ لیتا ہوں نہ دیتا ہوں۔

سوال: کن چیزوں پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں؟

فاخر محمود: گھر کی چیزوں پر۔

سوال: ٹریفک قوانین کی پابندی کرتے ہیں؟

فاخر محمود: جی ہاں۔

سوال: کبھی رونا آیا؟

فاخر محمود: جی نہیں۔

سوال: گھریلو یا پیشہ ورانہ مسائل کس سے شیئر کرتے ہیں؟

فاخر محمود: والدہ سے۔

سوال: آپ کی دعائیں قبول ہوتی ہیں؟

فاخر محمود: میرے خیال میں ہو جاتی ہیں۔

سوال: مٹی کی خوشبو کیسی لگتی ہے؟

فاخر محمود: بہت اچھی۔

سوال: حاضر جواب ہیں؟

فاخر محمود: جی ہاں۔

سوال: لوگوں کی طویل گفتگو آسانی سے سن لیتے ہیں؟

فاخر محمود: اگر وقت ہو تو سن لیتا ہوں۔

سوال: کبھی پولیس سے واسطہ پڑا؟

فاخر محمود: جی نہیں، کبھی نہیں۔

سوال: خواتین کی آزادی کے کس حد تک قائل ہیں؟

فاخر محمود: اس حد تک کہ انہیں وہ کام کرنے دیا جائے جو وہ کرنا چاہتی ہیں۔

سوال: کبھی زندگی میں ندامت کا احساس ہوا؟

فاخر محمود: جی نہیں۔

سوال: کوئی خوشگوار واقعہ، جسے یاد کر کے آج بھی ہنسی آ جائے؟

فاخر محمود: ایسا کوئی خاص واقعہ نہیں ہے لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ آواز کے دنوں کو یاد کر کے خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ آواز گروپ میں گزارے گئے دنوں کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

سوال: "دل ربا" کی ویڈیو بناتے وقت یقین تھا کہ یہ پاکستانی پاپ انڈسٹری کی سب سے مہنگی ویڈیو ثابت ہوگی؟

فاخر محمود: جی ہاں، اس ویڈیو کی تیاری کے دوران میں بہت خوش تھا۔ اسپین کی گلیوں میں فلمبند ہونے والا یہ پاکستان کا پہلا میوزک ویڈیو تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس گانے کا ردعمل بھی مجھے بہت اچھا ملا۔

سوال: اپنے گانے کی ویڈیو بناتے وقت ڈائریکٹر کے کام میں مداخلت کرتے ہیں؟

فاخر محمود: جی نہیں، ہرگز نہیں۔ میں ڈائریکٹر کو واضح کر دیتا ہوں کہ مجھے کس قسم کی ویڈیو چاہیے۔ باقی کام ڈائریکٹر کا ہوتا ہے۔

سوال: پاکستان میں پاپ انڈسٹری کے فروغ کے لیے آپ کے ذہن میں کوئی تجویز ہے؟

فاخر محمود: میرے خیال میں نئے لوگوں کو آنا چاہیے۔ نئے نئے چینلز آ رہے ہیں، جو پاپ انڈسٹری کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ نئے باصلاحیت لوگ سامنے آ رہے ہیں۔ میرے خیال میں یہ مثبت قدم ہے، جس سے اس انڈسٹری کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

سوال: آپ کے نزدیک زندگی کیا ہے؟

فاخر محمود: میرے نزدیک زندگی ایک ایسا موقع ہے جو ماضی، حال اور مستقبل کو ایک یادگار ماضی، پرمعنی حال اور شاندار مستقبل کی تخلیق میں پل کا کام انجام دیتی ہے۔

سوال: اپنے گیتوں کی شاعری آپ خود کرتے ہیں یا نہیں۔ عوام الناس کے سامنے ہی ڈیرہ لگانے کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

فاخر محمود: گروپ ختم ہونے کے بعد میں نے ایک گیت "تیرے بنا دل نہ لگے" تیار کیا۔ صرف یہ چیک کرنے کے لیے کہ کیا عوام مجھے پسند کرتی ہے یا نہیں۔ یہ گیت میری توقع سے زیادہ پسند کیا گیا اور پھر میں نے فیصلہ کیا کہ اس میدان میں قسمت آزمائی کروں گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب مجھے ایک پل کی فرصت نہیں۔ میری آواز اور میری البم کو پسند کیا جا رہا ہے جہاں تک میری

البم کے گیتوں کا تعلق ہے تو میں نے یہ ہرگز کوشش نہیں کی کہ خود ہی گیت لکھوں۔ میں نے اچھے بول لکھوائے اور ان شاعر حضرات سے گیت لکھوائے جن کی شاعری کی دنیا میں اہمیت ہے۔ ان شاعروں میں ریاض الرحمن ساغر، صابر ظفر، جمال شاہ، نعیم الحسن اور نعیم اسد ہیں جبکہ اس البم کی کمپوزیشن میں نے خود کی ہے۔ اس البم میں جو گیت بہت مقبول ہوئے۔ ان میں دل کی باتیں کر کے دیکھیں، دل نہ لگے، مر جاؤں اور کبھی کبھی پیار میں، کے نام قابل ذکر ہیں۔

میں نے اپنے گیتوں کی کمپوزیشن 2000ء کے آخر میں مکمل کر لی تھی لیکن پھر 11 ستمبر کے واقعے کے بعد مجھے اس البم کو ریلیز کرنے میں مشکلات کا سامنا ہوا اور پھر جب حالات بہتر ہوئے تو یہ سی ڈی ریلیز ہوئی جس کے رسپانس سے حوصلہ بڑھا ہے اور اب اگلی البم کی تیاری میں لگ گیا ہوں۔

سوال: آپ کو لائیو گانے کا مزا آتا ہے یا ریکارڈنگ کا؟

فاخر محمود: میں اس بات کے حق میں ہوں کہ جہاں کنسرٹ میں عوام ٹکٹ خرید کر ہمیں سننے آتے ہیں وہاں ہمیں Live گانا چاہیے جبکہ ایسا نہیں ہوتا۔ اس طرح عوام بھی مایوس ہوتے ہیں کیونکہ عوام کے پاس ہمارے کیسٹ یا سی ڈی تو پہلے بھی موجود ہوتی ہے اگر ٹکٹ خرید کر انہوں نے کیسٹ ہی سنی ہے تو یہ سراسر زیادتی ہے اکثر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ کنسرٹ میں ٹی وی ریکارڈنگ کا سلسلہ رہتا ہے جس کی وجہ سے ہمیں مجبور کیا جاتا ہے کہ آپ کی کیسٹ چلے گی یہ بھی غلط بات ہے۔ میرے ساتھ میرے دوسرے ساتھی بھی اس بات پر خاصے نالاں ہیں کیونکہ اس کنسرٹ میں بعدازاں عوام بھی ہمیں پریشان کرتے ہیں۔ اس کا تدارک ضروری ہے کیونکہ Live گانے میں مزہ ہے۔ ہم آزاد ہوتے ہیں۔ ہمیں اسٹیج پر یا پھر عوام تک پہنچنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی لیکن اب اس میڈیا کی رفتار اس قدر تیز ہو چکی ہے کہ ہر کام کمرشل انداز میں ہو رہا ہے کیونکہ انسان ہر کام صرف اور صرف پیسے ہی کے لیے نہیں کرتا۔ میرے خیال میں عوام اور فنکار کے درمیان بددیانتی کا یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیے اور Fair Game ہونی چاہیے۔

سوال: آج کل کئی گلوکار مکس گیت گا رہے ہیں۔ ان میں کئی ایک گیت ایسے ہیں جو کہ بہت برے ہیں۔ کیا ری مکس ضروری ہے۔ گلوکار اپنے گائے ہوئے پرانے گانوں کو ری مکس کیوں نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ ایک اور چیز کہ ایک گیت لڑکی کی آواز میں گایا گیا ہے جبکہ مرد حضرات اس گیت کو مکس نہیں کر سکتے ہیں حالانکہ ماضی میں ایک نظر ڈالی جائے تو مہدی حسن کے سینکڑوں گانے یا احمد رشدی، سلیم رضا، منیر حسین کے کئی سنہرے گیت ہمارے پاس ہیں؟

فاخر محمود: میں آپ کے سوال سے متفق ہوں۔ ہمیں ان کے اچھے گائے ہوئے گانوں کو گانا چاہیے۔ اپنے اپنے Taste کی بات ہے۔ میری کوشش ہے کہ ری مکس کو اچھے Package کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کروں کیونکہ پرانے زمانے میں موسیقی کے حوالے سے ہمارے پاس جدید ساز و سامان نہ تھا۔ اب موسیقی میں بہت ترقی ہوئی ہے اور ہمارے پرانے گیت ری مکس ہو کر پوری دنیا میں دھوم مچا رہے ہیں۔ ری مکس بھی اچھا گلوکار (جس میں سر ہے اور تال کو سمجھتا ہے) اسے اچھے Package کے ساتھ گا سکتا ہے۔ شرط سر کی ہے اور اچھے میوزک کی ہے۔ اس کے علاوہ ویڈیو نے ان گیتوں کو مزید زندگی بخش دی ہے۔ کئی پرانے گیت آواز کی وجہ سے اچھے تھے لیکن ان کی موسیقی بہتر نہ تھی۔ اس کمی کو اب ہم پورا کر رہے ہیں اگر ری مکس کا رزلٹ اچھا نہ ہوتا تو آج ری مکس کا تجربہ ناکام ہو جاتا۔

سوال: آج کل کئی پاپ گلوکار مذہبی گیت زیادہ گا رہے ہیں لیکن ان کے گیتوں میں مذہبی رنگ دکھائی نہیں دیتا۔

فاخر محمود: میں اس کے حق میں نہیں ہوں اگر مذہبی رنگ لیے گیت ہے تو اس گیت کی ترجمانی اس کے ویڈیو میں دکھائی دینی چاہیے ورنہ گیت کے ساتھ گلوکار بھی بدنام ہو سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ایسے گیتوں سے کوئی بھی شخص محروم ہو۔

سوال: آج کے دور میں گانا گلیمرس ہو گیا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

فاخر محمود: جدید دور میں سیٹلائٹ نے ہر چیز کو تبدیل کر دیا ہے۔ ویژن زیادہ ہو گیا ہے۔ کچھ گیت اس لیے مقبول ہو جاتے ہیں کہ ان کا ویڈیو اچھا ہوتا ہے اور کچھ گیت برے ہو جاتے ہیں کہ ان کا ویڈیو اس گیت کی بھرپور عکاسی نہیں کرتا۔

سوال: آپ کے پسندیدہ گلوکاروں کونسے ہیں؟

فاخر محمود: مشرقی موسیقی میں بڑی مٹھاس اور پائیداری ہے البتہ مغربی ساز و سامان کے استعمال سے مشرقی موسیقی میں مزید جدت پیدا کی جا رہی ہے۔ اب وہی گیت سنا اور پسند کیا جائے گا جس میں آواز، موسیقی اور شاعری اچھی ہوگی۔ اب عوام کا Taste بہت بدل گیا ہے۔ پبلک کی Demand بھی دیکھی جائے گی۔ جو گلوکار اس معیار پر پورے اترتے ہیں وہی میرے پسندیدہ ہیں۔

سوال: گانوں کے ویڈیو کا معیار آپ کی نظر میں کیسا ہے آپ ان سے مطمئن ہیں۔

فاخر محمود: موجودہ دور میں ہمارے گانے اور ویڈیو پہلے سے بہتر دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں تک پاکستان میں بننے والے ویڈیو کا تعلق ہے تو ان میں وہ گلیمر دکھائی نہیں دیتا جو گلیمر ہمارے پڑوسی ملک کے گانوں میں دکھائی دے رہا ہے۔

سوال: پاکستانی فلموں کے حوالے سے آپ کی رائے کیا ہے؟

فاخر محمود: ہمارے ملک میں جو فلمیں بن رہی ہیں۔ ان میں مار دھاڑ زیادہ ہے۔ مرد حضرات پر گانے کم پکچرائز ہو رہے ہیں جو کہ افسوسناک ہے۔ اچھے فلمی گانوں کا نہ بننا اچھی بات نہیں، اس میں فلمسازوں کا عمل دخل زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ اب ہمارے فلمی گانوں میں بھارتی رنگ زیادہ دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور شکایت یہ بھی سننے میں آ رہی ہے کہ ہمارے فلمساز یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے گانے بھارت میں بنوائیں جبکہ گلوکاری کے حوالے سے پاکستان میں جو ٹیلنٹ ہے اتنا ٹیلنٹ بھارت میں دکھائی نہیں دیتا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے ملک کے کئی مشہور گلوکاروں کے گانے بھارت میں چوری ہونے کے ساتھ ساتھ وہاں کے ٹی وی پر بھی دکھائی جاتے ہیں۔

❋❋❋

## ہٹلر

ہٹلر جیسی متنازع شخصیت پر اس کتاب کی تالیف کا مقصد روایتی انداز میں لکھی تاریخ سے ہٹ کر تاریخ میں نئے اور تجزیاتی (Analytical) زاویے روشناس کروانا اور آج کے قاری کو تاریخ کے موضوع کی وسعت کے بارے میں باور کروانا ہے۔ ہٹلر کی زندگی، اسکے فلسفہ، قوم پرستی اور ظلم و بربریت جیسے موضوعات پر ایک مفصل کتاب جسکی تالیف میں کئی ایک دیگر کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔۔۔۔۔ ہٹلر کی تاریخ آپ کتاب گھر کے **تحقیق و تالیف** سیکشن میں جلد ہی پڑھ سکیں گے۔

# نیم کلاسیکل اور مسحور کن پاپ گلوکار

## سجاد علی

فن موسیقی کی دنیا میں شہرت کی بلندیوں تک پہنچنے کی کوشش اس راہ کا ہر مسافر کرتا ہے لیکن اس میدان میں عروج بہت کم لوگوں کے ماتھے کا جھومر بنتا ہے۔ دنیا میں آنے والا ہر انسان اپنی خواہشات کی تکمیل چاہتا ہے اور ان کے حصول کے لیے تمام عمر تگ و دو کرتا ہے لیکن کامیابی و کامرانی انہی کے قدم چومتی ہے جو سچے جذبے کے تحت محنت کا عزم رکھتے ہیں۔ خوبصورت آواز ہر دل کو بھلی لگتی ہے اور اگر آواز میں سوز ہو تو وہ امر ہو جاتی ہے۔ نیم کلاسیکل گائیکی میں سجاد علی ایک ایسا نام ہے جو کسی تعارف اور شناخت کا محتاج نہیں۔ اپنی چھوٹی سی عمر میں ٹھمریاں گانے والا فنکار آج چھوٹے بڑوں خصوصاً نوجوان نسل میں بے حد مقبول ہے۔ کلاسیکل سے گائیکی کی ابتداء کرنے والا بچہ اسکول میں اپنی آواز سے پہچانا جاتا تھا اور پھر آواز کے قدر دانوں نے اس کی خوبصورت آواز کو لاکھوں کروڑوں لوگوں تک پہنچا دیا۔ سجاد علی کا شمار ان گنے چنے گلوکاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے بہترین کارکردگی کی بدولت گائیکی میں اپنا منفرد مقام بنایا اور گائیکی کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ان کو فن کی دنیا سے منسلک ہوئے 28 سال ہونے کو آئے ہیں ان کا یہ سفر طویل جدوجہد کی ایک انمٹ داستان ہے۔

سجاد علی کو بچپن سے ہی گانے کا شوق تھا، فنکار گھرانے سے تعلق ہونے کی بناء پر گائیکی کی ابتداء کلاسیکل سے کی۔ استاد بڑے غلام علی خان کے صاحبزادے استاد منور علی خان کی باقاعدہ شاگردی حاصل کر کے کلاسیکل موسیقی سیکھی۔ سہیل رعنا کے پروگرام ''رنگ برنگی دنیا'' میں کچھ عرصہ گایا پھر اسی پروگرام میں میزبانی کا شرف بھی حاصل کیا۔ بے شمار ٹی وی پروگرام کیے اور 12 سال کی عمر میں پہلا فلر پروگرام کرنے کا اعزاز بھی انہیں حاصل ہوا، پاکستان کی تاریخ میں پہلا میوزک ویڈیو تیار کرنے کا سہرا بھی انہی کے سر جاتا ہے۔ گلوکاری میں نئی جہتیں متعارف ہو چکی ہیں لیکن سجاد علی نے نیم کلاسیکل موسیقی ہی کو اپنی پہچان بنایا۔ ان کے 20 سے زائد البم مارکیٹ میں آ چکے ہیں۔ سجاد علی کی فنی و ذاتی زندگی کے حوالے سے فیملی انٹرویو پیش خدمت ہے۔

**سوال:** آپ نے گانے کی ابتداء کب سے کی؟

**سجاد علی:** چھوٹی عمر سے ہی گا رہا ہوں اور بچپن سے ہی پروفیشنل ہوں۔ موسیقی کی ابتداء کلاسیکل سے شروع کی۔ آٹھ نو سال کی عمر میں ٹھمریاں گاتا تھا۔ سہیل رعنا کے پروگرام ''رنگ برنگی دنیا'' میں کچھ عرصہ گایا پھر اسی پروگرام میں میزبانی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ کراچی سے اسلام آباد خصوصی طور پر اس پروگرام کے لیے آتا تھا، حالانکہ اس وقت میں خود بھی بچہ تھا مگر میں سب بچوں کو لیڈ کرتا تھا۔ انہی دنوں ٹی وی کا سلور جوبلی پروگرام شروع ہوا تو اس میں بھی میں نے گایا۔ اس میں شعیب منصور نے مجھ سے پرانے گانے ریکارڈ کرائے۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ ٹیلی ویژن کا پہلا پروگرام ''آپ جناب'' میں نے کیا۔ یہ 1978ء کی بات ہے۔ اس کے علاوہ میں نے ٹی وی کے بے شمار پروگرام کیے۔

**سوال:** شہرت کس گانے سے ملی؟

سجاد علی: پاکستان کی تاریخ موسیقی میں سب سے پہلا میوزک ویڈیو "بے بیا" اور دوسرا "بولو بولو کیا دیکھا" میں نے بنایا۔ ان کی ایک زمانے میں بڑی دھوم مچی۔ اس کے بعد ہی اسپانسر ویڈیوز شروع ہوئیں۔ اب تو ماشاءاللہ اس کا بہت ٹرینڈ چل گیا ہے اور میرے بھی 20 سے زائد البم مارکیٹ میں آ چکے ہیں۔ "بے بیا" ہی میری وجہ شہرت بنا۔

سوال: گائیکی کی باقاعدہ تربیت بھی حاصل کی؟

سجاد علی: گھر والوں کو جب میرے جنون کا اندازہ ہوا تو میرے تایا نے مجھے استاد بڑے غلام علی خان کے ریکارڈ دیئے، اس میں سارا کلاسیکل میوزک تھا، انہوں نے کہا کہ تم ان ریکارڈز کو سن کر گانے کی کوشش کرو، اس سے سن کر میں نے کلاسیکل کی تربیت حاصل کی لیکن مجھے نیم کلاسیکل موسیقی اچھی لگتی ہے اور میری شہرت کا سبب بھی یہی ہے۔

سوال: کلاسیکل میں آپ کن سے متاثر ہیں؟

سجاد علی: استاد بڑے غلام علی خان اور استاد برکت علی خان سے بہت متاثر ہوں۔ باقی لوگوں کا شمار ان کے بعد ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں موسیقی کی درجہ بندی کی جاتی ہے، اس خطے کے بڑے لوگوں نے بھی درجہ بندی کی، میں بھی موسیقی کی درجہ بندی کا قائل ہوں۔

سوال: بیرون ملک ہر گلوکار کی مقبولیت کا الگ دائرہ کار ہے، آپ کے خیال میں اس طرح کا رجحان یہاں بھی ہے؟

سجاد علی: یہاں ہر ایک کا اپنا انداز ہے، جہاں تک عوام کا تعلق ہے تو جس کا جو گانا مشہور ہوتا ہے، اسے سننے لگ جاتے ہیں، ہمارے پرستاروں کا کوئی الگ دائرہ کار نہیں ہے، آپ یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہجوم صرف سجاد علی کو سنتا ہے، یہ ہجوم صرف حیدر علی کو سنتا ہے اور یہ ہجوم صرف جنید جمشید کو سنتا ہے، ایسا نہیں ہے، ہمارے لوگ سب کو سنتے ہیں۔

سوال: موسیقی میں بہت زیادہ کمرشل ازم آ گیا ہے، اس سے اس کی روح متاثر نہیں ہوئی؟

سجاد علی: میں آپ سے متفق نہیں ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ موسیقی میں کمرشل ازم سے اس میں نکھار آ گیا ہے، لوگوں کے لیے انتخاب آسان ہو گیا ہے، اب اگر کوئی کوالٹی نہیں دے گا تو زیادہ دیر نہیں چل سکے گا۔ باقی اچھا برا تو ہر دور میں چلتا رہتا ہے ضروری نہیں کہ ہر شخص ہر وقت اچھا ہی گا رہا ہو اور یہ بھی نہیں کہ ہر آدمی ہمیشہ برا جا رہا ہو، لیکن اچھے اور خراب میوزک کے درمیان ایک لکیر رہتی ہے، خط امتیاز ہر وقت موجود رہتا ہے۔ کمرشل ازم سے آگے بڑھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔

سوال: اپنے میوزک میں کسی سے مدد بھی لیتے ہیں؟

سجاد علی: میرا چھوٹا بھائی طارق میرا سب سے بڑا معاون ہے، میرا میوزک وہی کرتا ہے، وہ شاعری بھی کرتا ہے، شاعری تو میں خود بھی کرتا ہوں، پہلے میں غزل لکھتا تھا، گیت کی طرف بعد میں آیا۔ طارق کے لکھے ہوئے کئی گیت ہٹ ہوئے۔ بالخصوص پیسے آنے دے، اس گیت کو بڑی شہرت ملی۔

سوال: آئے دن نئے میوزک گروپ سامنے آ رہے ہیں، یہ رجحان موسیقی کے لیے کیسا ہے؟

سجاد علی: یہ رجحان کچھ عرصہ پہلے تھا، اب ایسا نہیں ہو رہا۔ کچھ عرصہ پہلے بہت سے بینڈز منظر عام پر آئے تھے، کسی کو ڈاکٹر بننا ہے۔ اسے چھ مہینے کی چھٹیاں ہیں تو اس نے بینڈ بنا لیا۔ ماضی قریب میں اس طرح بھی ہوا۔ یہ سلسلہ شروع ہوا تھا مگر اب اس رجحان کی حوصلہ شکنی ہوئی ہے۔ شوبز ایسا کام ہے کہ جس میں آپ کو اپنے دن رات، خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ اس کام کو گھر سے بھی زیادہ وقت دینا پڑتا ہے، تب اس شعبہ میں اپنے آپ کو منوا سکتے ہیں۔ بعض لوگ اس کام کو برا سمجھتے ہیں اور

کرتے بھی یہی ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ جی ہم پروفیشنل نہیں ہیں، ہم تو شوقیہ فنکار ہیں، یہ بات مجھے بڑی آگ لگاتی ہے۔ یہ دوغلا پن ہے، مجھے دوغلا پن سے نفرت ہے اگر آج موسیقی کو عزت اور احترام حاصل ہے تو یہ پروفیشنل گلوکاروں کی وجہ سے ہے۔ شوقیہ فنکاروں کی وجہ سے نہیں۔ موسیقی تو روح کی غذا ہے، اس کے بغیر زندگی کا لطف ہی نہیں۔

سوال: آپ کے گھر والوں نے کبھی کسی اور شعبے میں جانے کی ترغیب نہیں دی؟

سجاد علی: مجھے بچپن ہی سے گانے کا شوق تھا، اس لیے کبھی گھر والوں نے روکا ٹوکا نہیں۔ میرے دادا خادم حسین کرکٹر تھے جبکہ میرے والد شفقت حسین بھی کرکٹر تھے پھر وہ فلمی دنیا میں آ گئے تو ساجن کے نام سے شہرت پائی۔

سوال: فلم میں بطور ہیرو بھی تو کام کیا آپ نے؟

سجاد علی: جی ہاں ایک فلم "منڈا تیرا دیوانہ" میں بطور ہیرو کام کیا اور میری ہدایت کاری میں بھی ایک فلم "ایک اور لوسٹوری" آ چکی ہے۔

سوال: آپ نے فلم بنائی اور بطور ہیرو کام بھی کیا، مگر ان شعبوں میں آپ کو پذیرائی نہیں ملی، وجہ کیا ہے؟

سجاد علی: میں ان تجربوں کو ناکام قرار نہیں دیتا، ان شعبوں سے، میں نے بہت سیکھا اور ضروری نہیں کہ آپ زندگی میں جو بھی کام کریں کامیابی آپ کا مقدر بنے۔ میں نے ان تجربوں سے یہ سیکھا ہے کہ میرے پرستار مجھے صرف گلوکار ہی دیکھنا چاہتے ہیں شاید انہیں میرا کوئی اور روپ پسند نہیں، اس لیے میں نے فی الحال فلموں میں مزید کام کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

سوال: شوبز میں آنے کے بعد تعلیم کا سلسلہ تو رک گیا ہوگا؟

سجاد علی: حقیقت یہ ہے کہ تعلیم میں میرا جی نہیں لگتا تھا، پھر بھی میں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔ بی اے اس لیے کیا ڈگری ہونی چاہیے۔ اس لیے میرا شمار ناخواندہ فنکاروں میں نہیں کیا جا سکتا۔

سوال: آپ کے باپ دادا کرکٹر تھے، آپ فنکار بن گئے، آپ کو پچھتاوا تو نہیں کہ کاش میں بھی کرکٹر ہوتا؟

سجاد علی: بچپن میں کرکٹ کھیلتا تھا، پھر اس سے دل اچاٹ ہو گیا، دراصل میں گھر میں لاڈلا تھا، موسیقی کی طرف میرا رجحان دیکھ کر گھر والوں نے بھی حوصلہ افزائی کی، ہر وقت گنگنانا میری عادت تھی پھر یہ ضروری نہیں کہ کرکٹر کا بیٹا بھی کرکٹر ہی ہو۔ کرکٹر نہ بننے کا پچھتاوا ہرگز نہیں۔

سوال: بچپن میں سکول والوں کو آپ کی اس صلاحیت کا اندازہ تھا کہ آپ خوش الحان ہیں؟

سجاد علی: جی، میں اپنے سکول میں اپنی آواز کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا، میری اچھی آواز کی وجہ سے میرا ہوم ورک بھی چیک نہیں ہوتا تھا، پھر یہ کہ بڑا مودب اور مہذب طالب علم تھا، شرارتیں بھی بڑی معقول اور حد ادب میں کرتا تھا اس لیے سکول میں میری کبھی پٹائی نہیں ہوئی اور نہ کبھی سکول کی طرف سے والدین کو شکایت نہیں ملی۔ اپنے محلے میں بھی میری اچھے بچے کے طور پر پہچان تھی، میری وجہ سے کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی اور یہ سب کچھ میرے والدین کی تربیت کا نتیجہ تھا۔

سوال: آپ کسی دوسرے گروپ سے متاثر ہیں؟

سجاد علی: "اچھا تو جنون گروپ ہے جو صحیح معنوں میں گروپ ہے، بعض دوستوں نے مجھے بھی کہا کہ گروپ بنا لو مگر میرا اپنا اسٹائل ہے اور میں اسے ہی برقرار رکھنا چاہتا ہوں اسے میری خامی ہی کہا جا سکتا ہے، لیکن میرے ساتھ ایک مسئلہ ہے کہ جس کام میں مجھے خود مختاری حاصل نہ ہو وہ میں کرتا ہی نہیں، گروپ بنتے ہیں، ٹوٹ جاتے ہیں، ہٹلو سمیت کئی گروپ نہیں چل سکے، مائیکل

جیکسن کا کوئی گروپ نہیں ہے، میڈونا نے بھی کوئی گروپ نہیں بنایا، بہرحال مجھے تو اکیلے ہی گانا اچھا لگتا ہے۔ میں اپنی شناخت الگ تھلگ رکھنا چاہتا ہوں اور اس میں مجھے کامیابی بھی نصیب ہوئی، شائقین کی حوصلہ افزائی نے مجھے بے انتہا ہمت بخشی ہے۔

سوال: ''گائیکی میں آپ کی کامیابی کا راز کیا ہے؟''

سجاد علی: میری کامیابی کا راز یہ ہے کہ میں نے موسیقی میں صرف ایک ہی تجربہ کیا ہے اور اللہ کا کرم ہے کہ میں شاید واحد گلوکار ہوں کہ جسے 50 سال سے اوپر کے بزرگ بھی سنتے ہیں اور بچے بھی۔ نوجوان نسل بھی مجھے سن کر خوش ہوتی ہے۔ ہر طبقہ مجھے پسند کرتا ہے، ایسا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری خوش نصیبی ہے اور یہی میری کامیابی کا راز ہے۔

سوال: ''کیا فنکار کے لیے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے؟''

سجاد علی: ''کام تو کوئی بھی ہو، تعلیم بہت ضروری ہے، اصل بات یہ ہے کہ معلومات عامہ کا علم مضبوط ہونا چاہیے، یہ بنیادی چیز ہے اب جیسے میں موسیقار ہوں تو پھر کیمیا کیوں پڑھوں، اس کی کوئی تک نہیں بنتی ہے۔ اس لیے میں نے بی اے کر لیا۔ میں نے اس سے زیادہ ضرورت محسوس نہیں کی اگر کوئی ایم اے کر کے بھی ہم سے پوچھ رہا ہو تو پھر ہماری بی اے ہی ٹھیک ہے ویسے بھی پاکستان میں تعلیم کا معیار سب کے سامنے ہے۔ فرسودہ نصاب کو تبدیل کیے بغیر ہمارا معیار تعلیم بلند نہیں ہو سکتا۔

سوال: اکثر فنکار اپنی عمر چھپاتے ہیں، ''آپ کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟''

سجاد علی: میں نے اپنی عمر کبھی نہیں چھپائی، بلکہ ایک آدھ بار اخبارات میں چھپ بھی چکی ہے، میری تاریخ پیدائش 24 اگست 1966 ہے۔ عمر چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں جب شکل اصل عمر کی چغلی کھائے گی تو پھر سارا بھید خود بخود کھل جائے گا۔

سوال: ''اسٹارز پر یقین رکھتے ہیں؟''

سجاد علی: بالکل اسٹار پر یقین رکھتا ہوں اور ان کا زندگی میں بہت اہم رول ہوتا ہے۔

سوال: ''آپ کا اسٹار کیا ہے؟''

سجاد علی: ''میرا اسٹار سنبلہ virgo ہے۔''

## چند سوالات سجاد علی کی بیگم نورین سے بھی

سوال: ''نورین صاحبہ کیا آپ کو پہلے سے اندازہ تھا کہ ان سے شادی ہو جائے گی؟''

نورین: ''فرسٹ کزن ہونے کے ناطے ہمارے گھروں میں میل جول تو کافی تھا، لیکن مجھے کبھی اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ہم جیون ساتھی بن جائیں گے، اور نہ ہی رشتہ طے ہونے سے پہلے میں نے کبھی ایسا سوچا تھا۔ ہمارا بڑوں نے خود ہی رشتہ طے کیا البتہ ایک دوسرے کے گھروں میں آنے جانے سے ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ضرور تھے۔

سوال: ''رشتہ طے ہونے سے قبل گھر والوں نے آپ سے رائے تو لی ہوگی؟''

نورین: ''ظاہر ہے کہ مجھ سے رائے لی گئی۔''

سوال: ''آپ کا فوری ردعمل کیا تھا؟''

نورین: ''ایک مشرقی لڑکی کی طرح میں نے ہاں کردی، کیونکہ ہمارے بڑے یہ رشتہ طے کر چکے تھے اور اس سلسلے میں قائل بھی کر چکے تھے۔

سوال: ''سجاد علی کی ملک گیر شہرت کے بارے میں آپ کو معلوم تھا؟''

نورین: ''جی، میں جانتی تھی کہ یہ ملک بھر میں مشہور ہیں۔''

سوال: ''مشہور لوگوں سے شادی میں بڑے دھڑکے ہوتے ہیں، آپ کو بھی کوئی دھڑکا تھا؟''

نورین: ''نہیں، بالکل نہیں، مجھے کوئی دھڑکا نہیں تھا کیونکہ یہ رشتہ دونوں گھروں کی باہمی رضامندی سے طے ہوا تھا۔ اس میں دھڑکے والی کوئی ایسی بات نہیں تھی، انسان کو اپنی ذات پر بھروسہ اور خداتعالیٰ پر یقین ہو تو پھر ڈر کس بات کا ہے، پھر یہ تو اپنے تھے، ہمارے خاندان میں بہت رکھ رکھاؤ ہے پھر والدین کی تربیت بھی انسان کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتی ہے، اللہ کا شکر ہے کہ ہم اس سلسلے میں خوش قسمت ثابت ہوتے ہیں کہ والدین نے اچھی تربیت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔''

سوال: ''شادی سے پہلے کبھی ان کو سننے کا موقع ملا؟''

نورین: بچپن ہی سے ان کو سنتی چلی آ رہی ہوں، اور یہ میرے پسندیدہ گلوکار بھی ہیں۔

سوال: ''کبھی ان کی تعریف کی؟''

نورین: ''کبھی منہ سے نہیں کہا، لیکن میری پسندیدگی سے یہ بے خبر نہیں رہے ہوں گے، رشتہ طے ہونے سے قبل بھی میں انہیں شوق سے سنتی تھی۔''

سوال: سجاد علی کی مصروفیات کے باعث آپ انہیں مس کرتی ہوں گی؟''

نورین: ''یقیناً بہت یاد آتے ہیں، بچے بھی انہیں مس کرتے ہیں، بعض اوقات ان کی مصروفیات پر بہت غصہ بھی آتا ہے، مگر یہ سوچ کر پی جاتی ہوں کہ یہ سب کچھ ہمارے ہی لیے تو کر رہے ہیں، البتہ انہیں جب فراغت ہوتی ہے تو ہمیں وقت دیتے ہیں او ر آؤٹنگ بھی کراتے ہیں، جس سے سب گلے شکوے دور ہو جاتے ہیں۔

سوال: ''آپس میں انڈرسٹینڈنگ کس حد تک ہے؟''

نورین: ''کامیاب و خوشگوار زندگی کے لیے جس قدر انڈرسٹینڈنگ کی ضرورت ہو سکتی ہے اس سے کہیں زیادہ ہے ایک دوسرے سے کبھی کسی کو کوئی شکایت نہیں ہوئی۔''

سوال: ''کبھی لڑائی کی نوبت آئی؟''

نورین: ''نہیں یہ اپنے گیتوں کی طرح کول ہیں الحمدللہ کبھی تو تکرار کی نوبت نہیں آئی۔''

سوال: ''غصے کا اظہار کس طرح کرتے ہیں؟''

نورین: ''انہیں غصہ نہیں آتا، کبھی ایسی نوبت ہی نہیں آئی کہ ہمارے درمیان کوئی ناراضگی ہو۔''

سوال: ''ان کی کوئی خوبی؟''

نورین: ''ان کی یہی خوبی ہے کہ کام کے علاوہ کہیں نہیں جاتے، کام پر ہوتے ہیں یا گھر میں رہتے ہیں، ان کا کوئی حلقہ احباب نہیں، ویسے بھی یہ بلاوجہ کہیں جانا پسند نہیں کرتے۔''

سوال: ''آپ سے ڈرتے ہیں؟''

نورین: (مسکراتے ہوئے) ''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہم دونوں میں سے کوئی کسی سے نہیں ڈرتا۔''

سوال: ''خواتین گھروں میں دوران کام گنگناتی رہتی ہیں، آپ بھی ایسا کرتی ہیں۔''

نورین: ''ہاں کبھی کبھار گنگناتی ہوں، سجاد کے گیت خود بخود زبان پر مچل جاتے ہیں۔''

سوال: ''پرستاروں کے فون آنے پر آپ کو کیسا لگتا ہے؟''

نورین: ''میں آپ کے سوال کا مطلب سمجھ رہی ہوں، میں شکی مزاج نہیں ہوں، مجھے ان پر مکمل اعتماد ہے اور اعتماد کے رشتے شک و شبہات سے بالاتر ہوتے ہیں۔ ان کی مقبولیت میرے لیے باعث فخر ہے ہاں البتہ ان کے پرستاروں کے فون کم آئیں تو پریشان ہو جاتی ہوں کہ کہیں مقبولیت کا گراف تو نہیں گر گیا۔''

سوال: ''آپ کی کوئی ایسی خواہش جو انہوں نے پوری نہ کی ہو؟''

نورین: ''نہیں ایسی بات نہیں ہے، میری کوئی خواہش ایسی نہیں جو پوری نہ ہوئی، یہ میری بات کبھی رد نہیں کرتے۔''

سوال: ''آپ انہیں مشورے دیتی ہیں؟''

نورین: ''ان کے ہر گیت میں میں کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرتی ہوں، گائیکی میں وہ میرے مشوروں کو اہمیت دیتے ہیں۔''

سوال: ''بچے کتنے ہیں؟''

نورین: ''دو بیٹیاں زوعلی، نداعلی اور ایک بیٹا شبیہ علی۔''

سوال: ''بطور شوہر اور باپ سجاد علی کیسے ہیں؟''

نورین: ''بہت مخلص انسان ہیں، خوش رہتے ہیں اور خوش رکھتے ہیں، بچوں سمیت تمام گھر اور خاندان والوں سے ان کا رویہ بڑا مشفقانہ ہے۔''

❁❁❁



# چنگیز خان

چنگیز کی زندگی اور فتوحات تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جسے پڑھے بغیر تاریخ کا سفر مکمل نہیں ہوتا۔ اس کا شمار انسانی تاریخ کے عظیم فاتحین میں سے ہوتا ہے۔ گو اس کا تعلق وحشی قبائل سے تھا لیکن وہ ایک ممتاز درجے کا وحشی تھا۔ وہ صرف تلوار کی زبان ہی نہ جانتا تھا بلکہ از روئے ضرورت ٹریک ٹو ڈپلومیسی بھی بروئے کار لاتا تھا۔ 1219ء سے 1225ء تک کے درمیانی عرصے میں چنگیز نے ترکستان کے راستے ایران اور افغانستان، دوسری طرف پامیر کی پہاڑی چوٹیوں سے سندھ کے کناروں تک آذربائیجان، کاکس اور جنوبی روس کے علاقے کی مہمات سر کیں...... چنگیز خان کی تاریخ آپ کتاب گھر کے **تحقیق و تالیف** سیکشن میں جلد ہی پڑھ سکیں گے۔

# نوجوان نسل کا پسندیدہ اور شرمیلا گلوکار

## عاطف اسلم

سوال: پہلے البم کی زبردست کامیابی کے بعد کیا آپ دوسرے البم میں اپنے پرستاروں کے معیار پر پورا اُتر سکیں گے؟

عاطف اسلم: یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرے پہلے البم "جل پری" نے ریکارڈ کامیابی حاصل کی ہے اور اس کامیابی نے میری ذمہ داریوں میں حد درجہ اضافہ کر دیا ہے۔ میرے پرستاروں نے اب مجھ سے زیادہ توقعات وابستہ کر لی ہیں چنانچہ مجھے اپنے دوسرے البم پر پہلے البم کی نسبت کئی گناہ زیادہ محنت کرنا پڑ رہی ہے میرا دوسرا البم تکمیل کے آخری مراحل میں ہے جو بہت جلد مارکیٹ میں آجائے گا اپنے نئے البم کا میوزک میں نے خود تیار کیا ہے اور اس کے گانے بھی خود لکھے ہیں۔

سوال: کیا پہلے آپ کے خاندان کا کوئی فرد گلوکاری کی دنیا میں موجود تھا یا آپ ہی پہلے فرد ہیں جنہوں نے گلوکاری میں نام کمایا؟

عاطف اسلم: میرے خاندان میں اس سے پہلے کوئی شوبز میں نہیں آیا۔ شوبز میں میری آمد بھی محض اتفاقیہ ہے۔ زمانہ طالب علمی سے مجھے گٹار بجانے کا شوق تھا۔ گھر کا ماحول گانے بجانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ میں نے پہلا گانا "عادت" والدہ سے چھپ کر بنایا اور اس کے اخراجات اپنی پاکٹ منی سے پورے کیے۔ میں نے جب یہ گانا اپنی والدہ کو سنایا تو وہ حیران رہ گئی اور کہنے لگیں کہ کیا واقعی یہ تیرا گانا ہے۔ ماں کے ان الفاظ نے مجھے حوصلہ دیا اور جب یہ گانا مارکیٹ میں آیا تو کامیابی اس کا مقدر بنی۔ میرا حوصلہ بڑھا اور میں نے باقاعدہ گلوکاری شروع کر دی پہلا البم جل پری ریلیز کیا جس نے ریکارڈ کامیابی حاصل کی۔ میری شہرت پاکستان کے سرحدیں پار کر گئی اور میرے گانے بالی وڈ اور ہالی وڈ کی فلموں میں شامل کر لئے گئے۔

سوال: بالی وڈ اور ہالی وڈ کی کن فلموں میں آپ کے گانے شامل کیے گئے؟

عاطف اسلم: بالی وڈ کی دو فلموں زہر اور کل یوگ' جب کہ ہالی وڈ کی ایک فلم مین پشن کارٹ میں میرے گانے شامل کیے گئے ہیں۔

سوال: آپ کس میوزیشن سے متاثر ہیں؟ کیا آپ نے زندگی میں اتنی شہرت حاصل کرنے کے بارے میں سوچا تھا؟

عاطف اسلم: میں کسی میوزیشن سے متاثر نہیں ہوں البتہ میرے پسندیدہ موسیقار استاد نصرت فتح علی خاں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ موسیقی میں یہ بہت بڑا نام ہے۔ میں ان کے آس پاس بھی نہیں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے اتنی شہرت ملے گی۔ میں آج جس مقام پر ہوں اپنے والدین اور اپنے پرستاروں کی وجہ سے ہوں۔ جب میرے پرستار مجھ سے پیار کرتے ہیں تو میرے والدین بہت خوش ہوتے ہیں۔

سوال: زندگی کی کوئی ایسی علامت جس کو آپ اپنی خوش بختی سے منسوب کر سکتے ہیں؟

عاطف اسلم: بارش میرے لئے بہت لکی ثابت ہوئی ہے جب میں اپنا ہٹ سانگ لکھ رہا تھا تو بارش ہو رہی تھی۔ جب یہ گانا ممبئی میں ریکارڈ ہو رہا تھا تو بھی بارش ہو رہی تھی اور چند دن پہلے میں نئے البم کا گانا لکھ رہا تھا تب بھی بارش ہو رہی تھی۔ اُمید تو ہے کہ

بارش میں لکھا ہوا نیا گانا پہلے کی طرح ہٹ ہوگا۔

سوال: کیا آپ میوزک میں یکسانیت کا شکار تو نہیں ہو جائیں گے؟

عاطف اسلم: میں میوزک میں اپنے آپ کو کسی ایک سٹائل تک محدود نہیں کروں گا۔ ویسے بھی میوزک کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ میں ہر قسم کے میوزک پر طبع آزمائی کرتا ہوں میں نے پنجابی میں راک سانگ بنایا ہے جو اس سے قبل کسی نے نہیں بنایا تھا۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ میرے گانے بالی وڈ اور ہالی وڈ تک پہنچ جائیں گے۔

سوال: نئے البم پر کام کہاں تک پہنچا ہے؟ اور یہ کب تک ریلیز ہوگا؟

عاطف اسلم: نئے البم کا ابھی نام نہیں سوچا تاہم یہ تقریباً مکمل ہے اور عنقریب اسے دنیا بھر میں ریلیز کیا جائے گا۔

سوال: کیا آپ نے کبھی کسی ساتھی گلوکار یا گلوکارہ کے ساتھ بھی گایا مستقبل میں آپ کے عزائم کیا ہیں؟ فرصت کے لمحات کہاں بسر ہوتے ہیں؟

میں نے حدیقہ کیانی کے ساتھ ایک گانا گایا تھا اور مستقبل میں بالی وڈ کی ایک معروف سنگر کے ساتھ گانا گاؤں گا۔ اب زندگی بہت مصروف ہوگئی ہے فرصت کے لمحات نہیں ملتے۔ جب بھی فراغت ملتی ہے تو والدین کے پاس ہوتا ہوں۔

سوال: مستقبل قریب میں شادی کا پروگرام ہے یا نہیں؟

عاطف اسلم: شادی کا فی الحال ارادہ نہیں تاہم لڑکی تقریباً فائنل ہے اور اس کا نام اے سے شروع ہوتا ہے۔

❁❁❁


## آپریشن بلیو سٹار

نوجوانوں کے پسندیدہ ترین مصنف طارق اسماعیل ساگر کا کتاب گھر پر پیش کیا جانے والا دوسرا ناول **آپریشن بلیو سٹار** کہانی ہے ایسے سر پھرے آزادی کے متوالے لوگوں کی جو اپنی حریت اور آزادی کی سانس کے بدلے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہیں۔ ہندوستان میں سکھوں کے خالصتان کی تحریک کو کچلنے کے لیے کیا گیا بدنام زمانہ فوجی ایکشن جسے آپریشن بلیو سٹار کا نام دیا گیا تھا، اسی آپریشن کے بعد ہندوستان کی سابقہ وزیر اعظم اندرا گاندھی کو اسکے اپنے سکھ باڈی گارڈز نے گولیوں سے اُڑا دیا۔ ہندوں اور سکھوں کی باہمی چپقلش اور کشمکش کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول جلد ہی کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا۔

# معروف کلاسیکی اور پاپ گلوکار

## رفاقت علی خان

کلاسیکی گلوکاری آسان کام نہیں، سُر اور لے کی سمجھ بوجھ صرف انہی لوگوں کو ہوتی ہے جو اس مضمون کا گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ کلاسیکی موسیقی میں استاد نزاکت علی خان کے خاندان کو اہم مقام حاصل ہے۔ اس خاندان نے دنیائے موسیقی کو کئی معتبر نام دیئے۔ ان ہی شخصیات میں ایک نام رفاقت علی خان کا بھی ہے۔ رفاقت علی خان استاد نزاکت علی خان کے صاحبزادے ہیں۔ انہوں نے کلاسیکی موسیقی کی باقاعدہ تربیت اپنے چچا استاد سلامت علی خان سے حاصل کی۔ سید نور کی فلم کے مشہور گانے ''اللہ، تیرا شکریہ'' اور بھارتی فلم ''ڈریسنگ روم'' کا گانا ''رات کٹنے کو ہے'' ان کی وجہ شہرت بنا۔ وہ اب تک متعدد ممالک میں پرفارم کر چکے ہیں۔ ہندوستان کے دورے کے دوران معروف ہدایت کار راکیش روشن نے انہیں اپنی آنے والی فلم میں بہ حیثیت گلوکار سائن کیا۔ رفاقت علی خان کو قطر میں ''میڈیم نور جہاں ایوارڈ''، ''گریجویٹ ایوارڈ'' کے علاوہ متعدد ایوارڈز بھی مل چکے ہیں۔ وہ بھارتی گلوکار دلیر مہدی کے ساتھ مل کر اپنی البم بنا رہے ہیں۔ ان سے کیا جانے والا انٹرویو قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

سوال: اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ بتایئے؟

رفاقت علی خان: میرا تعلق کلاسیکل موسیقی کے گھرانے سے ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں ہمارے خاندان کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ میرے والد استاد نزاکت علی خان، میرے چچا استاد سلامت علی خان، استاد اختر علی خان، استاد ذاکر علی خان کا شمار صف اول کے کلاسیکل گائیکوں میں ہوتا ہے۔ ہماری روایت ہے کہ ہم موسیقی کو نسل در نسل لے کر چلتے ہیں۔ ہماری سوچ یہ نہیں ہے کہ ہم کوئی ہٹ نمبر بنا کر مارکیٹ میں مقبول ہو جائیں۔ ہم موسیقی کو ذمہ داری سمجھتے ہیں۔

سوال: غالباً آپ کا خاندانی سلسلہ دربار اکبر سے ملتا ہے؟

رفاقت علی خان: جی ہاں، آپ نے صحیح کہا۔ ہمارے آباؤ اجداد کا تعلق دربار اکبر سے تھا۔ ہمارا سلسلہ نسب میاں چاند خان اور اور میاں سورج خان سے ملتا ہے۔ ہم نے اور ہماری پشتوں نے جو کام کیا، وہ عبادت سمجھ کر کیا۔ ہمارے بزرگوں نے پاک موسیقی گائی۔ اللہ اور نبی کریم ﷺ کا نام لیا۔

سوال: تعلیمی پس منظر کے بارے میں بتایئے؟

رفاقت علی خان: میں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (سیاسیات) کیا۔

سوال: کلاسیکل گائیکی بنیادی تربیت کس سے حاصل کی؟

رفاقت علی خان: میں نے اپنے چچا استاد سلامت علی خان سے کلاسیکل موسیقی کی تربیت حاصل کی۔ استاد ذاکر علی خان بھی میری راہ نمائی کیا کرتے تھے۔ اس وقت میری عمر آٹھ نو برس تھی۔ میں گزشتہ دس برس سے پروفیشنل گلوکاری کر رہا ہوں۔ کلاسیکل موسیقی کے ساتھ ساتھ مجھے عوامی رجحان پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے کہ موجودہ دور میں عوام کی کیا ڈیمانڈ ہے۔ میں عوام کے لیے بھی موسیقی

ترتیب دے رہا ہوں۔ پاپ گلوکاری بھی کر رہا ہوں۔

سوال: آپ کی باتوں سے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ کے گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے کے ذہن میں فطری طور پر یہ بات نقش ہوتی ہے کہ اسے کلاسیکی موسیقی ہی کی طرف آنا ہے کیا وہ کوئی دوسرا پیشہ اختیار نہیں کر سکتا۔

رفاقت علی خان: دیکھیں، ہمارے گھرانے میں موسیقی کو ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ موسیقی محض تفریح کا ذریعہ نہیں ہے۔ یہ ایک سنجیدہ ذریعہ ابلاغ ہے۔ ہماری طرف سے بچوں پر کوئی پابندی نہیں ہے اگر وہ ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں تو ڈاکٹر بنیں، انجینئر بنا چاہتے ہیں تو انجینئر بنیں۔ ہمارے معاشرے میں صرف موسیقی ہی تو نہیں ہو رہی، دنیا کے اور بھی کام ہیں۔

چھوڑ دے ساری دنیا کسی کے لیے
یہ مناسب نہیں آدمی کے لیے
موسیقی سے بھی ضروری کئی کام ہیں
موسیقی سب کچھ نہیں آدمی کے لیے

میں کلاسیکل گلوکار اس لیے بنا کہ میری پیدائش ایک کلاسیکل گھرانے میں ہوئی اگر میں کسی دوسرے گھرانے میں پیدا ہوتا تو شاید آج کروڑوں میں کھیل رہا ہوتا۔ میں نے یا میرے خاندان کے دیگر افراد نے پیسے کمانے کے متعلق کبھی نہیں سوچا۔ موسیقی کو تعلیم اور مشن سمجھا۔ ہمارے گھرانے نے موسیقی کی جو خدمت کی، وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ آج تو امریکا اور کینیڈا کے سکولوں میں بھی موسیقی سکھائی جا رہی ہے۔ اس کا مقصد شخصیت کی تعمیر ہے۔

سوال: آپ کا موقف ہے کہ آپ کا گھرانا موسیقی کے ذریعے عوام کی خدمت کر رہا ہے۔ آپ اس کی وضاحت کریں گے؟

رفاقت علی خان: دیکھیں، ہمارا معاشرہ کئی ذہنی امراض کا شکار ہے۔ ہر دوسرے شخص کو چڑ چڑے پن اور ڈپریشن کا مرض لاحق ہے۔ کاروباری اور گھریلو مسائل الگ ہیں۔ ان حالات میں جب آپ کوئی فلم دیکھتے ہیں یا کوئی اچھا گانا سکتے ہیں، تو تھوڑی دیر کے لیے آپ ان مصیبتوں سے دور چلے جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ لوگ ہماری موسیقی سے محظوظ ہوتے ہیں، یہی ہماری خدمت ہے لیکن تفریح کا مطلب یہ نہیں کہ آپ موسیقی کی روش کو ہی خراب کر دیں۔ ہر کام کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک اچھا اور ایک برا۔ موسیقی اچھی بھی ہوتی ہے اور بری بھی۔ بری تفریح کے بارے میں لوگ شعور رکھتے ہیں۔ وہ اس کے قریب نہیں آتے، جب کہ اچھی موسیقی کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ موجودہ دور میں تو موسیقی کو ایک صنعت کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ کئی ''میوزک چینل'' کھل گئے ہیں۔ کئی گھرانوں سے اچھے موسیقار اور گلوکار منظر عام پر آ رہے ہیں۔ لوگوں کو خوش کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی کو گانا سنا کر خوش کر دینا سب سے بڑی خدمت ہے۔ یہ انسانیت کی بھی خدمت ہے اور معاشرے کی بھی۔

سوال: یہ بتائیے کہ شخصیت کی تعمیر میں موسیقی کا کیا کردار ادا کر رہا ہے؟

رفاقت علی خان: موسیقی ایک جامع مضمون ہے۔ یہ براہ راست انسانی نفسیات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ سقراط اور افلاطون نے اپنی کتابوں میں موسیقی کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔ موسیقی کے ساز مثلاً بانسری، ڈھولک، طبلے سے لوگ محظوظ ہوئے۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلام کے فروغ میں قوالی کا بہت عمل دخل ہے۔ یہ وہ دور تھا کہ جب ہندومت کی تبلیغ بھی موسیقی کے ذریعے ہوا کرتی تھی۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کے شاگرد امیر خسرو نے موسیقی پر کتابیں لکھیں اور اللہ اور اس کے نبی کریم کا کلام سُر اور لے

میں سنا کر لوگوں کو اپنی طرف راغب کیا۔ ان کا مقصد لوگوں کو تفریح کے ذریعے صحیح بات پہنچانا تھا۔ بعض اوقات تعمیری کام کرنے کے لیے کچھ چیزوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ غریب نوازؒ، داتا گنج بخش، بلھے شاہؒ اور ان جیسی کئی معتبر شخصیات کے کلام کی بنیاد صوفی ازم پر ہے اگر اللہ کا نام سن کر آپ کو سرور آتا ہے تو اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت بڑا کام ہے۔ میں اس بات پر زور دیتا ہوں کہ پاکستان کے ہر سکول اور ہر کالج میں موسیقی کی تعلیم لازمی ہونی چاہیے۔

سوال: برصغیر پاک و ہند میں کلاسیکی موسیقی کا ماضی بہت شاندار رہا۔ کیا آپ کو اس کے حال اور مستقبل سے امیدیں وابستہ ہیں؟

رفاقت علی خان: دیکھیں، ایک عام آدمی تو ایم اے نہیں کرتا۔ اس کو پہلے بنیادی تعلیم حاصل کرنا ہوگی۔ اس کے بعد اپنے کیرئر کا انتخاب کرے گا۔ جس طرح آرٹس اور سائنس کی تعلیم کئی مضامین پر مشتمل ہے، اسی طرح موسیقی کی بھی کئی اصناف ہیں۔ کوئی کلاسیکی موسیقی گا رہا ہے، کسی کا رجحان پاپ کی طرف ہے، کوئی غزل کا ماہر ہے، کوئی گیت گاتا ہے، موسیقی کی ہر صنف اپنی جگہ ایک مقام رکھتی ہے۔ بزنس کے اعتبار سے ہر شخص پیسا کما رہا ہے۔ چینلز ہر فرد کو جگہ دے رہے ہیں۔ یہ ایک صحت مند سرگرمی ہے۔ مجھے بیرون ملک جا کر ملک کی قدر ہوئی۔ میں مانتا ہوں کہ پاکستان میں مصیبتیں ہیں، پریشانیاں ہیں، ٹریفک کا نظام صحیح نہیں ہے، لوگوں میں صبر کا مادہ نہیں ہے، زندگیوں میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ پاکستان سے بہتر کوئی دوسرا ملک نہیں۔

سوال: کلاسیکی گلوکار پاپ گلوکاروں سے خاصے نالاں رہتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ پاپ گلوکاروں کو اچھل کود اور چیخنے چلانے کے سوا آتا ہی کیا ہے جبکہ آپ پاپ موسیقی کے بھی حامی ہیں۔ کیا موجودہ دور میں پاپ موسیقی کے بڑھتے ہوئے رجحان اور کاروباری نقطہ نظر کے باعث کلاسیکی گلوکاروں کے خیالات میں تبدیلی آ رہی ہے؟

رفاقت علی خان: ایک طبقہ کہتا ہے کہ پاپ گلوکاروں سے موسیقی کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔ میں اس بات سے متفق نہیں ہوں۔ پاپ گلوکاروں کے سُر ایمن اور ملہار کے سُر ہو سکتے ہیں۔ ہم میں اور ان میں کوئی فرق نہیں، صرف صنفوں کا فرق ہے اگر پاپ گلوکار بھی تھوڑی محنت کریں، موسیقی کو وقت دیں اور اپنی ثقافتی موسیقی کو اجاگر کریں تو ہماری موسیقی پھلے پھولے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے اکثر پاپ گلوکار مغربی موسیقی سے متاثر ہیں۔ میں مانتا ہو کہ مغربی موسیقی بھی بڑی موسیقی ہے، لیکن ان کے مقابلے میں ہماری ثقافت زیادہ زرخیز ہے۔ ہمارا مستقبل شاندار ہے۔ پاکستانی ثقافت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا۔ میں نے دنیا گھومی ہے۔ جرمن، فرانس، متحدہ عرب امارات، امریکا، کینیڈا، مشرق بعید میں پرفارم کیا۔ جب وہاں مقیم پاکستانی ہمیں سنتے ہیں تو اس ملک کو یاد کرتے ہیں۔ گٹار کلاشنکوف سے بہتر ہے اگر ہمارے پاپ سنگر آج سُر میں نہیں ہیں تو کل یقیناً سُر میں ہو جائیں گے۔

سوال: اپنے بچپن کے بارے میں کچھ بتائیے کہ کیسا گزرا؟

رفاقت علی خان: ہمارے گھرانے میں موسیقی کا ماحول تھا، لیکن میرا رجحان کھیلوں کی طرف زیادہ تھا۔ میں جمناسٹک میں گولڈ میڈلسٹ ہوں۔ میرے پاس جمناسٹک کا "قومی رنگ" تھا۔ میں نیشنل چیمپئن بھی رہ چکا ہوں۔ اس کے علاوہ میں مارشل آرٹ کا کھلاڑی بھی رہ چکا ہوں۔ بروس لی کا مداح ہوں۔ میں نے اس شخص سے بہت کچھ سیکھا۔ حالانکہ کبھی اس سے ملاقات کا موقع نہیں مل سکا۔ میں کیلی فورنیا میں اس کے گھر گیا تھا، جہاں اس نے فلسفے کی تعلیم حاصل کی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری نوجوان نسل

کو کھلاڑیوں کو اپنا آئیڈیل بنانا چاہیے، تا کہ ان کا ذہن تعمیری سوچ کی طرف راغب ہو۔ مجھے ورزش کرنے کا بہت شوق تھا۔ میرا بچپن بہت بھرپور گزرا۔ جب میں شعور کی عمر کو پہنچا تو میں نے اپنے ذمے کئی کام لگا لیے لیکن میرا دل کہیں نہ لگا اور میں نے اپنی توجہ موسیقی پر مبذول کر لی اور اپنے رب سے دعا کی کہ مجھے دنیا دکھائے۔ اللہ نے یہ دعا قبول کر لی۔

سوال: آپ کا حلقہ احباب وسیع ہے یا محدود؟

رفاقت علی خان: زندگی میں مجھے بہت اچھے دوست ملے۔ مجھ پر اللہ کا اتنا کرم ہے کہ میں آپ کو لفظوں میں نہیں بتا سکتا۔ میری کامیابی کے پیچھے ماں کی دعائیں اور میرے دوستوں کا بھی ہاتھ ہے۔ میں اگر ایک ایک دوست کا نام لوں تو صفحات ختم ہو جائیں گے۔ میں اپنے دوستوں کا بہت خیال رکھتا ہوں۔

سوال: ازدواجی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیے؟

رفاقت علی خان: الحمدللہ میری ازدواجی زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔ میری شریک حیات مجھ سے بہت خوش ہے۔ ہم دونوں میں خاصی ذہنی ہم آہنگی ہے۔ میرے دو بیٹے ہیں۔ بخت علی خان اور فراست علی خان۔ میری فیملی مجھ سے بہت خوش ہے۔ میں نے یہ ثابت کیا ہے کہ میں ان کا کیپٹن ہوں۔

سوال: بہن بھائیوں کے بارے میں بتانا پسند کریں گے؟

رفاقت علی خان: ہم چھ بہن بھائی ہیں۔ چار بہنیں، دو بھائی۔ سارے ہی بہن بھائی مجھ سے خوش ہیں۔

سوال: کبھی زندگی میں مشکلات و مصائب کا سامنا کیا؟

رفاقت علی خان: یہاں یہ کہوں گا کہ ؎ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

میں نے تعلیمی دور میں بہت مار کھائی پھر کھیلوں کی دنیا میں کچھ یہی حال رہا پھر ایک دن میری ملاقات میڈم نور جہاں سے ہو گئی۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ ایک دن انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور کہا کہ "بیٹا، دنیا میں سب سے پیار کرو، اللہ کو یاد کرو، آپ کے راستے آسان ہو جائیں گے۔" میں نے میڈم کی نصیحت پر عمل کیا۔ لوگوں کا احترام کیا تو اللہ نے مجھے کامیابی عطا کی۔ مجھے یہ کامیابی محنت کر کے حاصل ہوئی ہے جو شخص بغیر محنت آگے بڑھتا ہے، اسے احساس ہی نہیں ہوتا کہ اس کے پاس کیا ہے؟

سوال: آپ کی نظر میں کیا آج کا نوجوان محنتی ہے؟

رفاقت علی خان: بالکل ہے۔ ہمارے ملک کا نوجوان اپنی صلاحیتوں کو ثابت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسے اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ گانے بجانے والوں کو اگر لوگ جانتے ہیں تو یہ ان کی محنت ہی ہے۔ موسیقی بنانا، گانا گانا آسان کام نہیں ہے۔ اپنے گانے کی مارکیٹنگ کرنا بہت مشکل اور محنت طلب کام ہے۔

سوال: مستقبل کے کیا ارادے ہیں؟

رفاقت علی خان: میرا ہدایت کاری کی طرف آنے کا ارادہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پاکستان سے نیا ٹیلنٹ دریافت کروں۔ انہیں آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کروں۔

سوال: آپ کی زندگی میں رونما ہونے والا کوئی ناقابل فراموش واقعہ؟

رفاقت علی خان: ایک دن میں ایک محفل میں گا رہا تھا۔ میرے چچا استاد سلامت علی خان نے مجھے پچاس روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا کہ تم

اتنا اچھا گا رہے ہو کہ آج تمہارے والد کی روح بھی خوش ہو گئی ہوگی۔ان کے یہ الفاظ میرے لیے اعزاز ہیں لیکن میں خود کو اچھا گلوکار تسلیم نہیں کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت مجھ سے بہتر کئی لوگ موجود ہیں۔ان میں سے بعض مجھ سے کم عمر بھی ہیں۔میری زندگی کا دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ میں جب بھی کسی مصیبت میں پھنستا ہوں، والدہ کی دعائیں مجھے اس مصیبت سے باہر نکال لاتی ہیں۔

سوال: کبھی زندگی میں خوف محسوس ہوا؟

رفاقت علی خان: اللہ کی عظمت وجلالت سے ڈر لگتا ہے۔اس کے علاوہ میں کسی سے نہیں ڈرتا لیکن اگر کبھی گستاخی ہو جائے، یا کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو سامنے والے سے فوراً معافی بھی مانگ لیتا ہوں۔

سوال: آپ کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟

رفاقت علی خان: جتنا ہو سکے لوگوں کے کام آؤں۔ میں غریبوں کی دل کھول کر مدد کرتا ہوں بعض دوست مجھ سے کہتے ہیں کہ یار، پیسہ احتیاط سے خرچ کیا کرو میں کہتا ہوں کہ سامنے والے کی تنگی دیکھ کر مجھے اپنا وقت یاد آ جاتا ہے، جب میں سو روپے کے لیے پریشان رہتا تھا۔

سوال: خریداری کا شوق ہے؟

رفاقت علی خان: جی ہاں، بے حد۔ مجھے سیاہ کپڑے پہننے کا بہت شوق ہے۔ میں "نائٹ مین" ہوں۔ مجھے راتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔دن کی بھی اپنی بات ہے۔

سوال: آپ کی زندگی کے معمولات کیا ہیں؟

رفاقت علی خان: جب میں بیرون ملک سے واپس آتا ہوں تو زیادہ وقت بچوں کے ساتھ گزارتا ہوں۔ مجھے اپنے بچوں سے بہت پیار ہے۔ میں ان کے ہمیشہ دعا گو رہتا ہوں کہ اللہ انہیں نیک بنائے۔فرصت ہو تو سارا دن ریاض کرتا ہوں۔موسیقی سکھاتا بھی ہوں۔

سوال: کبھی جھوٹ بولنے کا اتفاق ہوا؟

رفاقت علی خان: کوئی ایسا جھوٹ جو دوسروں کو پریشان کر دے، نہیں بولنا چاہیے۔ میں مذاق میں جھوٹ بول دیتا ہوں، لیکن عموماً سچ بولتا ہوں۔

سوال: فیصلے جلد کرتے ہیں یا وقت لگاتے ہیں؟

رفاقت علی خان: پہلے خاصا وقت لگاتا تھا، مگر اب میں نے اپنی اس خامی پر قابو پا لیا ہے۔

سوال: کبھی اپنے فیصلے پر پچھتاوا ہوا؟

رفاقت علی خان: زندگی میں ہزاروں واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ جن پر افسوس ہوتا ہے، مگر اب میں نے سمجھوتا کرنا سیکھ لیا ہے۔

سوال: زندگی کے اصول بنائے ہیں؟

رفاقت علی خان: فن کار خاصا بے اصول ہوتا ہے، لیکن اگر وہ دیانت داری سے کام کرے تو بہت آگے نکل سکتا ہے۔بعض فنکار باتیں زیادہ کرتے ہیں، کام کم۔ میں کام زیادہ کرتا ہوں، باتیں کم کرتا ہوں۔

✿✿✿

# نوجوان نسل کے پسندیدہ گلوکار

## وارث بیگ

وارث بیگ کا شمار پاکستانی فلمی صنعت کے نامور پلے بیک سنگرز میں ہوتا ہے۔گوکہ انہوں نے ریڈیو، ٹی وی اور سٹیج کے حوالے سے بھی فن کا مظاہرہ کیا ہے مگر ان کی جو انفرادیت پلے بیک سنگر کی حیثیت سے ہے اور کسی کے پاس نہیں ہے۔وہ احمد رشدی اور اے نیر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس مقام پر پہنچے ہیں یہاں تک پہنچنے میں ان کی ہمت استقامت اور شاندار کارکردگی کا بڑا ہاتھ ہے۔گورنمنٹ کالج کے اس طالب علم نے اپنے سفر کا آغاز گٹار بجانے اور اس کے ساتھ گانے سے کیا اور پھر رفتہ رفتہ قدم بہ قدم آگے بڑھتے ہوئے یہ نوجوان ہر طرف چھا گیا۔

"آپیار دل میں چھپا"

یہ پہلا گیت تھا جس کے ذریعے وارث بیگ کا تعارف پلے بیک سنگر کے طور پر ہوا پہلے ہی گیت نے اسے شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔اسی گیت کے حوالے سے وارث بیگ کو نیشنل ایوارڈ ملا۔اسی گیت کے ذریعے شان کی فلمی صنعت میں کامیاب اداکار کی حیثیت سے واپسی ہوئی۔اسی گیت نے سید نور کی فلم "سنگم" کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔وارث بیگ کی کامیابیوں کا سفر شروع ہوا تو پھر اسے ایوارڈز پر ایوارڈز ملنے لگے۔گریجوایٹ ایوارڈز، نگار ایوارڈ، نیشنل فلم ایوارڈ، پنین ایوارڈ، حتیٰ کہ ریڈیو کا ہٹ ایوارڈ بھی وارث بیگ کے حصے میں آیا۔وارث بیگ پہلا پاکستانی فنکار ہے جس نے ہالی وڈ کی ٹاپ ماڈل جولیا کے ساتھ ماڈلنگ کی۔یاور حیات کی ٹی وی ڈرامہ سیریل "خواب عذاب" میں بطور اداکار کام کیا۔اس سیریل کی عمدہ پرفارمنس کے سبب اسے فلموں میں کام کرنے کی پیشکش بھی ہوتی رہی ہے۔وارث بیگ ہمہ جہت قسم کا فنکار ہے۔ وہ بیک وقت گلوکار ماڈل اور اداکار ہے۔ساتھ ساتھ اچھا بزنس مین بھی ہے۔وارث بیگ کے متعلق عام تاثر یہی ہے کہ اسے راتوں رات شہرت مل گئی۔اس حوالے سے وارث بیگ کا کہنا ہے کہ یہ تاثر درست نہیں ہے۔اس مقام تک پہنچنے کے لیے اس نے بھی جدوجہد کا طویل سفر طے کیا ہے۔اس طویل سفر کے دوران اسے بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔انہیں گانے کا بچپن ہی سے شوق تھا۔پرائمری سکول کے زمانے میں ہی وہ سکول لیول پر گاتا تھا جیسے جیسے تعلیمی میدان میں وہ آگے بڑھتا رہا۔ساتھ ساتھ یہ شوق بھی پروان چڑھتا گیا۔اس حوالے سے وارث بیگ کے دوست چاند ضیاء نے اس کی خاصی مدد کی۔چاند ضیا کا کہنا تھا کہ وارث بیگ کی آواز بہت اچھی ہے۔اس آواز کو اگر ساز مل جائے تو وارث بیگ تہلکہ مچا سکتا ہے چنانچہ چاند ضیاء نے وارث بیگ کو گٹار بجانا سکھایا۔اس طرح ساز اور آواز ہم آہنگ ہو گئے۔گریجوایشن تک ساز اور آواز کا یہ سریونی جاری رہا۔1988ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے وارث بیگ نے گریجوایشن کی اسی دوران ٹی وی پروڈیوسر سلیم طاہر نے ٹی وی پروگرام "نورنگ" کے لیے وارث بیگ سے رابطہ کیا یوں وارث بیگ کے شہرت کے سفر کا آغاز ہو گیا۔ٹی وی کے لیے آٹھ نو پروگرامز کیے پھر والد صاحب نے منع کر دیا کہ کاروبار کی طرف بھی توجہ دو چنانچہ گلوکاری کو پس پشت ڈال کر کاروبار کی طرف متوجہ ہو گیا۔پہلے بوتیک کھولا اس کے ساتھ ساتھ ریسٹورنٹ بھی شروع کیا۔یہ سلسلہ ابھی تک جاری تھا کہ۔1995ء میں یاسین ملک نے اس کا تعارف سید نور سے کرایا کہ یہ لڑکا اچھا گاتا ہے۔انہوں نے سنا اور "سنگم" کا مشہور گانا "آپیار دل میں چھپا"

وارث بیگ سے گوایا......پھر کیا تھا......گانے کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔وارث بیگ کے مطابق 1995ء سے لے کر اب

تک مصروفیت کا اتنا تسلسل ہے کہ کہیں آرام کا موقع ہی نہیں ہے۔ اپنے لیے کوئی وقت ہی نہیں نکال پاتا۔ حسرت ہی رہتی ہے کہ فرصت کا کوئی لمحہ میسر آئے۔ محاورہ سنا ہے کہ "دور کے ڈھول سہانے" اس محاورے کی سچائی کا اندازہ اب ہوا ہے۔ اس شعبے میں آ کر شہرت تو ملی ہے سچ پوچھیں تو یہ شہرت دور سے ہی اچھی لگتی ہے۔ قریب آ کر پتہ چلتا ہے کہ شہرت کتنے دکھ دیتی ہے۔ اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو اس کرب سے گزرا ہو۔ اپنی زندگی اپنی نہیں رہتی۔ اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا ہنسی خوشی سب شہرت کی نذر ہو جاتا ہے اپنے بارے میں، سوچنے کا تو وقت ہی نہیں ملتا۔

وارث بیگ اب تک ایم راشد، امجد بوبی سے لے کر نصرت فتح علی خان تک بھی بڑے موسیقاروں کے ساتھ گا چکے ہیں۔ وارث بیگ کا کہنا ہے کہ یہ تاثر غلط ہے وہ کشور کمار کی کاپی کرتے ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ میری آواز کشور سے ملتی ہے مگر میں اپنے انداز میں گاتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ کشور کمار بڑے فنکار تھے۔ ان کی آواز بڑی رومانٹک تھی۔ رومانٹک آواز نوجوانوں میں بہت مقبول ہوتی ہے۔ دوسرے نوجوانوں کی طرح کشور کمار مجھے بھی بہت پسند تھے۔ ابتداء میں زیادہ تر میں احمد رشدی اور سلیم رضا کے گانے گاتا تھا۔ میں بنیادی طور پر پلے بیک سنگر ہوں۔ میں گانے سے پہلے فلم کے کردار اور فنکار کے حوالے سے معلوم کرتا ہوں پھر اسی انداز میں گاتا ہوں۔ مجھے آپ 80 سال کے بوڑھے پر فلمایا جانے والا گانا بھی دے دیں میں اسی تاثر کے ساتھ گاؤں گا جو اس عمر کے مطابق ہونا چاہیے۔ پلے بیک سنگر کا کام یہی ہے کہ وہ پردہ سکرین پر نظر آنے والے کردار یا منظر میں حقیقت کا رنگ بھرے۔ خاصا مشکل کام اور محنت طلب کام ہے۔ اس کے شوق اور جستجو کی ضرورت ہوتی ہے۔

اداکاری کے حوالے سے وارث بیگ کا کہنا ہے کہ اس حوالے سے مجھے آفرز ہو رہی ہیں مگر اداکاری الگ سے فل ٹائم جاب ہے۔ میرے پاس تو اپنے آپ کے لیے وقت نہیں ہے۔ اداکاری کے لیے کہاں وقت نکال پاؤں گا۔ فی الحال اداکاری کے حوالے سے ملنے والی آفرز کو قبول کرنا ممکن نہیں۔

وارث بیگ کا کہنا ہے کہ میرا قسمت پر پورا یقین ہے گو کہ آج تک کسی کو ہاتھ نہیں دکھایا مگر اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ مجھے میری محنت کا صلہ ضرور ملے گا۔ محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی گو کہ آج شہرت کی بلندیوں پر نہیں ہوں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ جدوجہد کا سفر ختم ہو گیا ہے۔ یہ مقابلے کا زمانہ ہے۔ جس طرح ہم کبھی دوسروں کے مقابلے میں آئے تھے۔ آج نئے لوگ ہمارے مقابلے میں آ رہے ہیں۔ سننے والوں کی پسند ناپسند وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے چنانچہ حالات پر نظر رکھتے ہوئے مزید محنت اور جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ عوام کی پسند اور سوچ کے مطابق اپنے کام میں نئی ورائٹی لانا پڑتی ہے۔ ایک دفعہ شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کے بعد ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔ وارث بیگ کا کہنا ہے کہ میں نے سیاست میں آنے کے متعلق کبھی نہیں سوچا ویسے ملکی حالات اور سیاست کے متعلق سوچ اور رائے بھی رکھتا ہوں مگر سیاست میں حصہ لینے کا خواہاں بھی نہیں ہوں۔ ہر فنکار نرم دل اور صاف گو ہوتا ہے۔ اس کے چاہنے والے اس سے اس کے فن کے حوالے سے محبت کرتے ہیں۔ جب وہ کسی سیاسی گروہ بندی میں شامل ہونے کی کوشش کرے گا تو اس کے چاہنے والوں کو مایوسی ہوگی۔

گانے میں پنجاب کے فوک سٹائل کی مقبولیت کے حوالے سے وارث بیگ کا کہنا ہے کہ ہر شے کی مقبولیت کا ایک دور ہوتا ہے۔ زندگی کے ساتھ ساتھ یہ سرکل بھی چلتا رہتا ہے۔ کبھی غزل کی مقبولیت کا دور آتا ہے تو کبھی فلمی گیت نمایاں ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح آج فوک گائیکی نمایاں ہے تو آنے والے وقت میں موسیقی کو کوئی اور نیا انداز مل جائے گا یا پرانا ہی کوئی انداز واپس آ جائے گا۔ اس تبدیلی کا انسان کی نفسیات اور ارد گرد کے حالات سے تعلق ہے۔ جس قسم کے حالات ہوں گے۔ موسیقی بھی اسی طرح کی ہوگی۔ یہ ملبوسات کے فیشن کی طرح بدلتی رہتی ہے۔

اپنے ٹارگٹ کے حوالے سے وارث بیگ کا کہنا ہے کہ میری سب سے بڑی خواہش ہے کہ لوگ مجھے میری گائیکی کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھیں۔

✿✿✿

# گائیکی سے تائب ہر دلعزیز گلوکار

## جنید جمشید

نوجوانوں میں کریز کی حیثیت اختیار کرنے والے جنید جمشید نے ایسے وقت میں گائیکی کو خیر باد کہا جب وہ اپنے کیریئر کے عروج پر تھے۔ 22 مارچ 2002 کو گائیکی سے سبکدوشی کا اعلان کر دیا۔ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ ''گائیکی کو ترک کر کے باقی زندگی بحیثیت دینی مبلغ گزار دیں گے۔ انہوں نے کہا ''اب وہ یہ فیصلہ کر چکے ہیں اور اس سے پیچھے نہ ہٹیں گے'' انہوں نے کہا عوام اور بالخصوص نوجوان طبقہ جس طرح سٹارز کے لیے دیوانگی کا اظہار کرتا ہے۔ اس نے ہی انہیں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کیا ہے۔ انہوں نے کہا مجھے ایک واقعہ نے ہلا کر رکھ دیا جب کچھ حافظ قرآن لڑکوں نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے متاثر ہو کر میدان گائیکی میں قدم رکھنا چاہتے ہیں اس سے میرے اندر احساس جرم پیدا ہوا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں لوگوں کو بحیثیت گلوکار نہیں بلکہ بحیثیت مبلغ بھی اپنی طرف آنے پر مجبور کروں گا۔ انہوں نے واضح کیا کہ ان کے اس فیصلے کو ان کی فیملی نے سراہا ہے کیونکہ ساری فیملی مذہبی نظریات رکھتی ہے۔ برج سنبلہ سے تعلق رکھنے والے 6 فٹ 1 انچ کا قد رکھنے والے جنید جمشید اپنی پرکشش شخصیت، سبز آنکھوں اور بھورے بالوں کے ساتھ جب پہلی دفعہ سکرین پر آئے تو ہر کسی کو متاثر کر گئے۔ جنید کا تعلق جس گھرانے سے تھا وہاں آنکھ کھولنے والے ہر بچے کو گزرتی عمر کے ہر سال کے ساتھ ڈسپلن کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔ صبح جلدی اٹھنا' گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ سکول جانا، وقت پر کھیلنا، وقت پر پڑھنا اور وقت پر سونا ان تمام اصول وضوابط کی پابندی کرتے کرتے جنید جمشید کے ہاتھ میں گٹار اس وقت آیا جب اس کی عمر صرف 19 سال تھی اور وہ ایف ایس سی کا طالب علم تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اور اس کی والدہ لندن جانے والی تھیں ایسے میں جنید نے ان سے ایک گٹار کی فرمائش کی جو پوری کر دی گئی یوں اس کی انگلیاں گٹار پر چلتیں اور اس کا بھائی گانا گاتا۔ یوں دو افراد پر مشتمل یہ چھوٹا سا میوزک گروپ تشکیل پا گیا۔ جب اس کا بھائی اپنی تعلیم میں مصروف ہو گیا تو جنید نے یہ فیصلہ کیا کہ گٹار بجاتے ہوئے وہ خود گانا بھی گائے گا۔ اس طرح گائیکی کے ساتھ اس کا رشتہ استوار ہوا۔ 1984ء میں جنید نے ایک میوزک گروپ جوائن کیا جس میں تقریباً 5 لوگ تھے جو سب گٹار بجانے کے ماہر تھے۔ ان میں جنید کی شمولیت بحیثیت گلوکار ہوئی۔ لوگ اسے اس کے نام سے نہیں بلکہ ''کیئرلیس وسپر بوائے'' کے طور پر جاننے لگے اس دوران جنید نے لاہور کی یونیورسٹی آف انجینئرنگ سے مکینکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی اور جب میدان موسیقی میں قدم رکھا تو ہر کسی کو متاثر کیا یہ وہ دور تھا جب نازیہ ذوہیب' پاپ میوزک کے افق پر چھائے ہوئے تھے ایسے میں وائٹل سائنز کی آمد اور خود کو منوانا اتنا آسان نہ تھا لیکن ''دل دل پاکستان'' نے اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا اور بچے بچے کی زبان پر یہ ملی نغمہ دوسرے ''قومی ترانے'' کی حیثیت اختیار کر گیا۔ جنید کے دیگر پاپولر ہٹس میں ''گوری''، ''سانولی سلونی''، ''جتیں گے''، ''وہ کون تھی''، تمہارا اور میرا نام''، ''یہی زمین''، ''ہم ہیں پاکستانی''، ''اب جیا نہ جائے'' اور ''مولا'' شامل ہیں۔ آیئے جنید سے ان کی زندگی اور فنی تجربات کے حوالے سے بات کریں۔

سوال: کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟

جنید جمشید: میں 3 ستمبر 1964ء کو پیدا ہوا۔ اس وقت میرے والد ایئرفورس میں ملازم تھے چنانچہ میں نے ایئرفورس کے کئی تعلیمی

اداروں سے تعلیم حاصل کی۔ میں نے نہایت نظم وضبط کے تحت زندگی کا حصہ گزارا۔ 18 سال کی عمر تک میں نے کبھی گھڑی کو رات کا ایک بجاتے نہیں دیکھا۔ اس کا مطلب ہے جلد سونا اور صبح جلدی اٹھنا۔ میں اپنے والد کی طرح ایئرفورس کا پائلٹ بننا چاہتا تھا مگر نظر کی خرابی کی وجہ سے میں پائلٹ نہ بن سکا۔ اس کے بعد میں نے ڈاکٹر بننے کا فیصلہ کیا مگر ڈاکٹر بننا بھی میرے مقدر میں نہیں لکھا تھا۔ جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو روحیل اور شہزاد نے محسوس کیا کہ میری آواز اچھی ہے، میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ مجھے گانا چاہیے میں نے اس بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا کیونکہ اس وقت میں انڈر 19 کرکٹ ٹیم میں کھیلتا تھا اور میں کرکٹ کو ہی بطور پروفیشن اختیار کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر ہوتا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے۔

سوال: آپ کتنے بہن بھائی ہیں؟

جنید جمشید: ہم چار بہن بھائی ہیں میرے علاوہ میرے دو بھائی اور ایک بہن اور ہیں، میں سب سے بڑا ہوں۔

سوال: آپ چھوٹے بہن بھائیوں پر رعب رکھتے تھے یا کہ آپ کا ان سے دوستانہ رویہ تھا؟

جنید جمشید: اصل میں میرے والدین نے شروع سے ہی مجھے یہ احساس دلایا کہ تم سب سے بڑے ہو پھر میرے بہن بھائی بھی مجھے جنید بھائی کہا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ میری عزت بھی کرتے اور زیادہ تر میری بات ہنس کر ٹال دیا کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ میرا ان پر کچھ رعب ہی تھا یہی وجہ ہے کہ میرے اور دوسرے بہن بھائیوں کے درمیان کچھ فاصلہ رہا۔ باقی تینوں آپس میں زیادہ بے تکلف ہیں۔ ان میں زیادہ دوستی ہے۔

سوال: آپ کیسے طالب علم تھے پڑھاکو تھے یا زیادہ توجہ کھیلوں کی طرف ہوتی تھی؟

جنید جمشید: میں بہت پڑھاکو قسم کا طالب علم تھا۔ اصل میں میرے والد چونکہ آرمی آفیسر تھے اس لیے طالب علمی کے زمانے میں ہماری روٹین بہت سخت ہوتی تھی جس کی پابندی ہمارے لیے بہت ضروری تھی اس کے علاوہ میں اپنے سکول اور کالج میں بہترین سپورٹس مین رہا ہوں۔

سوال: پسندیدہ مضامین کونسے تھے؟

جنید جمشید: فزکس، کیمسٹری اور میتھ میرے پسندیدہ مضمون تھے۔ میں نے ان میں کئی مرتبہ 98 فیصد نمبر بھی حاصل کیے۔ اس کے علاوہ مجھے اردو سے بہت لگاؤ تھا۔ قدرتی طور پر بھی میری اردو کافی اچھی تھی ایک دفعہ سکول میں مَیں نے اردو کے پرچے میں سو میں سے 84 نمبر حاصل کیے۔

سوال: بچپن کی کونسی باتیں زیادہ یادگار ہیں؟

جنید جمشید: بچپن کا زمانہ بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں ہم بہن بھائیوں کو 9 بجے کے بعد ٹی وی دیکھنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی شاید یہی وجہ ہے کہ پڑھائی پر بھی پوری توجہ دی۔ میں سکول اور کالج دونوں جگہ ہیڈ بوائے رہا ہوں۔

سوال: بچپن میں شرارتی تھے؟

جنید جمشید: میں خاصا شرارتی تھا۔ ایک دفعہ میرے خالو نئی گاڑی لے کر آئے انہوں نے دوپہر کو گاڑی ہمارے گھر کھڑی کی جب سب گھر والے سو گئے تو مجھے اور میرے بھائی ہمایوں کو شرارت سوجھی ہم نے چھری سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور پھر چھری سے ہی گاڑی کو سٹارٹ کر کے گاڑی باہر سڑک پر لے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی ایک پولیس والے نے ہمیں پکڑ لیا۔ اس شرارت

پر گھر والوں سے خوب مار پڑی۔

سوال: کیا آپ کو بچپن میں کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا؟

جنید جمشید: میں بہت کہانیاں پڑھا کرتا تھا اس زمانے میں مَیں نے عمرو عیار کے تقریباً سارے ناول پڑھ لیے تھے اور مزے کی بات بتاؤں کہ میں کہانیاں پڑھنے کا اتنا شیدائی تھا کہ میں نے امیر حمزہ کی 12 ہزار صفحات پر مشتمل داستان بھی مکمل پڑھی ہے۔

سوال: بچپن میں پڑھی جانے والی کوئی نظم جواب بھی یاد ہو؟

جنید جمشید: علامہ اقبال اب بھی میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ بچپن میں بھی اقبال کی پڑھائی جانے والی نظمیں مجھے پسند اور یاد تھیں۔ ان میں ایک ہے

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

اور دوسری کا ایک شعر ہے

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا
بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا

سوال: جنید آپ بچوں کو کوئی پیغام دیں گے؟

جنید جمشید: بچوں کو تو یہی نصیحت ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنی پڑھائی پر توجہ دیں اس کے بعد کھیل اور ٹی وی کا نمبر آتا ہے لیکن مجھے والدین سے یہ کہنا ہے کہ وہ بچوں کی تربیت پر خاص توجہ دیں۔ انہیں جس چیز کی نصیحت کریں ان کے سامنے پہلے خود کو رول ماڈل بنائیں۔

سوال: گائیکی کا ابتدائی تجربہ کیسا رہا؟

جنید جمشید: میں بڑے شہروں سے مانوس نہیں تھا جیسے کراچی، لاہور یا اسلام آباد کیونکہ اس وقت تک زندگی چھوٹے شہروں میں گزری تھی جیسے سرگودھا، پشاور، کوئٹہ اور دوسرے چھوٹے شہر۔ اس لیے ایک چھوٹے شہر سے آئے نوجوان کے لیے بڑے شہروں میں پرفارم کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ 1987ء میں شعیب منصور نے مجھے دل دل پاکستان گانے کے لیے کہا پھر یہ گانا بہت زیادہ مشہور ہوا۔

سوال: وائٹل سائنز بہت پاپولر اور بڑے پاپ گروپ کے طور پر سامنے آیا پھر اچانک اس میں دراڑیں کیوں پڑ گئیں؟

جنید جمشید: وائٹل سائنز کبھی نہیں ٹوٹا مگر آپ اسے ایک طویل وقفہ کہہ سکتے ہیں۔ گروپ میں انتشار کی خبریں بے بنیاد ہیں۔ میں روحیل اور شہزاد سے 1985ء میں ملا اور اس وقت سے لے کر اب تک ہم دوست ہیں۔ یہ دوستی کسی مادی یا مالی مفاد سے ہٹ کر تھی۔ جب ہم مشہور ہوئے اور پیسے آنے لگے تب ہم سٹارز بن گئے۔ سٹارز کے اپنے مسائل اور انا ہوتی ہے چنانچہ یہ باتیں شروع ہوئیں تو ہم نے فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے کہ ہماری دوستی میں بھی اس کے اثرات داخل ہوں ہمیں کچھ عرصہ کے لیے بطور بینڈ کام بند کر دینا چاہیے۔ اسی عرصہ کے دوران میں نے بطور سولو گلوکار پرفارمنس دکھانی شروع کی مگر شاید اللہ کو یہی منظور تھا کہ ہم دوبارہ ایک بینڈ کے طور پر ہی مل کر کام کریں ہم ابھی بھی دوست ہیں اور کبھی کبھار مل کر موسیقی پر کام کرتے ہیں مگر اس میں کوئی کاروباری نقطہ نظر نہیں رہ گیا وہ موسیقی جو ہم نے اپنے طور پر ترتیب دی ہے اگر اسے عوام میں لایا جائے تو

ہمیں یقین ہے کہ وہ بھی بہت مقبول ہو مگر ہم اب اسے ریلیز کرنا نہیں چاہتے۔ موسیقی ہماری اپنی ذات کے لیے اور اپنے شوق کی تسکین کے لیے تھی۔

سوال: آپ نے بے شمار گانے گائے بہت سے پاپولر ہوئے بحیثیت آرٹسٹ آپ کو خود اپنا کونسا گانا اچھا لگتا ہے؟

جنید جمشید: جو گانے آپ نے خود بنائے ہوں وہ آپ کے اپنے بچوں کی طرح ہوتے ہیں مگر جب لوگ آپ کے کسی بچے سے زیادہ پیار کرنے لگیں تو آپ کو بھی وہ بچہ زیادہ پیارا لگنے لگتا ہے کوئی خاص گیت میرا پسندیدہ نہیں ہے مگر کچھ گیت دلچسپ واقعات کی وجہ سے بھلائے نہیں جاسکتے جب ہم گورے رنگ کا زمانہ کر رہے تھے تو دوستوں نے اسے نہ کرنے کے لیے کہا کیونکہ ان کے خیال میں ہمارا یہ مسئلہ نہیں تھا۔ اس لیے ان کا خیال تھا کہ عوام بھی اسے پسند نہیں کریں گے۔ یہی وجہ تھی کہ اس گانے کو ہم نے اپنی پہلی البم میں اسے سائیڈ پر آخری نمبر پر رکھا۔ شعیب منصور نے یہ گیت لکھا تھا اور انہوں نے ہی ہمیں یہ گانا گانے کا حوصلہ دیا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ گانا بہت مقبول ہوگا مگر ہم نے یہ گانا نا چاہتے ہوئے بے دلی سے گایا۔ میں نے اس گانے کو ریکارڈ کرواتے ہوئے کوئی دلچسپی نہیں لی اور نہ ہی دل ہی سے یہ گیت ریکارڈ کروایا بلکہ حقیقت میں بس سر سے اتارا۔ شعیب منصور نے اپنے طور پر اس کی مکسنگ کی اور پھر جب البم ریلیز ہوئی تو اس گانے کی بہت پذیرائی ہوئی جب کنسرٹ میں لوگ اس گانے کی فرمائش کرتے تو ہم اس سے بچنے کی کوشش کرتے مگر بعد میں ہمیں انداز ہوا کہ یہ ہمارا کلچر ہے اور اس قسم کے گیت ہمارے ملک میں لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔

اسی آئیڈیا کو لے کر ہم نے سانولی سلونی محبوبہ کیا اور اس کے بعد یہ ریت چل نکلی مگر ذاتی طور پر میرا پسندیدہ گانا اگر واقعی کوئی ہے تو وہ ہے "اعتبار"۔

سوال: آپ بہت سمارٹ ہیں بہت پاپولر بھی ہوئے تو کیا فلم والوں نے آپ کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا؟

جنید جمشید: جس دن میں نے کراچی میں قدم رکھا مجھے افرزآنی شروع ہوگئی تھیں۔ حتیش آنند میرے اچھے دوست تھے اور وہ مجھے فلموں میں کام کرنے کے لیے تیار کرتے رہتے تھے۔ سید نور صاحب نے بھی مجھے اپنی فلم میں کام کرنے کی پیش کش کی لیکن ہر آدمی کو اس کی حدود کا پتہ ہوتا ہے مجھے بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ میں کبھی بھی اداکار نہیں بن سکتا۔ اس لیے میں نے ان کو انکار کر دیا مگر میں سب کا شکر گزار ہوں۔

سوال: آپ نے کرکٹ بھی کھیلی ہے کیا آج کل بھی آپ کھیل میں دلچسپی لیتے ہیں؟

جنید جمشید: ہاں میں ایک اچھا کرکٹر تھا۔ وسیم اکرم اور سعید انور اب بھی میرے اچھے دوست ہیں۔ ہم نے کامیابیوں کا آغاز بھی ایک ساتھ کیا۔ میں موسیقی کے میدان میں داخل ہوا تو ان دونوں نے کرکٹ کے میدان میں قدم رکھا۔ وسیم اکرم نے میرے بیوریج کمپنی کے معاہدے کے ٹھیک چھ ماہ بعد اسی کمپنی سے معاہدہ کیا مگر ہم دونوں نے ایک ہی وقت میں اس کمپنی سے معاہدہ ختم کیا میں نے کئی ڈومیسٹک مقابلوں میں ایک ہی کمپنی کے تحت وسیم کے ساتھ مل کر کھیلا۔ اس طرح اپنے کرکٹ کے شوق کی تسکین کی۔

سوال: آپ کی شخصیت میں اچانک تبدیلی آئی اور آپ مذہب کی طرف مائل ہو گئے۔ اس حوالے سے کیا مصروفیات ہیں؟

جنید جمشید: آج کل موسیقی کے حوالے سے کوئی مصروفیات نہیں ہیں بلکہ میری کوشش ہے کہ میں جس قدر زیادہ سے زیادہ وقت تبلیغ اور اللہ کی طرف دعوت دینے کی طرف سے دے سکوں وہ دیتا رہوں۔ صبح سے شام تک میں روزی کمانے پر توجہ دیتا ہوں۔ اس

دوران بھی اگر مجھے کچھ وقت مل جاتا ہے تو وہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے میں صرف کرتا ہوں۔ شام کے بعد کا وقت میں نے مکمل طور پر اللہ کا پیغام پھیلانے کے لیے وقف کیا ہوا ہے۔ اس دوران میں مختلف مذہبی شخصیات سے ملتا ہوں اور دین کو سیکھنے کے لیے ان سے مدد حاصل کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ سال میں چالیس دن اور ایک ماہ میں تین دن خاص طور پر میں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں لگانے کے لیے وقف کر رکھے ہیں۔ جمعرات کی شام میں مدنی مسجد میں گزارتا ہوں۔

سوال: کس طرح سے اور کب یہ تبدیلی آپ کی زندگی میں آئی؟

جنید جمشید: اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو زمین پر بھیجا تو اس نے انسان کے بارے میں فرمایا کہ وہ اس کی سب سے پیاری اور بہترین تخلیق ہے چنانچہ بہترین مخلوق سے بہترین رویہ اپنانے کی ہدایت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے اعمال کو جاری رکھنے کی بھی ہدایت فرمائیں۔ آپ کے اچھے اعمال ضائع ہو سکتے ہیں۔ بُرے کاموں کی ملاوٹ کی وجہ سے چنانچہ اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ اچھے اعمال ضائع نہ ہوں بلکہ قیامت کے دن تک محفوظ رہیں۔ اچھے اعمال خود آپ کی حفاظت بھی کرتے ہیں۔ اچھے اعمال کا مطلب بھی بتانا ضروری ہے جو لوگ انسانیت کو اللہ کے راستے کی طرف بلاتے ہیں۔ وہ سب سے بہتر لوگ ہیں۔

1997ء میں جب میں ایک شوبز سٹار کی زندگی گزار رہا تھا تب کسی نے مجھے یہ باتیں بتائیں مگر تب میں نے ان باتوں کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی کیونکہ میں اس وقت شوبز کی زندگی میں مگن تھا مگر اس کے بعد میرے اندر ان باتوں کے بارے تحقیق کرنے کا جذبہ پیدا ہوا تب میں نے ایسے لوگوں کی مجالس میں شرکت کرنا شروع کر دی جو لوگ کامیابی سے اپنے کام اور اپنے دین میں توازن برقرار رکھے ہوئے تھے۔ میں ان لوگوں کو بغور مشاہدہ کرتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرتا رہا کہ وہ میرے لیے علم و آگہی کے دروازے کھول دے تاکہ میں ان چیزوں کو سمجھ سکوں تب آہستہ آہستہ اسی ماحول کا اثر میرے اندر پروان چڑھتا چلا گیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ جو کوئی اس کے راستے میں نکلے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ خاص عنایت کسی کسی پر ہوتی ہے۔ ہر ایک پر نہیں مثلاً سب کیڈٹ ایک طرح کی ہی تربیت اور تعلیم حاصل کرتے ہیں مگر ان میں سے صرف ایک کیڈٹ ہی چیف بنتا ہے۔ یہ تو دنیاوی معاملہ ہے مگر اللہ تعالیٰ کے دربار میں بالکل مختلف صورتحال ہے جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں سخت محنت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود اس بندے کی مدد فرماتے ہیں۔ الحمد اللہ اس طرح سے یہ میری زندگی میں میرے ساتھ ہوا۔ پھر ایک اور واقعہ میری زندگی میں رونما ہوا کہ حافظ قرآن بچوں نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے متاثر ہو کر گائیکی کے میدان میں آنا چاہتے ہیں۔ اس سے میرے اندر احساس جرم پیدا ہوا یہی میری زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ تھا۔

سوال: اس تبدیلی کے آپ کی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوئے اور آپ کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟

جنید جمشید: اگر آپ نے سنا ہو کہ پہاڑ اپنی جگہ تبدیل کر لیتے ہیں تو شاید یہ ممکن ہو مگر اگر کوئی آپ سے یہ کہے کہ کسی آدمی کی فطرت بدل گئی ہے تو آپ اس بندے کی بات پر یقین نہیں کریں گے۔ ایسا کیوں ہے۔

سوال: کیا آپ نے گانا چھوڑ دیا ہے؟

جنید جمشید: میں اب گانا چھوڑ چکا ہوں لیکن میرے کچھ پرانے مختلف کمپنیوں کے ساتھ معاہدے ہیں وہ پورے کروں گا۔ جب میں تبلیغ کے لیے روزانہ نکلتا ہوں تو میرے دل کو بہت سکون ملتا ہے۔ اس لیے میں اب باقاعدہ گانے کی طرف واپس نہیں آؤں گا۔

سوال: اگر آپ کو کہا جائے کہ ریما اور میرا سے شادی کر لیں ورنہ آپ کا سر قلم کر دیا جائے گا تو آپ کیا کریں گے؟

جنید جمشید: میں یہ کبھی نہیں کروں گا کیونکہ ایک کہاوت ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے اور تباہی کے پیچھے دو عورتوں کا۔ میں اپنا سر قلم کروا لوں گا لیکن دونوں سے شادی نہیں کروں گا۔

سوال: آپ کے خیال میں انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں بہترین تحفہ کیا ہے؟

جنید جمشید: دنیا میں اچھی صحت سب سے بڑا تحفہ ہے کیونکہ صحت ہے تو سب کچھ ہے اور آخرت میں ایمان کی دولت یہی ہماری نجات کا ذریعہ بنے گی۔

سوال: آپ نے پاپ سنگر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی اور اب تبلیغ کی طرف آئے ہیں۔ دونوں میں کیا فرق ہے؟

جنید جمشید: دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک آدمی صرف اپنی غرض کے لیے بھاگتا ہے، اپنی غرض کے لیے رات دن محنت کرتا ہے اور دوسرا کام یہ ہے کہ آدمی اپنی غرض چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کام کرتا ہے جو اللہ کے دوست ہوتے ہیں۔ ان کا طریقہ کار بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی رضا کے لیے ہمیشہ کام کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے ہر کام کو آسان کر دیتا ہے۔ دونوں میں بس یہی فرق ہے۔

سوال: میوزک کے بارے میں آپ کے فیوچر پلان کیا ہیں؟

جنید جمشید: فی الحال اپنے فیوچر پلان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ابھی میں اپنے کاروبار کے لیے محنت کر رہا ہوں اور کاروبار کے ساتھ ساتھ تبلیغ میں زیادہ سے زیادہ وقت گزار رہا ہوں۔ میوزک کے حوالہ سے ابھی کوئی پلاننگ نہیں ہیں۔

سوال: آپ کو شوبز میں زیادہ سکون ملا یا اللہ تعالیٰ کے ذکر میں؟

جنید جمشید: اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں کہ دلوں کا اطمینان ہم نے اپنے ذکر میں رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کی باتیں کبھی غلط نہیں ہو سکتیں۔ ساری دنیا ہمارے پیچھے بھاگتی ہے مگر میں نے اللہ کا راستہ اختیار کیا ہے۔ بے شک سکون اللہ تعالیٰ کے ذکر میں ہی ہے۔

سوال: آپ کی پسندیدہ شخصیت کون ہیں؟

جنید جمشید: میری پسندیدہ شخصیت عمران خان ہیں۔

سوال: مستقبل میں آپ کے پروگرام کیا ہیں؟

جنید جمشید: شیطان ہمارا ازلی دشمن ہے یہ تو مرتے دم تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا اور اس سے بچنے کے لیے ہمیں اللہ تعالیٰ نے دین اسلام دیا اور ہمیں چاہیے کہ ہم نماز پڑھیں اچھے کام کریں کیونکہ ابھی ہمیں بہت آگے جانا ہے۔

سوال: کوئی تین شخصیات جو گزر چکی ہیں آپ ان سے ملنا چاہئیں تو ان سے کیا سوال کریں گے؟

جنید جمشید: مجھے اگر موقع ملا تو میں خالد بن ولیدؓ، قائداعظم محمد علی جناحؒ اور مارلن منرو سے ملنا چاہوں گا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ سے پوچھوں گا کہ آپ کو رسول اکرمؐ نے سیف اللہ کا خطاب دیا۔ اس کے پیچھے آپ کو کونسی صلاحیت چھپی ہوئی تھی۔ حضرت قائداعظمؒ سے پوچھنا چاہوں گا کہ پاکستان کے حصول کے لیے میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں، مارلن منرو سے سوال کروں گا کہ آپ جیسی خوبصورت عورت نے اپنے عروج پر پہنچ کر خودکشی کیوں کی۔

# معروف پاپ سنگر
# سلیم جاوید

پاکستان پاپ انڈسٹری میں چند گلوکار برسوں سے عوام کے دلوں پر راج کر رہے ہیں۔ان میں ایک نام سلیم جاوید کا بھی ہے۔سلیم جاوید گزشتہ بیس برس سے گلوکاری سے وابستہ ہیں۔ان کا تعلق حیدرآباد سے ہے۔ان کے چار بھائی، دو بہنیں ہیں۔بہن بھائیوں میں ان کا نمبر دوسرا ہے۔سلیم جاوید نے کم عمر میں ہی گلوکاری میں قدم رکھا۔موسیقی کی دنیا میں تجربات کرنا ان کا مشغلہ رہا ہے۔ ان سے کیا جانے والا انٹرویو پیش خدمت ہے۔

سوال: گلوکاری کے شعبے میں قدم رکھنے کا خیال کیسے آیا؟

سلیم جاوید: ہر فن کار میں آرٹ کی خداداد صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ مجھے موسیقی سے بے حد لگاؤ تھا مگر میرے خاندان والے گانے کے سخت مخالف تھے جس زمانے میں، میں نے گلوکاری کا آغاز کیا اس وقت یہ شعبہ بہت برا سمجھا جاتا تھا اب تو اس شعبے میں سنجیدہ اور پیشہ وار بھی لوگ آ گئے ہیں۔میڈیا نے ہماری موسیقی کو بہت آگے پہنچا دیا ہے۔

سوال: والدین کا رویہ کیسا رہا ہے؟

سلیم جاوید: پندرہ برس پہلے میرے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔اپنی زندگی میں وہ اس بات کی تلقین کرتے رہے کہ گلوکاری چھوڑ دو، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس کا کوئی مستقبل نہیں ہے اگر آج والد صاحب حیات ہوتے تو یقیناً بہت خوش ہوتے۔ والدہ بھی اکثر کہتی ہیں کہ اسے چھوڑ کر کچھ اور کام کرو۔

سوال: کوئی کاروبار کرنے کا ارادہ ہے؟

سلیم جاوید: اب دیکھیے، کیا ہوتا ہے۔یہ تو اللہ کو علم ہے کہ کیا کروں گا جب کوئی نیت سے کوئی کام چھوڑنا چاہتا ہے یا نیا کاروبار شروع کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کے خود بخود اسباب پیدا کر دیتا ہے۔آج کل میں بہت زیادہ مصروف ہوں، آج بھی میرے چاہنے والے بہت ہیں۔اس کے باوجود میں اور بھی کچھ کرنا چاہتا ہوں۔میں ناشکری نہیں کر رہا، بلکہ میری کچھ مجبوریاں ہیں۔

سوال: کیا مجبوریاں ہیں؟

سلیم جاوید: میں ایک مسلمان ہوں اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرا فرض ہے کچھ اور بھی کروں۔مذہب کی جانب میرا جھکاؤ بڑھ رہا ہے۔پہلے بھی یہ تھا اب میں باقاعدگی سے نماز پڑھتا ہوں۔

سوال: ازدواجی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیے؟

سلیم جاوید: میری شادی کم عمری میں ہو گئی تھی دراصل میری والدہ کو میری فکر رہتی تھی۔ان کا خیال تھا کہ یہ لڑکا شو بزنس میں چلا گیا ہے، نہ جانے یہ مانتا ہے یا نہیں۔میرا خیال ہے کہ والدہ کا فیصلہ درست تھا۔شادی کے بعد ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔میں یہ

سوچنے لگا کہ گھر پر میرا کوئی ہے، مجھے کام جلد ختم کرنا ہے۔ شادی کے بعد زندگی میں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ کہیں اس میں مجھے نقصان نہ ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ نکاح کے بعد گھر میں اللہ کی رحمتیں بڑھ جاتی ہیں۔

سوال: بچے کتنے ہیں؟

سلیم جاوید: ماشاءاللہ تین بچے ہیں۔ دو لڑکے فرحان اور شیزان اور ایک لڑکی جویریہ ہے۔ بچے پڑھ رہے ہیں۔

سوال: شوبزنس کے حوالے سے آپ کی مصروفیات کیا ہیں؟

سلیم جاوید: میں بہت مصروف رہتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اپنا ہر کام خود کرتا ہوں۔ میں ویڈیو ڈائریکٹ کرتا ہوں۔ ویڈیو کمپوز کرتا ہوں۔ میں نے اپنا اسٹوڈیو بنا لیا ہے۔ اس لیے ادھر ادھر جانا نہیں پڑتا۔ صبح سے شام تک سوچتا رہتا ہوں۔ دراصل میں نے اس شعبے میں اپنا مقام بنانے کے لیے بہت محنت کی۔ میں پاکستان کا پہلا پاپ سنگر ہوں جس نے آڈیو کیسٹ میں اپنی جگہ بنائی۔ اس زمانے میں جدید ٹیکنالوجی نہیں تھی۔ فلیٹ مائیک ہوا کرتے تھے۔ ریکارڈنگ میں اتنی سہولت نہیں تھی کہ وہ آواز کی خامیوں کو دور کیا جا سکے۔ آج کل تو کمپیوٹر کے ذریعے بے سُرے گلوکار بھی سُر میں گا رہے ہیں۔ یہ آرٹسٹ اسٹیج پر Lip sing کرتے ہیں۔ کہیں کہیں ٹیپ بند بھی ہو جاتا ہے تو انہیں رسوائی ہوتی ہے۔ پچھلے ایک دو برس سے میں یہ بات محسوس کر رہا ہوں کہ جن آرٹسٹوں نے شوقیہ اس میدان میں قدم رکھا تھا اب وہ لوگوں کے دلوں سے اترتے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ پیشہ ور گلوکار نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی۔

سوال: آپ نے موسیقی کی باقاعدہ تربیت حاصل کی ہے؟

سلیم جاوید: میں نے بہت زیادہ تو نہیں لیکن بہرحال موسیقی سیکھی ہے۔ اس کے رموز و قواعد سے واقف ہوں۔ میں نے ابتدا میں تربیت حاصل کی تھی پھر جلد ہی کمرشل میدان میں آ گیا۔

سوال: ظاہری شخصیت میں تبدیلیاں آپ کے مزاج کا حصہ ہیں یا اس شعبے نے بار بار گیٹ اپ بدلنے پر مجبور کیا؟

سلیم جاوید: میرا اسٹار جدی ہے۔ اس برج کے زیر سایہ پیدا ہونے والے افراد تبدیلی چاہتے ہیں۔ یہ افراد کچھ نیا کرنے کی دھن میں لگے رہتے ہیں کہ جس سے لوگ چونک جائیں کہ ارے، یہ اس نے کیا کر دیا۔ میں آپ کو ایک بات بتاؤں کہ چند برس قبل میرا وزن بے حد بڑھ گیا تھا اور ایک وقت ایسا آیا کہ میں نے ذہنی طور پر یہ قبول کر لیا تھا کہ اب میرا دور ختم ہو گیا ہے۔ میں ناامید ہو چکا تھا پھر ایک دن میں نے سوچا کہ بس اب بہت ہو گیا۔ مجھے اپنا وزن کم کرنا ہے۔ اپنے فیصلے پر قائم رہنے کے لیے میں نے بہت دعائیں مانگیں۔ ان دعاؤں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ نے میری قوت ارادی میں اضافہ کر دیا اور میں نے چھ ماہ کے عرصے میں 50 پونڈ وزن گھٹایا۔ میں نے کئی گھنٹے چہل قدمی کی، کم حراروں والی غذائیں استعمال کیں، چھ ماہ تک روٹی اور چینی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ غیبی طاقت نے میری ہمت بڑھائی۔

سوال: کبھی زندگی میں ندامت یا شرمندگی کا احساس ہوا؟

سلیم جاوید: جی نہیں۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ بس کبھی کبھار یہ خیال آتا ہے کہ میرے والد کی خواہش تھی کہ میں شوبزنس میں نہ آؤں لیکن میں آ گیا۔ میں ہر نماز کے بعد ان کے لیے خیر کی دعا کرتا ہوں۔

سوال: غصہ آتا ہے؟

سلیم جاوید: جی ہاں۔ آتا ہے۔

سوال: اظہار کس طرح کرتے ہیں؟

سلیم جاوید: کبھی کبھار تو خاموش ہو جاتا ہوں لیکن بعض اوقات مسلسل بولتا رہتا ہوں، مگر ایسا نہیں ہوتا کہ میرے غصے سے کسی کو تکلیف پہنچے۔ دل کا غبار نکال کر خاموش ہو جاتا ہوں، دراصل شو بزنس میں انواع واقسام کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ان سب کے رویوں کو برداشت کرنا ہمت کا کام ہے۔ یہ شعبہ ایسا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں نے ایک مہینے کے لیے بھی کام ترک کر دیا تو میں ایک سال پیچھے چلا جاؤں گا۔ اس لیے میں محنت پر بے حد یقین رکھتا ہوں۔

سوال: موسیقی کی دنیا میں کن شخصیات نے متاثر کیا؟

سلیم جاوید: میں ہر گلوکار کو سنتا ہوں۔ نئی موسیقی سننا اچھا لگتا ہے۔ مجھے کشور کمار، آشا بھوسلے، سجاد علی، عدنان سمیع، مہدی حسن بہت پسند ہیں۔ آج کل تو میڈیا اتنا تیز ہو گیا ہے کہ ٹی وی ہی پر نت نئی موسیقی سننے کو مل جاتی ہے۔

سوال: کیا آپ نئے چہروں کی تلاش میں رہتے ہیں؟

سلیم جاوید: میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ نئے چہروں کو اپنی ویڈیوز میں متعارف کراؤں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ہاں کوئی ایسا پلیٹ فارم نہیں ہے جہاں نئے چہرے قسمت آزمائی کر سکیں۔ میری خواہش ہے کہ اس میدان میں جدوجہد کرنے والوں کے لیے ایسے مواقع پیدا کروں، جنہیں استعمال کر کے وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں۔

سوال: آپ کی نظر میں زندگی کی حقیقت کیا ہے؟

سلیم جاوید: ایک دن جنید جمشید مجھے مسجد لے گیا وہاں اس نے کچھ بزرگوں سے میرا تعارف کرایا۔ ملاقات کے دوران ایک بزرگ نے مجھ سے کہا کہ آپ کو اللہ نے ایسی نعمت عطا کی ہے جو وہ ہزاروں، لاکھوں میں کسی ایک فرد کو نصیب کرتا ہے۔ اس نے آپ کی باتوں میں اثر رکھا ہے۔ لوگ آپ کو دیکھنا اور سننا چاہتے ہیں اگر آپ اپنے چاہنے والوں سے دین کی دو باتیں کر دیں تو اس سے ان پر بہت اچھا اثر ہوگا۔ اس بزرگ کی باتوں کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ انسان کی زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ اس زندگی کا دورانیہ صرف اتنا ہے جتنا اذان اور نماز کے درمیان وقفہ۔ اس عرصے میں ہم قتل بھی کر دیتے ہیں، لوگوں کے حق بھی کھا جاتے ہیں، والدین کی نافرمانی بھی کرتے ہیں، لوگوں کی خوشیاں بھی برباد کر دیتے ہیں، ابھی تک مسلمانوں نے زندگی کے فلسفے کو نہیں سمجھا۔ اللہ ہم سب کو صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔

❁❁❁

# منفرد خوبیوں کا حامل نعت گو پاپ گلوکار

## نجم شیراز

معروف پاپ گلوکار نجم شیراز کا نام موسیقی کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ ملتان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ملتان سے حاصل کرنے کے بعد انہوں نے لاہور سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ بعدازاں وہ کراچی منتقل ہو گئے اور اپنی تمام تر توجہ موسیقی پر مرکوز کر دی۔ ان کی شریک حیات عائشہ نجم کا تعلق بھی کراچی سے ہے۔ ان سے کیا جانے والا فیملی انٹرویو حاضر خدمت ہے۔

سوال: شادی کس سن اور مہینے میں ہوئی؟

نجم شیراز: ہماری شادی 17 اپریل 2000ء میں ہوئی۔ یہ تاریخ میں اکثر بھول جاتا ہوں۔

عائشہ نجم: 17 اپریل 2000ء۔

سوال: لو میرج تھی یا والدین کی مرضی سے ہوئی؟

نجم شیراز: یہ فیصلہ ہمارا تھا۔ دونوں کے والدین کی رضامندی سے اسے طے کیا گیا۔

عائشہ نجم: لو میرج تھی۔ اس میں دونوں کے والدین کی رضامندی شامل تھی۔

سوال: یہ بتایئے کہ پہلی ملاقات کیسے ہوئی؟

نجم شیراز: یہ 1996ء کا سال تھا، میں ایک کنسرٹ کے سلسلے میں حیدر آباد گیا تھا۔ کنسرٹ کے دران ایک فیشن شو بھی منعقد کیا جا رہا تھا۔ عائشہ بھی وہاں مددگار کی حیثیت سے موجود تھیں۔ اس شو میں میرے کئی دوست احباب بھی شریک تھے۔ سب سے اچھی بات چیت چل رہی تھی۔ اس دوران میں نے محسوس کیا کہ عائشہ دوسری لڑکیوں سے مختلف ہیں۔ ان میں بناوٹ نہیں ہے یہ مجھے نرم مزاج، کھری اور سچی لڑکی لگیں۔ میں کسی اجنبی سے پہلی ملاقات کے دوران اس کی سادگی، خلوص اور سچائی کو پرکھتا ہوں، چاہے اس سے دوبارہ ملاقات ہو یا نہ ہو۔ عائشہ سے مل کر مجھے ان سے بات کرنا اچھا لگا۔ یوں بات آگے بڑھی۔

عائشہ نجم: ہماری پہلی ملاقات حیدر آباد میں ایک فیشن شو کے دوران ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ نجم ایک سچے اور صاف گو انسان ہیں۔ مجھے والدین کی طرف سے اپنا شریک حیات منتخب کرنے کی اجازت تھی لہٰذا میں نے انہیں نجم کے بارے میں بتایا۔ ہر ماں باپ کی طرح میرے والدین بھی اپنی بیٹی کے مستقبل کے بارے میں فکر مند تھے کہ آیا ایک گلوکار اپنی ذمہ داریوں کو نبھا بھی پائے گا یا نہیں، لیکن الحمدللہ نجم نے ہر موقع پر خود کو منوایا کہ ان میں ایک خاندان کو سنبھالنے کی صلاحیت موجود ہے۔ جب والدین مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اس رشتے پر ہاں کر دی۔

سوال: آپ دونوں کی پرورش مختلف ماحول میں ہوئی۔ ملتان اور کراچی کی ثقافت میں فرق ہے۔ آپ نے شادی کے بعد پیش آنے والے مسائل کا سامنا کیسے کیا؟

نجم شیراز: میں نے ملتان، لاہور اور کراچی کی ثقافتوں سے سیکھا ضرور ہے لیکن میں ان کے زیر اثر کبھی نہیں آیا۔ میری زندگی میں ایک عمل ہمیشہ جاری رہا اور وہ ہے سیکھنے کا عمل۔ میں ہر اچھی عادت، اچھی بات کو سیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ عائشہ سے ملنے کے بعد یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ میں ملتان میں پیدا ہوا تھا یا عائشہ کا تعلق کراچی سے ہے۔ دس پندرہ سال قبل ہی میں نے ان باتوں کو سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ میرے نزدیک انسان کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس کے پس منظر کی نہیں جیسے عائشہ کا تعلق ایک عیسائی گھرانے سے ہے۔ انہوں نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا۔ یہ شادی سے کافی عرصہ قبل کی بات ہے۔ میں چاہتا تو عائشہ کا پس منظر جان کر رشتے کی بات نہ کرتا، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔

عائشہ نجم: دراصل، ہماری شادی کی بنیاد خاندانی پس منظر پر نہیں بلکہ انسانیت پر تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بہ حیثیت انسان قبول کیا تھا۔ بلاشبہ شادی کے بعد جوڑے کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں بھی اس راستے سے گزرنا پڑا۔ جب آپ کسی کے ساتھ رہتے ہیں تو اس کے رہن سہن کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں۔ لڑکا اور لڑکی کے لیے ان باتوں کا جاننا بہت ضروری ہے۔ ہم نے شادی کے دو تین مہینے تک رشتے میں توازن قائم کرنے کی کوشش کی لیکن پھر اللہ کا شکر ہے کہ ہم نے جلد ہی قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ جب ہم نے قرآن کے احکامات کو زندگی میں شامل کیا، تو دونوں کا پس منظر ایک ہو گیا۔ قرآن نے ہمیں مشترکہ مقام پر لا کھڑا کیا جو رشتہ اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔ اس کو قائم رکھنے کے احکامات بھی اس نے ہمیں بتا دیے۔ جب ہم نے بہ حیثیت شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کو سمجھا اور اس پر عمل کیا تو زندگی ہموار ہو گئی۔

سوال: یہ بتایئے کہ آپ کی شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی یا سادگی سے؟

نجم شیراز: سادگی سے ہوئی تھی۔ مایوں، مہندی وغیرہ کی رسموں کے بجائے صرف ایک تقریب کا اہتمام کیا تھا، جس میں دونوں کے والدین اور رشتے داروں نے شرکت کی تھی۔ میں نے تو صرف سو لوگوں کو مدعو کیا تھا، مگر مہمانوں کی تعداد ڈھائی سو کے قریب ہو گئی تھی (ہنستے ہوئے) حالانکہ میں نے کسی اخبار کو اپنی شادی کی اطلاع نہیں دی تھی نہ ہی کوئی تصویر شائع کرائی۔ اس زمانے میں پی ٹی وی پر ایک پروگرام چل رہا تھا ''یوم باشک'' کے نام سے۔ اس کے میزبان علی سلمان تھے، وہ شادی کے موقع پر مائیک اور کیمرا لے کر آ گئے تھے، انہوں نے ایک گھنٹے تک شادی کی کوریج کی اور پروگرام کے دوران یہ سیشن چلا دیا۔ وہ خبر جو میں میڈیا سے چھپا رہا تھا، عام ہو گئی۔ (ہنستے ہوئے)

عائشہ نجم: شادی سادگی سے ہوئی کیونکہ ہم نے شادی کی صرف ایک تقریب رکھی تھی، اسی میں نکاح ہوا اور ہم نے مہمانوں کو کھانا کھلایا۔

سوال: اس دن کون سا لباس زیب تن کیا تھا؟

نجم شیراز: عائشہ نے سرخ شرارہ پہنا تھا اور میرے لیے ڈیزائنر نے بلو شیروانی تیار کی تھی لیکن میں نے آف وائٹ شلوار قمیض پہنی تھی، جو میرے سسرال والوں کی طرف سے آئی تھی۔

عائشہ نجم: انہوں نے سفید شلوار قمیض اور میں مسٹرڈ اور گرین شرارہ پہنا تھا، جو میرے ساس سسر نے بھجوایا تھا۔

سوال: ہنی مون کے لیے کہاں گئے تھے؟

نجم شیراز: یہ تو عائشہ سے پوچھ کر بتانا پڑے گا کہ ہنی مون پر کب جا رہے ہیں (خوب ہنستے ہوئے)

عائشہ نجم: شادی کے بعد تو اب زندگی ہنی مون بن گئی ہے، دراصل ہنی مون کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو جان لیں، سمجھ لیں۔ جب سے قرآن پڑھنا شروع کیا ہے، ایک دوسرے کو جاننے کا عمل جاری ہے۔

سوال: سیر و تفریح کے لیے ملک میں یا ملک سے باہر گئے ہیں؟

نجم شیراز: جی ہاں۔ جاتے ہیں، کیونکہ میرا پیشہ ہی ایسا ہے، لیکن شادی کے بعد میری کوشش ہوتی ہے کہ میں جہاں بھی جاؤں، اپنی فیملی کو لے کر جاؤں۔

عائشہ نجم: جی ہاں۔

سوال: بیرون ملک جاتے ہیں تو اہلیہ سے رابطہ رکھتے ہیں؟

نجم شیراز: اگر میں کراچی میں ہوں، تو دن میں کئی مرتبہ رابطہ ہوتا ہے۔ فرض کرلیں کہ حیا (بیٹی) کے لیے ڈاکٹر سے وقت مقرر ہے، تو عائشہ رابطہ کر لیتی ہیں، اگر میں کراچی سے باہر ہوں، تو رابطہ مشکل ہوتا ہے، کیونکہ وہاں کنسرٹ یا دوسری مصروفیات ہوتی ہیں۔ کنسرٹ یا مصروفیت کے بعد بات ہو جاتی ہے۔

عائشہ نجم: جب آپس میں ابلاغ نہ ہوں، تو زندگی خالی ڈبے کی مانند لگتی ہے جب نجم بیرون ملک یا شہر سے باہر جاتے ہیں، تو عموماً میں ہی ان سے رابطہ کرتی ہوں، کیونکہ وہ کام میں مصروف رہتے ہیں۔

سوال: بیگم نے شادی کے بعد پہلی ڈش کون سی بنائی تھی؟

نجم شیراز: یہ تو یاد نہیں، لیکن عائشہ نے پہلی مرتبہ پراٹھے بنائے تھے۔ اس کی تفصیل آپ ان سے سنیے گا۔

عائشہ نجم: تین برس قبل میں نے پہلی ڈش کیا بنائی تھی، یہ تو یاد نہیں لیکن نجم کو پراٹھے بہت پسند ہیں۔ شادی سے قبل میں نے کبھی پراٹھے نہیں بنائے تھے، کیونکہ میرے میکے میں چاول شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ روٹی بازار سے آتی تھی، لہٰذا شادی کے بعد میں نے اپنی ساس سے پراٹھے بنانا سیکھے۔

سوال: آپ کی پسندیدہ ڈش کون سی ہے؟

نجم شیراز: مجھے مرغی کے گوشت کے کھانے پسند ہیں۔ عائشہ اچھا کھانا بناتی ہیں، لیکن ہمارے گھر زیادہ کوکنگ میری والدہ کرتی ہیں، اس لیے مجھے انواع و اقسام کے کھانے مل جاتے ہیں۔

عائشہ نجم: میں خاص طریقے سے قیمہ بناتی ہوں، جو انہیں اچھا لگتا ہے۔ مٹن کڑاہی بھی انہیں اچھی لگتی ہے۔

سوال: آپ کے روزمرہ کے معمولات کیا ہیں؟

نجم شیراز: میں فجر کی نماز پڑھ کر سوتا ہوں، تقریباً ایک بجے اٹھتا ہوں۔ دوپہر تک دفتر چلا جاتا ہوں، پھر وہاں میٹنگ یا ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ آج کل تو روٹین تبدیل ہوگئی ہے۔ کنسرٹز بہت ہو رہے ہیں، مجھے ہر دو دن بعد کبھی اسلام آباد، کبھی لاہور وغیرہ جانا پڑتا ہے، جب گھر پر رہوں تو کوشش کرتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ آرام کروں۔

عائشہ نجم: میں صبح سویرے اٹھ کر حیا کے کاموں میں لگ جاتی ہوں۔ اس کو نہلا دھلا کر ناشتہ تیار کرتی ہوں، پھر گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی ہوں، صفائی کرتی ہوں، کپڑے دھوتی ہوں، کھانا بناتی ہوں، اس کے بعد شام میں ہم دونوں قرآن کی کلاسیں لیتے ہیں۔

سوال: آپس میں تحفے تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے؟

نجم شیراز: جی ہاں، ہوتا ہے۔

عائشہ نجم: جی ہاں بالکل اگر مجھے نجم کے لیے کوئی چیز پسند آجاتی ہے تو ضرور خریدتی ہوں، اسی طرح نجم بھی میرے لیے کچھ نہ کچھ لے آتے ہیں۔

سوال: اہلیہ کو آخری تحفہ کیا دیا تھا؟

نجم شیراز: میں نے پچھلے ہفتے پرفیوم دیا تھا ویسے مجھے کسی کی بھی سالگرہ کا دن یاد نہیں رہتا، عموماً شام کو یاد آتا ہے کہ آج عائشہ کی سالگرہ ہے یا بیٹی کی سالگرہ ہے۔

عائشہ نجم: انہوں نے مجھے پرفیوم دیا تھا۔

سوال: اہلیہ کبھی کسی شے کی فرمائش کرتی ہیں؟

نجم شیراز: یہ حیرت انگیز بات ہے کہ عائشہ کبھی فرمائش نہیں کرتیں۔ ان کی اس عادت سے کبھی کبھار مجھے الجھن ہونے لگتی ہے۔ میرے کہنے پر ہی یہ باہر کھانا کھانے کا موڈ بناتی ہیں اور کبھی ان سے یہ پوچھ لوں کہ کیا کھانا ہے، تو بہت مشکل سے بتاتی ہیں کہ فلاں ڈش منگوالیں (ہنستے ہوئے) ہم دونوں تھوڑے عجیب لوگ ہیں۔

عائشہ نجم: اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت ہو تو ان سے کہہ دیتی ہوں، یہ لا دیتے ہیں۔

سوال: گلوکاری کے حوالے سے آپ کی والدہ کا تاثر کیا تھا؟

نجم شیراز: گھر کی اسٹار میری والدہ ہیں۔ ان کے بغیر گھر چل نہیں سکتا۔ مجھے یاد ہے کہ ریڈیو پر جب کوئی میری ماں کا پسندیدہ گانا آتا تو گنگناتی تھیں اور میں طبل بجایا کرتا تھا۔

سوال والدہ: آپ کا تاثر کیا تھا؟

والدہ نجم شیراز: جب نجم نے گانا شروع کیا تو میں نے اس کو منع نہیں کیا تھا بس یہ کہا تھا کہ پہلے پڑھائی مکمل کر لو۔ انہوں نے بتایا کہ مجھے نجم کا گایا ہوا ملی نغمہ "اے وطن پیارے وطن" بہت اچھا لگتا ہے اور بھی گانے پسند ہیں۔ نجم کی طبیعت میں اللہ کی مہربانی سے اب ٹھہراؤ آ گیا ہے پہلے ایسے نہیں تھا۔ جب نجم نے "حمد" پڑھی تو مجھے فخر محسوس ہوا کہ میں اس کی ماں ہوں۔ میں بگاڑنے والی ماں نہیں ہوں۔ میں نے نجم کو غلط بچوں سے ہمیشہ دور رکھا۔ رات کو باہر نہیں جانے دیا۔

سوال: کیا شادی ایک سمجھوتہ ہے؟

نجم شیراز: جوڑے میں رہنا قدرتی عمل ہے۔ یہ ہمارا یا آپ کا بنایا ہوا طریقہ نہیں ہے۔ شادی سے قبل میں یہ سمجھتا تھا کہ شادی ایک سمجھوتہ ہے مگر بعد میں احساس ہوا کہ جب ہم کھانے پینے کے معاملے میں سمجھوتہ نہیں کر سکتے تو اس شخص کے لیے کیسے سمجھوتہ کر سکتے ہیں، جس کے ساتھ ہمیں چوبیس گھنٹے گزارنے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ رشتہ ایک دوسرے کو تسکین پہنچانے کا ذریعہ ہے، اگر اللہ نے اس رشتے کے درمیان محبت اور رحمت نہ ڈالی ہوتی تو یہ کبھی قائم نہ ہوتا، جو لوگ اس رشتے کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، انہیں اللہ کو درمیان میں رکھنا ہوگا۔ قرآن کو سمجھے بغیر یہ رشتہ اپنی اصلی حالت میں نظر نہیں آئے گا۔

عائشہ نجم: قرآن پڑھنے اور اس کے احکامات کے پیروی کرنے سے ہمیں اپنی زندگی میں جو آسانیاں پیدا ہوئی ہیں، میں چاہوں گی کہ ہر شادی شدہ جوڑا ان احکامات کو پڑھے، سمجھے اور عمل کرے، میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں بہ حیثیت انسان لوگوں کے ساتھ تعلقات قائم رکھنے کی تمیز نہیں ہے۔ ہماری پاس صحیح غلط کی تمیز نہیں ہے۔ ہم اپنے اصولوں پر چلتے ہیں۔ جب تک ہم اللہ کے

احکامات کو اختیار نہیں کریں گے، زندگی میں توازن قائم نہیں ہوگا۔

سوال: نوک جھونک ہوتی ہے؟

نجم شیراز: جی ہاں۔ لیکن ناراضی پانچ منٹ سے زیادہ نہیں رہتی۔ پانچ منٹ میں معاملہ رفع دفع ہو جاتا ہے۔

عائشہ نجم: جی ہاں۔

سوال: کن باتوں پر نوک جھونک ہوتی ہے؟

نجم شیراز: عموماً ذمے داریوں کی عدم ادائیگی پر ہوتی ہے۔ چونکہ پچھلے دو برس سے قرآن پڑھ رہے ہیں، اس لیے صبر کرنا سیکھ لیا ہے، غصے پر قابو کرنا سیکھ لیا ہے بات کرنے کی تمیز بھی آ گئی ہے، پہلے میرا مزاج انتہائی جارحانہ ہوتا تھا، بغیر سوچے سمجھے بات کہہ دیتا تھا۔

عائشہ نجم: نوک جھونک کی نوبت اس وقت پیش آتی ہے۔ جب میں اپنی ذمہ داریاں سو فیصد نہیں نبھاتی۔ ظاہر ہے کہ کھانے کا وقت مقرر ہے، اگر وقت پر کھانا نہ ملے، تو ہر شخص کو غصہ آ جائے گا، لیکن کوئی ایسی بات نہیں ہوتی، جس کی وجہ سے بڑا فساد پیدا ہو (تھوڑے وقفے بعد) جب نجم کا موبائل نہیں ملتا، تب بہت غصہ آتا ہے۔

سوال: ویک اینڈ کس طرح مناتے ہیں؟

نجم شیراز: ہمارا تو پورا ہفتہ ویک اینڈ رہتا ہے، کیونکہ میں صبح نو سے چھ بجے تک ملازمت نہیں کرتا۔ اس بات پر عائشہ کو چھیڑتا بھی ہوں کہ تمہاری عیاشی ہے کہ تمہیں آدھا دن گھر پر مل جاتا ہوں۔ ویسے ہفتے کے دن قرآن کی کلاسز میں لوگوں سے ملنے جلنے کا موقع ملتا ہے، کیونکہ وہاں عموماً ملازمت پیشہ لوگ آتے ہیں، جن سے عام دنوں میں بات کرنے کا موقع نہیں ملتا، کیونکہ صبح انہیں کام پر جانا ہوتا ہے۔

عائشہ نجم: چھٹی کا دن بھی عام دنوں کی طرح گزر جاتا ہے۔

سوال: فلمیں دیکھتے ہیں؟

نجم شیراز: جی ہاں دیکھتے ہیں۔

عائشہ نجم: کبھی کبھار کلاس سے گھر جلدی آ جائیں تو دیکھ لیتے ہیں ویسے ہمارے گھر کا ماحول ایسا نہیں ہے کہ روزانہ فلمیں دیکھی جائیں۔

سوال: آپ دونوں نے آخری فلم کون سی دیکھی تھی؟

نجم شیراز: یہ تو یاد نہیں، خاصا عرصہ ہو گیا ہے۔

عائشہ نجم: ہم نے "مائینوریٹی رپورٹ" دیکھی تھی۔ لاہور سے نجم کے بھانجا، بھانجی آئے ہوئے تھے، ان کے ساتھ دیکھی تھی۔

سوال: حیا کی تربیت میں کس کا کردار نمایاں ہے؟

نجم شیراز: بہ حیثیت والدین دونوں اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ میری خواہش ہوتی ہے کہ جب یہ سو کر اٹھے تو میں اس کے پاس ہوں، کیونکہ جب یہ خود اٹھ کر کمرے سے باہر آتی ہے تو بہت عجیب لگتا ہے۔ بے چاری پریشان ہو جاتی ہے۔ میں جب چھوٹا تھا تو میری خواہش ہوتی تھی کہ امی یا ابو میں سے کوئی ایک مجھے جگائے، مجھے بستر سے اتارے، بہرحال اب حیا تھوڑی سمجھدار ہو گئی ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ صبح سے شام تک اپنی ماں کے ساتھ ہوتی ہے تو ضد اور لاڈ بہت کرتی ہے یا

بات دیر میں سنتی ہے۔ میں نے اس کے ساتھ ایسے تعلقات رکھے ہیں کہ وہ میرے ساتھ خواہ مخواہ ڈرامے نہیں کرتی۔ جلدی بات سن لیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ جن کی جان طوطے میں ہوتی ہے، یہ ہمارے طوطے تو ہیں، ان کے اندر ہماری جان تو ہے، لیکن مجھے یہ ڈر بھی لگتا ہے کہ کہیں یہ بگڑ نہ جائے، کیونکہ میں بگڑا ہوا تھا، اب جا کر تھوڑا بہتر ہوا ہوں۔

عائشہ نجم: جہاں تک بچوں کی تربیت کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی ذمے داری ماں کو دی ہے۔ بچے کی شخصیت کی تعمیر میں ماں کا کردار اہم ہے، جہاں تک نجم کا تعلق ہے تو جب یہ گھر پر ہوتے ہیں تو حیا کو سو فیصد وقت دیتے ہیں۔

سوال: گھریلو کام کاج میں اہلیہ کا ہاتھ بٹاتے ہیں؟

نجم شیراز: بہت کم۔ زیادہ نہیں۔

عائشہ نجم: میں انہیں موقع نہیں دیتی، کیونکہ یہ میری ذمے داری ہے، اگر نجم خود سے کام کرتے ہیں تو انہیں روکتی نہیں ہوں۔ کبھی کبھار یہ باورچی خانے میں آ کر برتن دھو لیتے ہیں، لیکن میری خواہش ہوتی ہے کہ میں پہلے ہی سارا کام ختم کر دوں تا کہ انہیں موقع نہ ملے۔

سوال: اہلیہ آپ کی کون سی عادت سے بیزار رہتی ہیں؟

نجم شیراز: جب سے ہم دونوں نے قرآن پڑھنا شروع کیا ہے، ہمارے نظریات بدل گئے ہیں، ہم نے درگزر کرنا سیکھ لیا ہے، کیونکہ جب تک درگزر نہیں ہوگا، آپ کسی کو تعلیم نہیں دے سکیں گے۔ عائشہ نے ہماری بیڈروم کے دروازے پر قرآن کی چند آیات لکھ دی ہیں، جیسے سترہویں سورۃ کی 53 آیت میں اللہ فرماتا ہے کہ: ''احسن پکارو'' ہم دونوں کی عادت تھی کہ کفن پھاڑ کر بولتے تھے، مگر اب ایسا نہیں ہے۔

عائشہ نجم: کوئی نہیں ہے، دیکھیں ہم لوگ کم زور بنائے گئے ہیں، اس لیے اپنی کمزوریوں پر نظر رکھنے کی بجائے دوسروں کی خامیوں پر نظر رکھتے ہیں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ میں نجم کی برائیوں پر نظر رکھنے کے بجائے پہلے اپنے گریبان میں جھانکوں۔ جب میں سو فیصد درست ہوں گی تو نجم کو ان کی خامیاں بتا سکوں گی۔

سوال: کن باتوں پر دل اداس ہو جاتا ہے؟

نجم شیراز: پہلے تو کئی باتوں پر ہوتا تھا، کیونکہ میری پچھلی زندگی ناشکری میں گزری ہے، جتنا بھی مل جاتا تھا، کم لگتا تھا، جو تھا، اس کا احساس نہیں تھا، اب مجھے تب اداسی ہوتی ہے، جب میں شہر سے باہر جاتا ہوں۔ میں قرآن کی کلاسیں مس کرتا ہوں، دوستوں کو یاد کرتا ہوں۔

عائشہ نجم: میں نے کبھی نجم کو اداس نہیں دیکھا۔ یہ اداس ہونے والے لوگوں میں سے نہیں۔ یہ اپنے حالات سے لڑ کر نکل جاتے ہیں۔

سوال: اپنی پریشانیوں اور تکالیف سے ایک دوسرے کو آگاہ کرتے ہیں؟

نجم شیراز: میں بیوی سے ایسے مسائل ڈسکس کرنے کا قائل نہیں ہوں، جو اسے پریشان کر دیں، ایسا بھی نہیں ہے کہ میں ان سے پیشہ ورانہ زندگی کا کوئی مسئلہ شیئر نہیں کرتا۔ عائشہ کو سب پتا ہوتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے، کس پروجیکٹ پر کام چل رہا ہے۔ پروجیکٹ کے دوران اگر کوئی پریشانی آتی ہے تو میں ان سے مشورہ لے لیتا ہوں۔

عائشہ نجم: اگر وہ پریشانی مجھ سے تعلق رکھتی ہے یا کسی مسئلے کے حل کے لیے میرا مشورہ ان کے کام آ سکتا ہے، تب ڈسکس کرتے ہیں، ویسے عموماً ہم پریشانیاں ڈسکس نہیں کرتے، کیوں کہ نجم کی پیشہ ورانہ زندگی کا مسئلہ میں کیسے حل کر سکتی ہوں۔

سوال: شاپنگ پر ساتھ جاتے ہیں؟

نجم شیراز: سچی بات بتاؤں، میں پہلے شاپنگ پر نہیں جاتا تھا، مجھے مارکیٹ میں کھڑا ہونا بہت برا لگتا تھا، مگر اب میں نارمل زندگی گزارنے کا عادی ہو گیا ہوں، مجھے اس میں مزا بھی آ رہا ہے۔ عائشہ کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو ساتھ چلا جاتا ہوں۔

عائشہ نجم: جی ہاں۔ گزشتہ دنوں مجھے دوپٹے خریدنے تھے، نجم میرے ساتھ مارکیٹ گئے تھے۔

سوال: وقت کے پابند ہیں؟

نجم شیراز: میں نے پندرہ برس بعد پچھلے ہفتے گھڑی خریدی ہے، یہ پندرہ برس میں نے بغیر گھڑی کے گزارے ہیں (ہنستے ہوئے) جو اس بات کا ثبوت ہے کہ میں وقت کا پابند نہیں تھا، مگر اب میں اپنی اس خامی پر قابو پانا سیکھ رہا ہوں۔

عائشہ نجم: ان کو وقت کا احساس نہیں ہوتا، مگر آج کل وقت کے پابند ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سوال: سسرال والوں کے ساتھ آپ کے تعلقات کیسے ہیں؟

نجم شیراز: بہت اچھے۔ میں آپ کو سچی بات بتاؤں کہ پچھلے دو برسوں میں ان تعلقات میں بہتری آئی ہے۔ میں عائشہ کے والدین کی بہت عزت کرتا تھا، کیونکہ وہ اپنی بیٹی کے مسلمان ہونے کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنے۔ یہ بہت حوصلے کی بات ہے، وہ بھی ہماری شادی کا نتیجہ دیکھ رہے ہیں، یہ دیکھ کر پہلے سے زیادہ مطمئن ہو گئے ہیں کہ ان کی بیٹی میرے ساتھ خوش ہے۔ شادی کے کچھ عرصے بعد میں نے محسوس کیا تھا کہ ہمارے درمیان کھنچاؤ تھا، مگر اب فاصلے ختم ہو گئے ہیں۔

عائشہ نجم: نجم کے اچھے تعلقات ہیں، جہاں تک میرے تعلقات کی بات ہے تو پچھلے دو برسوں میں مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ بہ حیثیت بیٹی والدین کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیے، وہ میرے لیے جو کچھ بھی کرتے تھے، اسے اپنا حق سمجھتی تھی۔ ان کی قربانیوں کو بھول جاتی تھی جب اپنی مرضی کی بات نہیں ہوتی تھی تو گھر میں جھگڑے ہوتے تھے۔ بدتمیزیاں ہوتی تھیں، لیکن پھر اسلام قبول کرنے اور قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد میں نے والدین کی اہمیت کو سمجھا اور یہ سیکھا کہ ان کے سامنے ہمیں اف تک کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

سوال: شدید تھکن میں مہمان آ جائیں تو آپ کا رویہ کیسا ہوگا؟ آپ ان سے ملیں گے یا معذرت کر لیں گے؟

نجم شیراز: اگر کوئی بغیر نوٹس کے آ جائے تو میں الجھ جاتا ہوں، وہ اس لیے کہ اگر میں گھر پر ہوں تو وہ وقت اپنی فیملی کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں پہلے تو میں مہمانوں سے معذرت کر لیتا ہوں، جس سے لوگ ناراض ہو جاتے ہیں۔ چاہے غلطی ان ہی کی کیوں نہ ہو، مگر اب یہ سمجھ میں آیا ہے کہ لوگوں کو بہتر طریقے سے غلطی کا احساس دلایا جا سکتا ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ تھوڑا بہت وقت اس کے ساتھ گزار کر اپنی مجبوری بتا دوں۔

عائشہ نجم: ہم مہمانوں سے ملیں گے۔

سوال: ایک مذہبی پاپ سنگر!

نجم شیراز: ہمیں قریب لانے کا سب سے اہم سبب یہ تھا کہ ہم دونوں پر امن زندگی گزارنے کا مستقل طریقہ ڈھونڈ رہے تھے۔ شادی سے قبل میں آزادانہ زندگی گزار رہا تھا۔ عائشہ بھی ایک ایئر لائن میں ملازمت کرتی تھی، لیکن ہم دونوں کو یہ نہیں علم تھا کہ ہمارا مستقبل کیا ہے۔ ہم دونوں ملے تو ہماری شخصیت کی تعمیر کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ عائشہ کو اسلام سے دلچسپی تھی، مجھے اپنے مذہب کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا۔ وہ اکثر مجھ سے مذہب کے حوالے سے سوال پوچھتی، جس کا جواب میرے پاس

نہیں ہوتا تھا، پھر قدرت خود بہ خود مجھے کتاب کی طرف لے آئی۔ عموماً لوگوں کو یہ عجیب لگتا ہے کہ ایک پاپ سنگر دین کی بات کیسے کر رہا ہے؟ اس سوال کے جواب میں، میں نے "حمد" بھی پڑھی تھی تاکہ لوگوں کو اندازہ ہو کہ اپنی آواز سے بہتر کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ میرا لوگوں کو یہی پیغام ہے کہ وہ ہماری حوصلہ شکنی کے بجائے حوصلہ افزائی کریں، کیونکہ ہماری زندگی ایک ٹرک کی مانند ہے، جو آہستہ آہستہ بریک لگا کر یوٹرن لیتا ہے اور حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ حکمت مومن کی پونجی ہے، جہاں سے ملے سمیٹ لو، اگر میں کوئی اچھی بات کرتا ہوں تو ایک مومن کو اسے قبول کرنا چاہیے۔

❁❁❁


## لحاف

عصمت چغتائی اردو زبان میں افسانہ نگاری کے حوالے سے ایک بڑا اور معتبر نام ہے...... منٹو کی طرح عصمت کا قلم بھی معاشرے کے حساس موضوعات کی نشاندہی کرتا رہا اور اس پر بھی اکثر اوقات فحش نگاری کا الزام لگتا رہا۔ لیکن اسکے باوجود عصمت چغتائی کے افسانے اور ناول اردو ادب کا لازمی جزو ہیں۔ **لحاف** عصمت کے 11 بہترین منتخب افسانوں کے مجموعہ کا نام ہے، اس میں جوانی، لحاف، پہلی لڑکی، باندی، ایک شوہر کی خاطر، نئی دُلہن، تل، عورت، خرید لو، بہو بیٹیاں اور ڈائن افسانے شامل ہیں۔ افسانوں کا یہ مجموعہ بہت جلد کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا، جسے **افسانے** سیکشن میں پڑھا جا سکے گا۔

## پرایا آسمان

**پرایا آسمان** رشتوں میں گندھی ہوئی کہانی ہے جو اسقدر قریبی ہوتے ہیں کہ ان کے بغیر ہم ادھورے اور نامکمل ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود جب انہی رشتوں کو دولت کے پیمانے پر تولنے لگتے ہیں تو پھر ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں، لیکن یہ سچ ہے کہ جہاں رشتوں کے بندھن اور محبت کا معیار پیسہ بن جائے وہاں خون کے رشتے کہیں دفن ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کتاب گھر کے **ناول** سیکشن میں جلد آرہا ہے۔

# نوجوان نسل کا پسندیدہ گلوکار

## عامر سلیم

عامر سلیم اپنے خوبصورت انداز کی وجہ سے ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ دوسروں سے ہٹ کر کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ عامر سلیم کی 6 البم مارکیٹ میں آ چکی ہیں جن میں 5 اردو اور ایک پنجابی ہے۔ ان کی پنجابی البم دو مہینے پہلے ریلیز ہوئی ہے جس کا ریسپانس بہت اچھا آیا ہے۔ انٹرویو کی تفصیل قارئین کی نذر ہے:

سوال: ''دل دا کوارٹر'' کا کیسا ریسپانس ملا اور آپ اس کی مارکیٹنگ کے لیے کیا کر رہے ہیں؟

عامر: البم ''دل دا کوارٹر'' کو ریلیز ہوئے دو مہینے ہو گئے۔ اس کا ریسپانس بہت اچھا ہے۔ میں اس کی مارکیٹنگ کے لیے شوز کر رہا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ دو ویڈیو بنائے ہیں جو آج کل مختلف چینلز پر چل رہے ہیں۔

سوال: ایک دور میں البم ریلیز ہونے کے بعد لوگ البم خرید لیتے تھے مگر اب ویڈیوز کا دور ہے۔ کیا آپ کے خیال میں ویڈیوز گلوکار کی شہرت کے لیے ضروری ہیں؟

عامر: آج سے دس' پندرہ سال پہلے ویڈیو اتنی عام نہیں تھی اور نہ ہی گلوکار ویڈیو خود بناتے تھے مگر وقت کے ساتھ ساتھ چینلز کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ نئے نئے گلوکار آ رہے ہیں جس کی وجہ سے گلوکاروں میں مقابلے کی فضاء پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ویڈیو کا مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ آج کے دور میں ایک گلوکار کی شہرت حاصل کرنے کے لیے اچھے گانے' اچھے میوزک سے زیادہ اچھی ویڈیو کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے البم ریلیز کرنے کے بعد دو ویڈیو بنائے ہیں جس کا بجٹ بہت کم ہے مگر اب بہت زیادہ بجٹ کی ویڈیوز بننا شروع ہو گئی ہیں جو میرے جیسا افورڈ نہیں کر سکتا۔

سوال: چینلز گلوکاروں کی کیا مدد کرتے ہیں؟

عامر: چینلز آج کے دور میں گلوکاروں کی کوئی مدد نہیں کرتے۔ پاکستان میں رائلٹی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ہر چینل فری ویڈیو لیتا ہے' اس کے باوجود ویڈیوز چلانے کے لیے بہت نخرے ہوتے ہیں۔ پی ٹی وی کو میں سلام پیش کرتا ہوں کہ وہ آج بھی گلوکاروں کی رائلٹی کا خیال رکھتا ہے اور گلوکاروں کو ان کی محنت کا صلہ دیتا ہے۔ چینلز اور ریڈیوز کو چاہیے کہ وہ فنکاروں کی مدد کریں اور ان کی ویڈیوز کو دیکھنے کے بجائے گانے کو دیکھیں۔ جس گلوکار کا گانا اچھا ہے' اس کو چلائیں۔ دنیا بھر میں چینلز اپنے ملک کے گلوکاروں کو پرموٹ کرتے ہیں مگر ہمارے یہاں الٹا حساب ہے۔ غیر ملکی گلوکاروں کے گانے اور ویڈیوز چلائے جا رہے ہیں' اپنے ملک کے فنکاروں اور گلوکاروں کے لیے چینلز کے پاس وقت ہی نہیں ہے جبکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ان ممالک میں ہمارے گانوں کو بھی اسی طرح چلایا جا رہا ہے؟ یہ ضروری ہے کہ نئے چینلز آنے سے گلوکاروں کو کام کے زیادہ مواقع مل رہے ہیں۔ نئے نئے سنگر سامنے آ رہے ہیں مگر فنکاروں کی مالی مدد کوئی چینل نہیں کرتا' صرف پی ٹی وی گلوکاروں کی مدد کرتا

ہے۔

سوال: کیا البم کی کامیابی کے لیے ویڈیو ضروری ہے؟

عامر: میرے خیال میں بالکل نہیں ہے۔ آج کل گلوکار اپنی البم پر چالیس پچاس لاکھ روپے خرچ کر دیتے ہیں مگر ان کا البم پانچ دس لاکھ میں بھی نہیں فروخت ہوتی تو ایسی ویڈیو کا کیا فائدہ؟ گانا ہٹ ہوتا ہے تو بغیر کسی ویڈیو کے بھی ہو جاتا ہے۔

سوال: آج کے دور میں آپ نے اپنے میوزک میں کیا تبدیلی پیدا کی ہے؟

عامر: وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز میں تبدیلی تو آتی رہتی ہے کیونکہ اگر آپ اپنے میوزک میں تبدیلی نہیں لائیں گے تو آپ کے ساتھ کے لوگ تو آپ کے گانے کو سنیں گے مگر نئی نسل آپ کے میوزک کو پسند نہیں کرے گی۔ اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ضروری ہیں۔

سوال: گلوکاری کے علاوہ کیا مصروفیات ہیں؟

عامر: میں نے پروڈکشن کا سامان خریدا ہوا ہے جس کو میں کرائے پر دیتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ مختلف گلوکاروں کی ویڈیوز بھی بناتا ہوں۔ اس کے علاوہ کیمرے دوسرے لوگوں کو بھی دے دیتا ہوں تاکہ وہ اپنے آئیڈیاز کے مطابق کام کر سکیں۔ اس کے علاوہ کئی اور کام بھی کرتا ہوں۔

سوال: آپ کبھی بھارت گئے ہیں؟

عامر: بھارت جانا کوئی بُری بات نہیں ہے لیکن بھارت جس طرح لوگ جا رہے ہیں' میں اس کے خلاف ہوں کیونکہ بھارت میں ہمارے گلوکاروں اور فنکاروں کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ کوئی اچھا نہیں ہوتا۔ ہمارے گلوکار اپنے ٹکٹ پر بھارت جاتے ہیں اور مختلف لوگوں سے مل کر یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے بھارت فتح کر لیا۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ بھارت کبھی ہمارے نئے لوگوں کو پروموٹ نہیں کرتا اور نہ ہی کرے گا۔ پاکستان ہمارا ملک ہے' ہمیں اس میں رہتے ہوئے اپنے لیے کام کرنا چاہیے کیونکہ پاکستان سے ہماری شناخت ہے اور ہم جو کچھ بھی ہیں' وہ اسی ملک کی وجہ سے ہیں۔

سوال: اب تک شادی نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟

عامر: (ہنستے ہوئے) جس سے میں کرنا چاہتا تھا اس نے مجھ سے شادی نہیں کی اور جو مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہیں ان سے میں نہیں کرنا چاہتا۔ بس اسی چکر میں اتنی دیر ہو گئی۔ اب ہو سکتا ہے کہ آپ کی اس کتاب کے ذریعے کوئی ایسی لڑکی مل جائے جو مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو اور وہ مجھے بھی پسند آ جائے۔

سوال: آپ کے گھر والوں نے کبھی آپ کی شادی کی کوشش نہیں کی؟

عامر: گھر والوں نے بہت کوشش کی مگر قسمت کو شاید منظور نہیں تھا۔

سوال: کیا کوئی عشق وغیرہ کا چکر تو نہیں تھا؟

عامر: کیا اشارہ کافی نہیں ہے۔

سوال: کس طرح کی لڑکی آپ کی آئیڈیل ہے؟

عامر: مجھے بس ایسی لڑکی چاہیے جو زندگی میں میرے ساتھ چل سکے۔

سوال: قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

عامر: قارئین کے ساتھ ساتھ میں لکھنے والوں کو بھی یہ کہوں گا کہ وہ پاکستانی بنیں اور پاکستان کی قدر کریں کیونکہ میں آج کل دیکھ رہا ہوں کہ اخبارات پاکستانی اداکاروں اور گلوکاروں کے بجائے بھارتی فنکاروں کو زیادہ پروموٹ کر رہے ہیں جس کی وجہ سے معاشرے میں اچھا تاثر نہیں پڑ رہا۔ وہ لکھنے مبارکباد کے حقدار ہیں جو آج کے مشکل دور میں بھی پاکستان کی ثقافتی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ان میں اس وقت مجید نظامی صاحب کا نام سرفہرست ہے جو نظریہ پاکستان اور پاکستانی کلچر کو پروموٹ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو لمبی زندگی دے اور ہمیں پاکستان کی قدر کرنے کی توفیق دے۔

سوال: مستقبل کے بارے میں کیا پروگرام ہے؟

عامر: منصوبے تو انسان بہت بناتا ہے مگر ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ انسان اپنی طرف سے کوشش کرے اور دوسرے کا حق مارنے کی کوشش نہ کرے تو اللہ تعالیٰ انسان کے لیے راستہ خود بنا دیتا ہے۔ میں بھی اپنی طرف سے کوشش کرتا رہتا ہوں' ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔


## یتی

اس طویل و عریض دنیا میں ابھی بے شمار حقائق ایسے بھی ہیں جن سے انسان پوری طرح باخبر نہیں ہوسکا ہے لیکن اس کی تجسس پسند فطرت ہر روز کسی نئے چونکا دینے والے انکشاف کے لئے اسے بے قرار رکھتی ہے۔ ایسے ہی چند تحقیق کے میدان کے کھلاڑیوں کی مہم جوئی کا قصہ۔ وہ ایک ان دیکھی مخلوق کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین تھے۔ ان کی مہم جو طبیعت انہیں خطرناک راستوں پر لے آئی تھی۔ ایک **یتی (برفانی انسان)** کی انہیں تلاش تھی۔ اس کتاب کا قصہ جس کا آخری باب تحریر کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ انگریزی ادب سے یہ انتخاب، کتاب گھر کے **ایکشن ایڈونچر ناول** سیکشن میں جلد آ رہا ہے۔

# پاپ گلوکار شیراز اپل

زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو اگر آپ پوری محنت اور دیانتداری کے ساتھ کام کریں تو کامیابی آپ کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ معاشرے کی اقدار بھی بدلتی رہتی ہیں۔ یہی زندگی اور زندہ پن کی علامت ہے۔ شعبہ میوزک میں نئے تجربات اور نئی دریافت بھی بہت اہم ہیں۔ نوجوان سنگر شیراز اپل بھی اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہیں۔

شیراز اپل نے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹر کیا اور گلوکاری میں وہ شوق ہی کی وجہ سے آئے ہیں اور یہ شوق اب ان کا کیریئر بن چکا ہے۔ اس کے علاوہ لاہور کے چند تعلیمی اداروں میں میوزک کی تعلیم بھی دیتے رہے ہیں۔ اس حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ میوزک کی تعلیم دینے کا مقصد یہ نہیں کہ وہ تمام لوگ جو گلوکاری کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ وہ گلوکار ہی بنیں اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اچھی میوزک کے بارے میں جان جاتے ہیں پھر میرے مشاہدے میں یہ بات آئی کہ بچے بڑوں کی نسبت بہت جلد سیکھ جاتے ہیں پھر ان معصوم فرشتوں نے مجھے وہ محبت دی ہے جو میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ اپنی البم کے حوالے سے میری مصروفیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا پھر میرے لیے مشکل ہو گیا۔ بچوں کو میوزک کی تعلیم دینا۔ آخرکار بوجھل دل کے ساتھ سکول کو خیرباد کہنا پڑا تاہم اب بھی بہت سے بچے مجھے فون کر کے اپنے جذبات کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور میں گھنٹوں ان کی یادوں میں کھویا رہتا ہوں۔

پاکستانی موسیقی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے شیراز اپل نے کہا کہ جس طرح سچ کو آنچ نہیں اسی طرح پاکستانی موسیقی کو زوال نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے ساری دنیا کی موسیقی ایک دوسرے پر اثرانداز ہو رہی ہے۔ ان حالات میں اگر موسیقی کا کوئی نیا رجحان فروغ پاتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم کمزور ہیں۔ ہم موسیقی کی عظیم روایات کے امین اور وارث ہیں جو دنیا موسیقی میں اپنا ایک الگ اور منفرد مقام رکھتی ہے۔ اسی حوالے سے ہماری پاپ سنگرز بھی جانے جاتے ہیں پھر پاپ میوزک کی بدولت موسیقی اور گائیگی کے شعبہ میں بہت سا ٹیلنٹ سامنے آیا ہے اور یہ ٹیلنٹ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر گراں قدر خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ ان کی وجہ سے میوزک انڈسٹری کو فروغ ملا ہے اور سپانسرز کی وجہ سے قیمتی زرمبادلہ بھی ملک میں آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے گانوں کی ویڈیو نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اچھی آواز کے علاوہ اچھی ویڈیو بن جائے تو سونے پر سہاگہ۔ ویسے بھی اب گانا سننے کی بجائے دیکھنے کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ ٹی وی سکرین کی کشش اپنی اہمیت رکھتی ہے۔ اسی بنا پر پاپ میوزک سننے اور دیکھنے والوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اس کا ایک منفی پہلو سامنے آیا ہے وہ یہ کہ اچھی صلاحیت والے گلوکار وسائل کی کمی کی وجہ سے ویڈیو بنانے کی استطاعت نہیں رکھتے، پیچھے رہ جاتے ہیں اور نسبتاً کم صلاحیت والے مالی وسائل کی بہتات کے سبب ٹی وی سکرین پر نظر آتے ہیں۔ جہاں تک ہمسایہ ملک کی موسیقی کی بات ہے تو وہاں کی مارکیٹ ہماری نسبت بہت بڑی ہے وہاں فلموں میں میوزک کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔

ہائی بجٹ فلمیں بنتی ہیں حالانکہ پچاس ساٹھ کی دہائی میں ہماری فلموں نے بہت اچھا میوزک دیا تاہم اچھی موسیقی کسی کی میراث نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ فلمی حوالے سے ہمسایہ ملک آگے ہے جبکہ ہمارا پاپ میوزک وہاں بھی پسند کیا جا رہا ہے اور ہم اس شعبہ میں ان سے آگے ہیں۔ ہمارے فلم سازوں نے بھی بعض اوقات پاپ سنگرز کے نغمے اپنی فلموں میں شامل کیے ہیں اور ان کا تجربہ کامیاب رہا ہے پھر ہمارا ریڈیو بھی ہمارے

میوزک کی ترقی میں بھرپور کردار ادا کر رہا ہے جہاں جہاں ٹی وی نشریات نہیں پہنچی وہاں یہ کمی ریڈیو اور FM چینل پوری کر رہے ہیں ویسے بھی ہمارے ملک کے نامور فنکاروں کو ریڈیو ہی نے متعارف کروایا اور عالمی شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا ہے۔

شیراز اپل نے موسیقی کے مخصوص گھرانوں کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ کلاسیکی موسیقی کے فروغ میں ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا اور یہ خوش آئند بات ہے کہ ان گھرانوں کے گلوکار پاپ بھی گانا شروع ہو گئے ہیں میں نے اپنے ملک کے علاوہ امریکہ اور انگلستان میں بھی پرفارم کیا ہے وہاں پر مقیم پاکستانی اپنے دیس کے فنکاروں کا ایسا والہانہ استقبال کرتے ہیں جس سے فنکار کا ڈھیروں خون بڑھ جاتا ہے اور ہمیں پرفارم کرنے میں بہت ہی مزہ آتا ہے۔ وہ لوک گیتوں کو زیادہ شوق سے سنتے ہیں شاید اس لیے کہ ان گیتوں میں انہیں اپنے وطن کی مٹی کی خوشبو آتی ہے پھر دوسری بات جو میرے مشاہدے میں آتی ہے کہ وہ پاکستان کے حوالے سے ہم سے زیادہ باخبر ہوتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ پاکستان کا شمار ترقی یافتہ اقوام میں سے ہو۔ اتنی محبت ملنے کے بعد جب ہم وطن واپس آتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ ارضِ پاک پر پاؤں کی بجائے جبیں رکھ دیں۔

گلوکار کا کام صرف گانا ہے نہ کہ شاعری جس کا کام اسی کو ساجھے۔ اس حوالے سے مجھے اچھی شاعری کا چناؤ کرنا پڑتا ہے تاہم کبھی کبھی خود بھی کچھ لکھ لیتا ہوں۔ میری آن یو والی البم میں چند گیت میرے لکھے ہوئے ہیں جن میں

جے کر ہووے کار کوٹھی پیسے دی برسات وے
عشق نہ پچھے دین دھرم تے عشق نہ پچھے ذات وے

اور دوسرا یہ گانا......

نہ تو میری ہیر ایں ملنے نہ میں تیرا رانجھا ہاں
شادی ساڈی خوب نبھے گی پیو تیرے دا بھانجا ہاں

امریکہ میں اپنی پرفارمنس کے حوالے سے کہا کہ میں وہاں پرفارم کر رہا تھا وہاں بھارت کے نامور میوزک ڈائریکٹر اے آر رحمٰن بھی موجود تھے۔ انہوں نے میرے گانا کو سراہا اور مجھے اپنی فلم "نائیک" کے لیے گانے کی پیشکش کی جو کہ میں نے قبول کر لی اور اس کی ریکارڈنگ لندن میں ہوئی۔ اسی ماہ پھر بھارت جا رہا ہوں۔ امید ہے کہ وہاں پاکستان کا نام روشن کروں گا۔ انشاءاللہ۔

اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی شیراز اپل نے کہا کہ فن موسیقی بھی سمندر کی مانند ہے۔ اس میں جتنا گہرا غوطہ لگائیں گے اتنا ہی فیض پائیں گے۔ محنت کا کوئی بدل نہیں۔ شارٹ کٹ کی کوشش فضول ہے۔ تمام فنون لطیفہ کو سیکھنے کا ایک ہی راز ہے کہ اپنے جسم کے ساتھ روح کو بھی شامل کر لیا جائے۔ ذوق و شوق منزلیں آسان کر دیتا ہے۔ ہر گلوکار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی اوریجنل آواز میں گائے جو لوگ دوسروں کی کاپی کرتے ہیں وہ کبھی بڑے گلوکار نہیں بن سکتے۔ ریاضت ہی کسی گلوکار کو اعلیٰ مقام پر پہنچا سکتی ہے۔ آج کے دور میں ہم سب خوشی کے لمحات کی تلاش میں رہتے ہیں جو ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ گلوکاری کے لیے سُر اور لے کا ادراک بہت ضروری ہے۔ اس فن کے لیے جس محنت ریاضت اور لگن کی ضرورت ہے۔ نئے فنکاروں میں اس کی کمی ہے۔ کچھ لوگوں میں رجحان پایا جاتا ہے کہ راتوں رات شہرت کی بلندیوں کو چھولیں اور بعض اوقات تعلق داریوں کی بنا پر کچھ لوگ وقتی طور پر شہرت حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن شہرت کبھی بھی دیرپا ثابت نہیں ہوتی۔

شیراز نے اپنے گھر میں ریکارڈنگ سٹوڈیو بنایا ہے۔ وہ اپنے گیتوں کی ریکارڈنگ اپنے گھر ہی میں کرتے ہیں۔ وہ اکثر تنہائی میں ترانے گنگناتے ہیں۔ اس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ میں شہید باپ کا بیٹا ہوں۔ یہ جذبہ حب الوطنی میرے دل میں رچا بسا ہوا ہے۔ ملی ترانے میں رگوں میں سمائے ہوئے ہیں بلکہ میرا ایک ملی ترانہ جو حال ہی میں ریکارڈ کروایا ہے جس کے بول ہیں۔

جائیں میری ساری سارے میرے ارمان
بس تیری حرمت کی خاطر کردوں قربان

❁❁❁


## سونا گھاٹ کا پجاری

سونا گھاٹ کا پجاری ...... بے پناہ پراسرار قوتوں اور کالی طاقتوں کا مالک جو اپنی موت کے بعد بھی زندہ تھا۔ افضل بیگ ...... ایک مسلمان فارسٹ آفیسر جو سونا گھاٹ کے قہر کا نشانہ بنا...... پھر وہ انتقام لینے کے جوش میں اندھا ہو گیا اور اپنا مذہب ترک کر کے جادوٹونے کے اندھیروں میں ڈوب گیا۔ ایک ایسا ناول جو پراسرار کہانیوں کے شائقین کو اپنے سحر میں جکڑ لے گا۔ **سونا گھاٹ کا پجاری** اپنے انجام تک کیسے پہنچا۔ افضل بیگ گناہ اور غلاظت کی دُنیا سے کیسے لوٹا؟ ہندو دھرم، دیوی دیوتاؤں، کالے جادو، بیروں کے خوفناک تصادم سے مزین یہ داستان آپ جلد ہی **کتاب گھر** کے **پراسرار خوفناک ناول** سیکشن میں پڑھ سکیں گے۔

## اقابلا

اقابلا ...... تاریک اور پراسرار برِاعظم افریقہ کے خوفناک جنگلوں میں آباد ایک غیر مہذب قبیلہ ...... جو اقابلا نامی دیوی کے پجاری تھے۔ بحری جہاز کی تباہی کے بعد مہذب دُنیا کے چند افراد اس قبیلے کے چنگل میں جا پھنسے۔ شوالا ...... جنگلی قبیلے کا ایک سردار جسے دیوی اقابلا نے تمام حشرات الارض کا مختار بنا دیا تھا۔ کالاری ...... جنگلی قبیلے کا دوسرا سردار جس کی تمام درندوں پر حکمرانی تھی۔ کیا مہذب انسانوں کی اس جنگلی خونخوار قبیلے سے واپسی ممکن ہوسکی؟ انور صدیقی کے جادوں بیاں قلم کی یہ طویل اور دلچسپ داستان آپ جلد ہی **کتاب گھر** کے **ایکشن ایڈونچر ناول** سیکشن میں پڑھ سکیں گے۔

# نوجوان پاپ سنگر

## شارق رومی

''آوارگی میں حد سے گزر جانا چاہیے'' (ری مکس)، ''فکر نہ فاقہ، عیش کر کاکا''، ''چندا منہ چھپا لے''، ''مکھڑا، تیرا مکھڑا'' یہ بول سن کر ایک ہی آواز ذہن میں گونجتی ہے، اور وہ ہے'' شارق رومی'' کی آواز۔ شارق نے اپنے کیریئر کا آغاز نوے کی دہائی میں کیا، جب پاکستان میں پاپ انڈسٹری ابھی پنپ رہی تھی اور نئے نئے میوزیکل گروپ سامنے آ رہے تھے۔ میٹرک کے امتحان کے بعد انہوں نے فن گلوکاری میں طبع آزمائی کی تب سے شارق کانٹروں کے ساتھ سفر جاری ہے۔

شارق رومی 28 جنوری 1979ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد انور علی رومی طالب علمی کے زمانے میں بہترین مقرر رہ چکے تھے اور اب کے ای ایس سی میں چیف منیجر کسٹمر سروس کے عہدے پر تعینات ہیں۔ والدہ ریحانہ رومی ایک مونٹیسری سکول چلا رہی ہیں۔ چھوٹی بہن حرا مقامی کالج میں زیر تعلیم ہیں۔ اُن سے کیے جانے والے سوال جو قارئین کی نذر ہے۔

سوال: اپنے تعلیمی پس منظر کے بارے میں کچھ بتائیے؟

شارق رومی: میں نے سینٹ جان سکول سے میٹرک کیا۔ گورنمنٹ کامرس کالج سے بی کام کر کے ایم بی اے کرنے امریکہ چلا گیا۔ تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔ ایم بی اے کے سمیسٹر باقی ہیں۔ اس لیے کچھ عرصے بعد دوبارہ امریکا جاؤں گا۔

سوال: پاپ سنگنگ کے میدان میں قدم کیسے رکھا؟

شارق رومی: میں جس زمانے میں اسکول میں زیر تعلیم تھا۔ بہت سے نوجوان پاپ گلوکاری کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ ان نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ٹی وی پر مختلف پروگرام بھی نشر کیے جا رہے تھے۔ میں یہ پروگرام شوق سے دیکھتا تھا۔ میٹرک کے امتحان سے فارغ ہو کر میں نے بھی منی بیگم کے گائے ہوئے گانے ''آوارگی میں حد سے گزر جانا چاہیے'' کو ری مکس کرنے کے لیے گٹار سنبھال لیا۔

سوال: پاپ سنگرز کی آڈیو کیسٹ میں پنجابی گانے کی موجودگی ناگزیر ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟

شارق رومی: ہم چاہے جتنے بھی مغرب زدہ کیوں نہ ہو جائیں، اپنی ثقافت سے دور نہیں ہو سکتے۔ اس لیے بیشتر پاپ سنگر پنجابی میں گانے بنا رہے ہیں۔

سوال: لیکن ہماری ثقافت صرف پنجابی تک تو محدود نہیں؟

شارق رومی: پنجابی ہمارے ملک کا سب سے بڑا صوبہ ہے یہاں پاپ موسیقی کی مارکیٹنگ دیگر صوبوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ پنجابی لکھنے اور سننے والے دنیا بھر میں موجود ہیں۔

سوال: اس شعبے میں آنے سے پڑھائی تو متاثر ہوئی ہوگی؟

شارق رومی: بالکل ہوئی ہے۔ پہلے میں پڑھائی میں بہتر تھا، لیکن شوبزنس میں آنے کے بعد کافی نقصان ہوا ہے۔ شہرت نے پڑھائی کی طرف سے دھیان ہٹا دیا۔

سوال: والدین کی طرف سے دباؤ تو پڑتا ہوگا؟

شارق رومی: والد کی طرف سے دباؤ ہے دراصل ہمارے خاندان میں کوئی شوبزنس کی طرف نہیں گیا۔ ابتدا میں تو بہت مخالفت ہوئی لیکن چونکہ میرے والد زمانہ طالب علمی میں بہت سوشل رہے ہیں، اس لیے بعد میں حالات بہتر ہوتے چلے گئے۔

سوال: بچپن کے بارے میں بتائیے کہ کیسا گزرا؟

شارق رومی: بچپن میں، مَیں بہت شریف اور معصوم تھا۔ والدین یہ فیصلہ نہیں کر پاتے تھے کہ میں شریف زیادہ ہوں یا معصوم۔ ننھیال میں پہلا بچہ تھا، اس لیے مجھ سے خوب لاڈ پیار کیا گیا۔ ددھیال کی طرف سے میں واحد بچہ تھا، جو پاکستان میں تھا۔ باقی ملک سے باہر تھے، اس لیے میرے بہت نخرے اٹھائے گئے۔

سوال: آپ کا دن کیسے گزرتا ہے؟

شارق رومی: میں صبح دیر سے اٹھتا ہوں جب تمام گھر والے اپنے اپنے کاموں پر جا چکے ہوتے ہیں۔ ناشتے سے فارغ ہو کر کمپیوٹر پر بیٹھ جاتا ہوں دن کا خاصا وقت وڈیو گیمز کھیلنے پر صرف کرتا ہوں۔ مجھے انٹرنیٹ سے شدید نفرت ہے۔ گرافک ڈیزائننگ کا شوق ہے۔ اپنے گانوں کے لیے لائنیں سوچتا ہوں۔ اس میں مزید نکھار پیدا کرنے کے لیے ''جان مال'' سے مدد لیتا ہوں۔ میری آڈیو کیسٹ میں دس لوگوں نے کام کیا ہے دراصل آڈیو کیسٹ نکالنا ایک بندے کا کام نہیں۔ یہ ٹیم ورک ہوتا ہے۔ میری اپنے شعبے کے کئی سینئر اور جونیئر لوگوں سے اچھی دوستی ہے۔ میں نے گلوکار ربی کے اسٹوڈیو میں اپنا البم ریکارڈ کیا ہے۔

سوال: نصابی کتابوں کے علاوہ کس قسم کی کتابیں پڑھتے ہیں؟

شارق رومی: شاعری کی کتابیں پڑھتا ہوں۔ مجھے غالبؔ اور گلزار بہت پسند ہیں۔

سوال: غالب سمجھ میں آجاتے ہیں؟

شارق رومی: جی ہاں۔ آجاتے ہیں۔

سوال: غصہ آتا ہے؟

شارق رومی: پہلے آتا تھا، اب نہیں آتا۔ کیونکہ اب میں پہلے کے مقابلے میں خاصا میچور ہو گیا ہوں۔ پہلے غصے کی حالت میں خوب چیختا چلاتا تھا مگر اب نظر انداز کر دیتا ہوں۔

سوال: گھر میں سب سے زیادہ کس کے قریب ہیں؟

شارق رومی: امی کے۔ میں اپنے تمام مسئلے مسائل ان سے شیئر کرتا ہوں۔ انہیں میری ایک ایک بات کا علم ہوتا ہے۔

سوال: اپنے شعبے کی کن شخصیات کی آوازیں پسند ہیں؟

شارق رومی: سجاد علی۔ انہوں نے میری بہت رہنمائی کی۔ موسیقی کے اسرار و رموز سکھانے میں ان کا بہت ہاتھ ہے۔ وہ میرے بڑے بھائی کی طرح ہیں۔ اس کے علاوہ علی حیدر، جنون گروپ کے سلمان، بنی، احمد جہانزیب، عالمگیر، مہدی حسن، نصرت فتح علی خان (مرحوم) غرض یہ کہ یہ ایک لمبی فہرست ہے۔

سوال: سال کا کون سا مہینہ پسند ہے اور کیوں؟

شارق رومی: مجھے دسمبر کا مہینہ پسند ہے۔ اس لیے کہ اس ماہ کے بعد نیا سال شروع ہوتا ہے۔ ہلکی ہلکی سردیاں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس مہینے میں میرے والدین کی شادی کی سالگرہ اور میری گرل فرینڈ کی سالگرہ آتی ہے۔ بھلا آپ ہی بتائیے کہ مجھے یہ مہینہ کیوں نہیں پسند ہوگا۔

سوال: کیا آپ کے رجحانات مذہبی ہیں؟

شارق رومی: خاصے۔ میں جب تک مخصوص آیتیں اور سورتیں نہ پڑھ لوں، اس وقت تک گھر سے باہر نہیں نکلتا۔

سوال: گھر کے کون سے کام شوق سے کرتے ہیں؟

شارق رومی: ہر کام کر دیتا ہوں۔ عموماً گھر والے فرمائش کرتے ہیں کہ فلاں جگہ لے جاؤ۔ یہ لا دو، وہ لا دو۔ غرض یہ کہ جو کہتے ہیں، وہ کر دیتا ہوں۔

سوال: گھر سے باہر نکلتے ہیں تو آپ کے چاہنے والے تو تنگ نہیں کرتے؟

شارق رومی: جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان کے چاہنے والے تنگ کرتے ہیں، وہ بے وقوفی کی باتیں کرتے ہیں۔ جو شخص شو بزنس میں آیا ہے، وہ مشہور ہونا چاہتا ہے۔ مجھے بھی دیکھ کر لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ آٹوگراف مانگتے ہیں، مجھے تو برا نہیں لگتا اور نہ ہی فینز مجھے تنگ کرتے ہیں۔

سوال: کوئی ایسا گانا جو اکثر گنگناتے ہوں؟

شارق رومی: یہ میرے موڈ پر منحصر ہے ویسے مجھے آر ڈی برمن کے سارے گانے پسند ہیں۔ ''تو ہے وہی دل نے جسے اپنا کہا''، ''اور میرے دل کے چین'' وغیرہ وغیرہ

سوال: کیا غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟

شارق رومی: اگر مجھے احساس ہو جائے کہ واقعی میری غلطی تھی تو اعتراف کر لیتا ہوں۔

سوال: کھانا پکانے سے لگاؤ ہے؟

شارق رومی: ایک مرتبہ چکن کڑاہی بنائی تھی۔ جسے گھر والوں نے کھا لیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد چھوٹی بہن حرا نے کہا تھا کہ کل سے کھانا تم ہی بناؤ گے۔

سوال: زندگی کا خوبصورت ترین دن کونسا ہے؟

شارق رومی: میرے لیے تو سارے دن ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔ ویسے میرے والدین کی شادی کی سالگرہ کا دن میرے لیے اہم ہے۔

سوال: آپ کی کوئی ایسی عادت جس سے گھر والے بیزار رہتے ہوں؟

شارق رومی: میری دیر تک سونے کی عادت ہے۔

سوال: گھر کی تزئین و آرائش سے دلچسپی ہے؟

شارق رومی: دلچسپی ہے، لیکن یہ شعبہ والدہ کا ہے جب میں ملک سے باہر تھا تو انہوں نے ہی میرا کمرہ ڈیزائن کیا تھا۔

سوال: مزاجاً نرم ہیں یا سخت؟

شارق رومی: بہت نرم ہوں لیکن سیلف ڈیفنس کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں پہلے تو غلط بات کو برداشت کرتا ہوں، لیکن جب بات برداشت

سے باہر ہو جائے تو خود کو روک نہیں سکتا۔

سوال: کس ڈیزائنر کے ملبوسات پہنتے ہیں؟

شارق رومی: پہلے میں نے دیپک پروانی سے کپڑے بنوائے تھے۔ اعجاز سے بھی اچھی دوستی ہے۔ ملک سے باہر جاتا ہوں تو DKNY اور ٹامی کے ملبوسات خریدتا ہوں۔ عموماً میں نارمل جینز اور ٹی شرٹ پہنتا ہوں۔

سوال: کن چیزوں پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں؟

شارق رومی: میں گھومنے پھرنے کا شوقین ہوں۔ اس لیے گھومنے پھرنے پر دل کھول کر پیسہ خرچ کرتا ہوں۔

سوال: آپ کی دعائیں قبول ہوتی ہیں؟

شارق رومی: الحمد اللہ۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں نے کوئی دعا مانگی ہو اور وہ پوری نہ ہوئی ہو۔

سوال: حاضر جواب ہیں؟

شارق رومی: جی ہاں۔ مجھے الجھنا مہنگا ثابت ہوتا ہے۔

سوال: لوگوں کی طویل گفتگو آسانی سے سن لیتے ہیں؟

شارق رومی: میں بہت اچھا سامع ہوں اکثر لوگ فضول باتیں کرتے ہیں، لیکن میں ان کی ہاں میں ملاتا رہتا ہوں۔ ان کے چپ ہونے کے بعد جب میں بولنا شروع کرتا ہوں تو اسے جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔

سوال: والدین کی کون سی خوبیاں آپ میں منتقل ہوئی ہیں؟

شارق رومی: میرے والد بہت اچھے مقرر رہے ہیں، اس لیے بولنے کی صلاحیت تو میں نے اپنے والد سے لی ہے۔ جبکہ میری والدہ شاعری کرتی ہیں تو اس طرف سے بھی تھوڑا بہت ذوق منتقل ہوا ہے۔ چہرے کے حساب سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں والد پر ہوں، بعض کہتے ہیں کہ والدہ پر گیا ہوں۔ ویسے مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے والد جیسا ہوں۔


# آتش پرست

وجیہہ سحر کے کہنہ مشق قلم سے ایک اور سنسنی خیز اور دلچسپ ناول۔ ماہرین آثار قدیمہ ایک چار ہزار سال پرانی ممی دریافت کرتے ہیں۔ جسے اس انداز میں حنوط کیا گیا تھا کہ وہ آزاد ہوتے ہی زندہ ہو جائے۔ چار ہزار سال پرانی ممی کے ہنگامے، خوف و ہراس اور قتل و غارت۔ آج کی دنیا کو اس منحوس ممی سے کیسے چھٹکارا دلایا گیا، جاننے کے لیے پڑھیے...... **آتش پرست**

جسے جلد ہی کتاب گھر پر **ایکشن ایڈونچر مہم جوئی ناول** سیکشن میں پیش کیا جائے گا۔

# لوک اور پاپ گلوکار

## عدیل برکی

گلوکار عدیل برکی کا شمار نئی نسل کے مقبول اور پسندیدہ گلوکاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی یہ پسندیدگی کلاسیکی کے منفرد انداز کی وجہ سے ہے۔ ایک انٹرویو کے دوران عدیل برکی نے بتایا کہ میں پاپ، فوک، نیم کلاسیکل اور کلاسیکل گائیکی کے امتزاج کا گلوکار ہوں، میں نے موسیقی کی ان جدید وقدیم اصناف کو یکجا کر کے گلوکاری کا ایک الگ تھلگ انداز بنایا ہے یہ انداز موسیقی اور گائیکی کے حوالوں سے ہمارے کلچر اور معاشرت سے ہم آہنگ ہے۔ عدیل برکی 8 برس سے گلوکاری کر رہے ہیں۔ اس عرصہ کے دوران اندرون ملک اور بیرون ملک رچاؤ، نکھار اور فنکارانہ مہارت کے ساتھ پروگرام پیش کر کے انہوں نے بے پناہ شہرت و مقبولیت حاصل کی ہے۔ ابتداء میں وہ سکول اور کالج کی تقریبات میں گلوکاری کیا کرتے تھے۔ کالج میں گلوکار کے طور پر رول آف آنر بھی حاصل کیا۔ کئی اداروں نے بھی انہیں مختلف ایوارڈز سے نوازا۔

اُنہوں نے مزید کہا کہ میں نے موسیقی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ استاد محمد حسین خان، کالے خان، استاد حفیظ آف تلونڈی والے موسیقی کے ضمن میں میرے استاد ہیں۔ ان اساتذہ سے میں نے کلاسیکی اور نیم کلاسیکی موسیقی کے بہت سے رموز واوقاف سیکھے ہیں۔

یہ تصور غلط ہے کہ ہمارے ہاں موسیقی زوال پذیر ہے۔ یہ الیکٹرونک میڈیا کے فروغ کا دور ہے۔ پوری دنیا کی موسیقی ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ ان حالات میں اگر موسیقی کا کوئی نیا رجحان فروغ پاتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہماری اپنی موسیقی کی اصناف زوال کا شکار ہو گئی ہیں۔ ہم موسیقی کی مضبوط روایات کے وارث ہیں۔ دنیا کی کوئی موسیقی ہماری موسیقی کو متاثر نہیں کر سکتی جہاں تک غزل گائیکی کا تعلق ہے۔ غزلیات کو آج بھی ذوق وشوق سے سنا جاتا ہے۔ میں نے ایوان صدر اور دیگر اعلیٰ شخصیات کے سامنے غزلیات پیش کی ہیں۔ لوگ بڑے احترام اور ادبی روایات کو ملحوظ رکھ کر غزلیں بھی سنتے ہیں۔ لوگوں کا ذوق یہاں تک بلند ہے کہ غالب، فیض اور ذوق جیسے مشکل شعراء کے کلام کی بھی بھرپور انداز سے داد دیتے ہیں۔

موسیقی کی دنیا گروپ بندیوں کا شکار ہے جو آنے والوں کی ترقی اور فروغ میں رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے۔ نئے گلوکاروں میں یہ رجحان بھی عام ہے کہ وہ راتوں رات شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں کو چھونا چاہتے ہیں۔ گلوکاری کے لیے سُر اور لے کا شعور ادراک ضروری ہے۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ نئے آنے والوں کی اکثریت کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ گنگناہٹ کے بل بوتے پر سنگر بن جائیں۔ اس ضمن میں تعلق داریاں بھی کام آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نئے گلوکاروں کی گائیکی میں میلوڈی، تلفظ کی ادائیگی اور دوسرے پہلوؤں کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس فن کے لیے جس محنت، ریاضت اور پرخلوص جدوجہد کی ضرورت ہے۔ وہ نئے لوگوں کی اکثریت میں عنقا ہے۔ میں آدھی سے زیادہ فن کا مظاہرہ کر چکا ہوں۔ جن ملکوں میں پروگرام کیے ہیں۔ ان میں امریکہ، کینیڈا، تمام یورپ، افریقہ، کینیا، یو اے ای، برطانیہ اور دوسرے کئی ممالک شامل ہیں۔

مختلف گلوکار مختلف انداز کی گائیکی کرتے ہیں۔ رفیع کی آواز کھلی اور شفاف آواز تھی۔ کشور کمار، مکیش اور سہگل ناک، گلے اور سینے کو ملا کر

گلوکاری کرتے تھے۔ طلعت محمود ہلکی سی ارتعاش کے ساتھ گاتے تھے۔ لتا کا اپنا منفرد انداز ہے۔ وہ ہر قسم کی گلوکاری پر عبور رکھتی ہیں۔ ملکہ ترنم کی آواز میں بناوٹ نہیں تھی۔ وہ فطری گلوکارہ تھیں اور سینے اور ناک کو ملا کر گلوکاری کرتی تھیں۔ ہر وہ سنگر اپنے عہد کا بڑا گلوکار رہتا ہے۔ جس نے اپنی اور بجنل آواز میں گائیکی کی ہے۔ جن لوگوں نے دوسروں کی آواز کی کاپیاں کیں، وہ بڑے گلوکار نہیں بن سکے۔

کرشنا مورتی، انکا، انورادھا اور دوسری کئی گلوکارائیں لتا کے انداز میں گلوکاری کرتی ہیں لیکن وہ لتا کے مقام کو چھو بھی نہیں سکتیں، جہاں تک استاد نصرت فتح علی خان مرحوم کا تعلق ہے۔ ان کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ وہ لافانی اور عظیم فنکار تھے؛ جن کا فن ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ عدیل برقی اس کتاب میں شامل ہونے سے رہ جاتا اگر مجھے حکیم سلیم اختر عدیل برقی کے فنِ گائیکی اور مقبولیت کی طرف توجہ نہ دلاتے اس پر میں حکیم سلیم اختر کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔

❁❁❁


# چور بازار

بعض لوگ سیاست کا سہارا لے کر کس طرح ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، **چور بازار** پڑھ کر آپ بخوبی اندازہ لگا سکیں گے۔ جرم و سراغرسانی کی دلچسپ کہانی۔ ایک سپر مارکیٹ میں ہونے والی عجیب و غریب چوریوں کا احوال جہاں دکانوں کا ساز و سامان تالا توڑے اور نقب لگائے بغیر غائب ہو رہا تھا۔ اثر نعمانی کے تخلیق کردہ سراغرساں ندیم اختر کا کارنامہ۔
**چور بازار** کتاب گھر کے **جاسوسی ناول** سیکشن میں پڑھی جا سکتی ہیں۔

# ھیرے کے آنسو

**ہیرے کے آنسو** ایک نوجوان کی کہانی ہے، جس کے ساتھ اس کے اپنوں نے ہی ظلم کیا تھا۔ ایک دن اچانک اس کی زندگی میں ایک موڑ آگیا۔ ایک شخص نے اس کے والد کی کوئلے کی کانوں کو قیمتی قرار دیتے ہوئے ثبوت بھی فراہم کر دیا کہ وہاں ہیرے موجود ہیں۔ جھوٹ فریب لالچ اور دھوکہ دہی کے تانے بانے سے بُنی جرم و سزا کے موضوع پر ایک دلچسپ کہانی۔ اثر نعمانی کے تخلیق کردہ سراغرساں ندیم اختر کا کارنامہ۔ **ھیرے کے آنسو** کتاب گھر کے **جاسوسی ناول** سیکشن میں پڑھی جا سکتی ہیں۔

# پاپ سنگر ناصر سلمان

میوزک آہستہ آہستہ انڈسٹری کا درجہ حاصل کرتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیگر صنعتوں اور شعبوں کی طرح اس صنعت (یعنی میوزک کی دنیا) میں بھی سخت مقابلے کی فضا پیدا ہوگئی ہے۔ لاتعداد گلوکار اس مقابلہ کی دوڑ میں شامل ہیں۔ بہت سے گلوکار اس دوڑ میں آگے نکلنے کے لیے سپر سٹارز، فلمی اداکاراؤں کا سہارا لے رہے ہیں تو بہت سے غیر ملکی لوکیشنز پر مہنگے ترین ویڈیوز کا۔ گلوکاروں کے اس ہجوم میں کسی کا اپنی منفرد پہچان بنانا ایک انتہائی مشکل کام ہے۔ ایسے میں اگر کوئی ابھر کر سامنے آئے اور اپنے پہلے ہی البم سے ہر سو پہچانا جانے لگے تو اسے ہم قسمت کا دھنی ہی کہیں گے۔ ایسے ہی قسمت کے دھنی ایک گلوکار ناصر سلمان ہیں جنہیں ان کے پہلے ہی البم اور پہلے ہی ویڈیو نے مقبول گلوکاروں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ناصر سلمان کا واپڈا ویژن 2025 پر ترانہ "پاک وطن" سال کا بہترین ویڈیو قرار دیا گیا ہے۔ ماہ اگست کے دوران جشن آزادی کے موقع پر واپڈا ویژن 2025 کے قومی ترانے نے عوام میں بے حد مقبولیت حاصل کی اور اس کو بجا طور پر سال کا بہترین ویڈیو قرار دے دیا۔ ناصر سلمان کی آواز اور بے ساختہ اداکاری نے موسیقی سے وابستہ حلقوں کو چونکا دیا ہے۔

یہ انٹرویو خبریں کے سنڈے میگزین میں شائع ہوا۔ ارشد لئیق انٹرویو لینے والے تھے جو من وعن پیش خدمت ہے۔

سوال: آپ اس فیلڈ میں کیسے آئے؟ شوق کی خاطر یا حادثاتی طور پر؟

ناصر سلمان: میں اس فیلڈ میں حادثاتی طور پر ہرگز نہیں آیا بلکہ میوزک سے مجھے بچپن سے لگاؤ تھا۔ بچپن میں اپنے اس شوق کی تکمیل سکول میں ترانے پڑھ کر کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے شعبہ گلوکاری میں باقاعدہ قدم رکھا تو اپنے کیریئر کا آغاز ایک قومی ترانے سے کیا جو ٹی وی کے تمام پاکستانی چینلز سے چلا اور لوگوں میں مقبول ہوا۔ یہ ویڈیو البم واپڈا نے سپانسر کیا تھا۔

سوال: قارئین کو کچھ اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بتائیے؟

ناصر سلمان: میں لاہور میں پیدا ہوا۔ اسلامیہ ہائی سکول سے میٹرک، اسلامیہ کالج سے گریجوایشن اور پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹر کیا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ میوزک سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ سکول، کالج اور پھر یونیورسٹی میں ہونے والی تقاریب میں متعدد بار پرفارم کیا۔

سوال: کس کھیل میں زیادہ شغف رکھتے ہیں؟

ناصر سلمان: کرکٹ مجھے زیادہ پسند ہے۔ نہ صرف دیکھنے کی حد تک بلکہ کھیلنا بھی بہت پسند ہے۔ کالج لیول تک میں نے بہت کرکٹ کھیلی ہے۔ میں بہترین آل راؤنڈر ہوا کرتا تھا اگر میں گلوکاری کی طرف نہ آتا تو شاید قومی کرکٹ ٹیم کا ایک رکن ہوتا۔

سوال: آپ کا پہلا البم ریلیز ہو چکا ہے۔ اس کا کیا رسپانس ہے؟

ناصر سلمان: میرا پہلا البم "کملی ڈھول وی" اگست میں ریلیز ہوا تھا۔ خدا کا شکر ہے۔ پورے ملک میں خاص طور دیہی علاقوں میں میرا البم بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ اس کی اب تک 50 ہزار سے زائد کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ ایک بات بتاؤں میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے پہلے البم سے اتنا اچھا رسپانس ملے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں میرے والدین کی دعاؤں اور میری محنت کے

بعد خدا کا خصوصی فضل و کرم شامل ہے۔

سوال: آپ کے گیتوں کی شاعری کون کرتا ہے؟

ناصر سلمان: میں اپنے گیت خود لکھتا ہوں، جس میں میری رہنمائی میرا دوست نوید عرفان کرتا ہے۔

سوال: شاعری یا اچھی آواز۔ اچھے گلوکار کے لیے کون سی چیز زیادہ اہم ہے؟

ناصر سلمان: یہ تینوں چیزیں ضروری ہیں اور کسی بھی ایک چیز کی کمی کے بغیر گلوکار ادھورا ہے۔

سوال: آپ کون سے گیت گانا زیادہ پسند کرتے ہیں، پاپ یا فوک؟

ناصر سلمان: میں اپنے آپ پر کوئی ایک چھاپ لگوانا نہیں چاہتا، اس لیے پاپ، کلاسیکل گیتوں کے ساتھ ساتھ بھنگڑا اور غمگین گیت بھی گا رہا ہوں اور میرے پہلے البم بھی اسی طرح ہر قسم کے گیتوں سے مزین ہیں۔

سوال: مستقبل کے کیا ارادے ہیں؟

ناصر سلمان: میری البم میں گیارہ گیت شامل ہیں اگر لوگوں نے محبت کی تو ان گیارہ کے گیارہ گیتوں کے ویڈیو بنا کر پیش کروں گا۔ ابھی نیا البم تیار کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

سوال: آپ ہینڈسم ہیں، خوبصورت ہیں، فلم یا ڈرامے میں اداکاری کی آفر ہوئی تو کیا کام کرنا پسند کریں گے؟

ناصر سلمان: اداکاری کرنے کا مجھے کوئی شوق نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اداکاری اور گلوکاری دونوں مختلف شعبے ہیں۔ گلوکاری ایک فل ٹائم جاب ہے۔ اس کے ساتھ اداکاری ہو ہی نہیں سکتی ویسے بھی آج کل جیسی فلمیں بن رہی ہیں ان میں کام کرنے کا تو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

سوال: پلے بیک گلوکاری کا ارادہ رکھتے ہیں؟

ناصر سلمان: ارادہ تو ہے اگر کسی اچھے میوزک ڈائریکٹر نے گانے کی پیشکش کی تو فلم کے لیے ضرور گاؤں گا لیکن مجھے نہیں لگتا کہ مجھے کوئی میوزک ڈائریکٹر موقع دے گا کیونکہ یہاں لابی سسٹم ہے۔ اسی لیے کوئی نیا گلوکار فلمی دنیا میں سامنے نہیں آ رہا اور یہی وجہ ہے کہ ہماری فلموں کے گیت لوگوں میں مقبول نہیں ہو رہے۔

سوال: آپ اچھا گلوکار کسے کہتے ہیں؟

ناصر سلمان: وہ جو اپنی آواز کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لے۔

سوال: خواتین کی آزادی کے کس حد تک قائل ہیں؟

ناصر سلمان: شرم و حیا پر کوئی آنچ نہ آئے۔

سوال: خواب دیکھتے ہیں؟

ناصر سلمان: ہاں، مگر میں ہمیشہ ایک ہی خواب دیکھتا ہوں کہ پاکستان ایک جدید اور ترقی یافتہ ملک ہو اور تمام صوبوں کے لوگ آپس میں پیار محبت سے رہیں۔

# عالمی شہرت یافتہ
# پاکستانی گلوکارائیں

# 20 ویں صدی کی عظیم گلوکارہ

# ملکہ ترنم نور جہاں

(یہ مضمون پروفیسر اختر حسین شیخ نے ملکہ ترنم نور جہاں کی رحلت پر روزنامہ پاکستان کے ہفت روزہ میگزین ''زندگی'' کے لئے لکھا تھا، میری نظر میں نور جہاں پر اس سے جامع اور خوبصورت مضمون نہیں لکھا جا سکا۔ اس کا کریڈٹ بلاشبہ پروفیسر اختر حسین شیخ کو جاتا ہے۔ چونکہ یہ مضمون بذات مجھے بھی بہت پسند ہے اس لیے اس مضمون کو من وعن شامل کتاب کیا جا رہا ہے جو قارئین کی نذر ہے۔)

قصور میں بابا بلھے شاہؒ آسودہ خاک تھے۔ 1925ء میں اسی شہر کے ایک گانے بجانے والے گھرانے میں مدد علی نامی شخص کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی جس کے گلے میں ایک خاص وصف تھا۔ اس گلے کو سُروں کا ساگر کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس بچی کا نام اللہ وسائی رکھا گیا۔ بچی کی والدہ بذات خود علم موسیقی میں دسترس رکھتی تھی لیکن اسے خبر نہ تھی کہ جس بچی کو اس نے جنم دیا ہے وہ محمد غوث گوالیاری کے فیض یافتہ تان سین جیسے سُر ساگر کے فن کی وارث ہوگی۔ اللہ وسائی 41 دن کی ہوئی تو والدین اسے لیکر بابا بلھے شاہ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ کیا اسے محض اتفاق کہا جائے کہ مدد علی کی بیوی جب گھر سے باہر نکلنے کے قابل ہوئی تو وہ اسے لے کر سیدھا بلھے شاہ کے مزار پر حاضر ہوئی۔ مشرقی روایات کے مطابق زچہ کو عموماً چالیس یوم کے بعد کاروبار حیات میں شرکت کے قابل سمجھا جاتا ہے اور اللہ وسائی کے والدین نے پہلا کام یہ کیا کہ بچی کو لے کر بلھے شاہ کے مزار پر حاضری دی اگر اس حاضری کو محض اتفاق قرار دی دیا جائے تو پھر بے شمار اتفاقات کو تسلسل سے تسلیم کرنا پڑے گا مثلاً تان سین کا پنڈت گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود غوث گوالیاریؒ کے سایہ عاطفت میں آ جانا پھر بلھے شاہ کے مرشد شاہ عنایت قادری کا ناراض ہو جانا اور شطاری ہونے کے حوالے سے قوالی میں دلچسپی لینا اور اتفاق سے بلھے شاہ کا تان سین کی تربت پر حاضر ہونا جو اتفاق سے مزار غوث کے احاطے میں ہے پھر مدد علی کا اسی بستی میں مقیم ہونا جہاں بلھے شاہ آسودہ خاک ہیں اور اتفاق سے اپنی نومولود بچی کو لے کر مزار پر حاضر ہونا وغیرہ۔ برسبیل تذکرہ فن موسیقی کے پرانے استاد غلام محمد عرف گاما جو اس وقت عمر عزیز کے 94 ویں برس میں قدم رکھ چکے ہیں اور اس وقت قصور کے نواحی گاؤں کوٹ مراد خاں میں رہتے ہیں۔ انہوں نے بھی اللہ وسائی کو اسی روز دیکھا جب وہ 41 یوم کی عمر میں مزار بلھے شاہ پر سلام کرنے حاضر ہوئی۔ استاد گامے کا ملکہ ترنم سے تعلق بڑا پرانا اور گہرا ہے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اللہ وسائی نے یہ مقام آسانی سے حاصل کر لیا یا سرکار دربار نے اسے پلیٹ میں سجا کر پیش کر دیا تو وہ سخت غلطی پر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بچی نے شعور کی آنکھ اس ماحول میں کھولی جہاں طبلے کی تھاپ اور سُروں کی الاپ کو اوڑھنا بچھونا سمجھا جاتا تھا مگر اس کے باوجود اسے اپنے آپ کو منوانے کے لیے نشیب وفراز سے بھرپور سفر طے کرنا پڑا۔ اس بات میں البتہ کوئی شک نہیں کہ فن موسیقی کا شغف رکھنے والے جس فرد نے بھی اللہ وسائی کی آواز سنی وہ اس کا گرویدہ ہو گیا چنانچہ اس نے گفتگو کا آغاز ہی موسیقی کی زبان میں کیا۔

پنجاب میں زندہ ناچ گانے اور تھیٹروں کا عام رواج تھا اور بچی جس تھیٹر میں جاتی سامعین کا دل موہ لیتی۔ اللہ وسائی نے اوائل عمر میں برصغیر کے نامور استاد فضل حسین کی شاگردی اختیار کی جو استاد غلام محمد کے محسن ومربی اور استاد تھے۔ استاد گاما کے بقول جب ان کے استاد فضل حسین نے اللہ وسائی اور اس کی بہن عیدن کو اپنی شاگردی میں لیا تو غلام محمد سے ''گنڈا بندھوا'' دیا۔ سادہ الفاظ میں دونوں بہنوں کو اپنے شاگرد گاما کی

شاگردی میں دے دیا۔

موسیقی کے اساتذہ اس فن کو گلے اور پھیپھڑوں کی پہلوانی کا نام دیتے ہیں۔ جتنی محنت، مشقت اور ریاضت پہلوانی میں کرنی پڑتی ہے، موسیقی کا ریاض اس سے کم نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ضعیف العمری میں پہلوان لنگوٹ کھول دیتے ہیں اور اسی رسم کی اتباع میں استاد فضل حسین نے اپنے شاگرد استاد غلام محمد سے کہا" گامے پتر! اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں لہٰذا عیدن اور اللہ وسائی کو تم خود تعلیم دو۔"

لاہور میں اللہ وسائی، عیدن اور نواب بیگم تینوں ایک ہی تھیٹر میں کام کرتی تھیں اور ان کے گیتوں کی وجہ سے اس تھیٹر کا نام "پنجاب میل" پڑ گیا۔ اس زمانے میں تیز رفتار گاڑی کو میل کہا جاتا تھا۔ ایک روز استاد غلام محمد الہ وسائی کو اس دور کی نامور گلوکارہ اختری فیض آبادی کے ہاں لے گئے اور اپنی شاگردہ کے گلے کی تعریف کرنے لگے۔ ان لوگوں کی علیک سلیک اور خیر خیریت کا انداز بھی عام ڈگر سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ اختری فیض آبادی نے بچی کو کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ اللہ وسائی نے تان چھیڑی تو اختری بائی حیرت کے سمندر میں گم ہو گئی۔ ہر اچھی چیز کو اپنی ملکیت میں لینے کی خواہش کوئی آج کی اختراع نہیں۔ یہ حضرت انسان کی بڑی پرانی عادت ہے بلکہ نسل انسانی کے پہلے قتل کی وجہ بھی یہی تھی۔ اختری بائی نے استاد گامے سے کہا" یہ بچی اگر آپ میرے سپرد کر دیں تو میں اسے اپنے ساتھ بمبئی لے جاؤں گی اور اس کا مستقبل سنور جائے گا۔

"مستقبل!" استاد نے مسکرا کر کہا" اختری بائی! یہ بچی تو خود موسیقی کا مستقبل ہے۔ صرف 2 برس انتظار کریں۔ اس کے بعد یہ بچی آپ کو چھو لے گی اور آپ کے اوپر نیچے گانے کے بعد اگلی منزل کا اندازہ آپ خود لگا لیں۔" استاد کا کہا حرف بحرف سچ ثابت ہوا۔ عین دو برس بعد مہاراجہ بیکانیر اور مہاراجہ اندور کے محل میں محفل موسیقی کا آغاز ہوا۔ اللہ وسائی ابھی نور جہاں نہیں بنی تھی۔ بڑے بڑے اساتذہ فن وہاں موجود تھے۔ اللہ وسائی نے خیال کے بعد ٹھمری کا آغاز کیا تو در و دیوار جھومنے لگی۔ اختری بائی فیض آبادی بھی اتفاق سے وہاں موجود تھی۔ اللہ وسائی کے سروں کا لوچ ابھی تک فضا میں گونج رہا تھا چنانچہ کہتے ہیں کہ اختری بائی جو پکے راگوں کی شیدائی تھی، لوک گیت پر اتر آئی اور اس طرح اپنا بھرم بھاؤ قائم رکھنے میں کامیاب ہوئی۔

استاد گامے نے اللہ وسائی اور عیدن کے علاوہ ملکہ ترنم کی چچیری ہمشیرہ کی بیٹی صائمہ جہاں اور سائرہ نسیم کو بھی موسیقی کی تعلیم دی مگر وہ ملکہ ترنم سے بہت پیچھے رہ گئیں۔ عیدن کے علاوہ ملکہ ترنم کی دوسری بہن "حیدر باندی" اس فن سے وابستہ رہی۔ عیدن بائی آخری دم تک عیدن بائی رہی اور اس کی شادی مشہور فلمی شاعر تنویر نقوی سے ہوئی۔

اللہ وسائی جب پنجاب کے تھیٹروں میں دھوم مچا رہی تھی تو اسی زمانے میں سیٹھ دل سکھ کرنانی نے کلکتہ میں ایک عظیم الشان تھیٹریکل کمپنی قائم کی۔ یہ شخص راجستھان کا رہنے والا تھا۔ دبلا پتلا جسم پستہ قد، سیاہ فام رنگت مگر قابلیت، محنت اور تقدیر کی کرم نوازی سے لکشمی دیوی ایسی مہربانی ہوئی کہ اس کے گھر کی گویا لونڈی بن گئی۔ اس کی جہاز ران کمپنی بھی تھی۔ سیٹھ کرنانی نے تھیٹر کمپنی قائم کرنے کے بعد برصغیر سے فنکار اکٹھے کرنے شروع کیے۔ اس کے ہرکارے پنجاب بھی آئے۔ اللہ وسائی اور عیدن کا پنجاب سے انتخاب ہوا حالانکہ اس وقت لاہور میں ایک سے ایک بڑھ کر خوش گلو خوش انداز گلوکارائیں موجود تھیں۔ یہی سیٹھ کرنانی ہے جس نے ایک روز اللہ وسائی کا ہاتھ دیکھا۔ اسے دست شناسی سے بھی شغف تھا۔ سیٹھ نے اسی روز اعلان کر دیا کہ یہ لڑکی شہرت کے ساتویں آسمان تک پہنچے گی لہٰذا آج سے اس کا نام اللہ وسائی نہیں نور جہاں ہے۔ یہ بات مستند ہے کہ اللہ وسائی کو نور جہاں کا نام سیٹھ دل سکھ کرنانی نے دیا اور ملکہ ترنم کا لقب عوام کی عطا ہے۔ یہ کوئی سرکاری درباری خطاب نہیں۔ ملکہ ترنم کے چچا کا نام چودھری بسا تھا۔ عذرا جہاں اس کی بیٹی ہے اور صائمہ جہاں اس کی نواسی۔

1932ء میں جب 6 برس کی عمر میں اللہ وسائی اپنی بہنوں کے ہمراہ تھیٹریکل کمپنی میں آئی تو پہلی محفل کا انعقاد کورانتھ ہال کلکتہ میں ہوا۔ برصغیر کی نامور گلوکار مختار بیگم نغمہ سرا تھی اور اس کی جڑاؤ جوتی مستقبل کی ملکہ ترنم اپنی گود میں بطور احترام رکھے بیٹھی تھی۔ مختار بیگم تان اڑاتی تو اللہ وسائی

بے چین سی ہو جاتی۔ اس کی وجہ بڑی عجیب تھی جس کا اعتراف بعد میں ملکہ ترنم نے خود کیا۔ اصل میں اللہ وسائی چھلانگ لگا کر سٹیج پر پہنچ جانا چاہتی تھی تاکہ وہ تانیں خود اڑا کر سامعین سے انصاف اور داد و تحسین کی طلب گار ہو۔ واضح رہے کہ وہ زمانہ خاموش فلموں کا تھا اور فلموں کو زبان ملے ابھی صرف ایک برس ہوا تھا لہٰذا تھیٹر کا طوطی ہر طرف بول رہا تھا۔

اللہ وسائی کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع اصل میں دوسرے روز اس وقت ملا جب ماسٹر دھومی خان نے ننھی گلوکارہ کا امتحان لیا۔ بچی نے الاپ کا آغاز کیا تو دھومی خاں کے ساتھ مختار بیگم بھی حیرت کے سمندر میں ڈوب گئی۔ سُر کی ایک ایک پرت واضح، اس کا بانکپن، گہرائی کمال کی تھی۔ دھومی خان نے مختار بیگم کی طرف دیکھا تو مختار بیگم نے دلی مسرت سے کہا۔ ''خاں صاحب۔ تھیٹر کے ساتھ ساتھ موسیقی کا مستقبل بھی سنور گیا۔''

کلکتہ میں اپنا تعارف کرانے کے بعد اللہ وسائی اپنی بہنوں کے ساتھ لاہور واپس آ گئی۔ 1935ء میں جب یہ بہنیں دوبارہ کلکتہ گئیں تو ان کو کسی تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ پنجاب کے تھیٹروں میں اڑائی ہوئی تانیں لوگوں کے کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔ اللہ وسائی کے لیے یہ سفارش کافی تھی۔ لاہور کی ایک فلمی شخصیت بھی ان کے ہمراہ تھی۔ ہدایت کار ڈی مہرہ نے ''اندرا مووی ٹون'' کے نام سے فلم کمپنی قائم کر رکھی تھی اور فنکارہ کو اس سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں کیونکہ بطور ہدایت کار کے ڈی مہرہ بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ لاہور اور اندرا مووی ٹون کے تعاون سے اس پنجابی فلم کی تیاری کا معاہدہ ہوا جو بے بی نور جہاں کی فلمی زندگی کا آغاز ثابت ہونے والا تھا چنانچہ پہلی بولنے والی پنجابی فلم شیلا عرف ''پنڈ دی کڑی'' میں اللہ وسائی، عیدن اور حیدر باندی تینوں بہنوں کو شامل کر لیا گیا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ فلم سے تعلق رکھنے والے بے شمار لوگ سُر کے سمندر سے آشنا ہو چکے تھے مگر عوام الناس کو ابھی حیرت کے سمندر میں ڈوبنا تھا۔

اس زمانے میں اللہ وسائی کی دو چیزیں بڑی مشہور ہوئیں، ایک اردو زبان میں نعت تھی۔

''ہنستے ہیں ستارے یا شاہ مدینہ''

اس دور کے جو لوگ ابھی زندہ ہیں ان کو یہ نعت یاد ہو گی۔ متحدہ ہندوستان میں مذہب و ملت کا خیال جس شدت سے مسلمانوں کو ہوا کرتا تھا آج اہل پاکستان کو اس کا عشر عشیر بھی نصیب نہیں۔ بے بی نور جہاں کا دوسرا گانا وہ تھا جو آج بھی کلاسک کا درجہ رکھتا ہے۔

''لنگھ آ جا پتن چنھاں دا او یار''

اس گیت میں پنجاب کی عشقیہ داستان سوہنی مہینوال کا پس منظر پوری آب و تاب سے جلوہ فگن تھا۔ دریائے چناب یعنی چن آب کے استعارے کو جس خوبصورتی سے اس گیت میں استعمال کیا گیا ہے وہ تشریح طلب نہیں کہ اس کا حسن مجروح ہو جائے گا۔ چنھاں، راہ عشق میں حائل تمام دشواریوں کا استعارہ ہے۔ اس گیت کا سوز، سُر کی گہرائی ابھی تک راقم کے ذہن میں زندہ سلامت ہے۔ کافی عرصے تک پنجاب کی موسیقی کی محفلوں میں یہ گیت اپنا رنگ جماتا رہا۔ اللہ وسائی نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز اسی گیت سے کیا۔ کمسن معصوم گڑیا سی لڑکی کے منہ سے اس گیت نے قیامت برپا کر دی۔ شیلا عرف پنڈ دی کڑی سپر ہٹ فلم ثابت ہوئی اور اللہ وسائی کو اندرا مووی ٹون کے مستقل سٹاف میں شامل کر لیا گیا۔ گویا مدعلی کی بچی اوائل عمر میں ہی ''کماؤ پتری'' بن گئی۔

اللہ وسائی کی دو بہنوں کے علاوہ اس کے چار بھائیوں کے نام بوجوہ منظر عام پر نہ آ سکے، یہ تھے شفیع، صدیق، محمد حسین گلہ اور عنایت حسین۔ ہم ابھی ان کے ذکر سے گریز کرتے ہیں، بوقت ضرورت ان کا ذکر آ جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اندرا مووی ٹون کی ملازمت کے دوران بے بی نور جہاں نے ہیر سیال، سسی پنوں، فخر اسلام اور سپاہی وغیرہ جیسی فلموں میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اس میں سے ''ہیر سیال'' دیکھنے کا راقم کو اتفاق ہوا ہے۔ امرتسر میں غالباً یہ ''چترا ٹاکی'' یا ''ریالٹو'' سینما میں پیش کی گئی تھی۔

کتنی عجیب بات ہے کہ پنجاب میں، پنجابی فلموں کا باوا آدم، پنجاب کا باشندہ نہیں تھا۔ یہ شخص فلمی دنیا کا بے تاج بادشاہ دل سکھ ایم پنچولی

ہے اور مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ مسٹر پنچولی کے خاندان کا تعلق مہاتما گاندھی کے مریدوں سے تھا اور مرید بھی ایسے جو اندھی تقلید کے قائل ہوتے ہیں یعنی ماننے کے لیے جاننا ضروری خیال نہیں کرتے، چنانچہ ماتا پتا نے پنچولی کو مہاتما گاندھی کے آدرشوں پر چلنے کے لیے ''دکشنا مورتی آشرم'' بھونگر میں داخل کرا دیا لیکن ماتا پتا کی خواہشات کا کیا ہے، فیصلے تو کہیں اور ہوتے ہیں۔1930ء میں ''کراچی پکچر ہاؤس'' اس شہر کا بہترین سینما تھا۔ پنچولی کا بھائی اس سینما کا منیجر تھا۔ادھر پنچولی دکشنا مورتی آشرم سے حاصل کرنے والی ہر شے حاصل کر چکا تھا چنانچہ وہ اپنے بھائی کے پاس کراچی آ گیا اور فلمی دنیا سے متعارف ہوا۔اس تعارف کی تکمیل بھی بڑے عجیب انداز میں ہوئی۔ واضح رہے کہ یہ دور خاموش فلموں کا تھا۔آشرم اور فلمی دنیا کی زندگی میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی تاہم سندھ میں زبردست سیلاب آیا تو پنچولی کی جانے کون سی رگ پھڑکی۔سکھر روہڑی کا سارا علاقہ سیلاب کی نذر ہو چکا تھا۔پنچولی اپنا موی کیمرہ لے کر سیلاب زدہ علاقے میں پہنچ گیا اور جان ہتھیلی پر رکھ کر شوریدہ سر لہروں، بپھری موجوں زیر آب مکانوں کی عکس بندی کرنے لگا۔کبھی کسی ٹیلے پر کھڑا ہے اور کبھی کسی درخت سے لٹکا ہے۔بہر حال یہ سیلاب کی مکمل داستان فلما کر جب پنچولی کراچی پہنچا تو اس کی یہ ڈاکومنٹری فلم اس دور میں مبلغ 60ہزار روپے میں فروخت ہوئی۔

بھگت سنگھ والا واقعہ نیا نیا منظر عام پر آیا تھا۔انڈین کانگریس نے اس مقدمے سے سرد مہری بلکہ سوتیلی ماؤں جیسا سلوک کیا تھا لہٰذا جب کانگریس کا سالانہ جلسہ ہوا تو اس کے لیڈروں کا سیاہ جھنڈیوں سے استقبال کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔پنچولی کے سر پر یہ تاریخی واقعات فلمانے کی دھن سوار ہو گئی۔مہاتما گاندھی اور سردار پٹیل کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی کہ پنچولی اپنے کیمرے کے ساتھ جا دھمکا اور واقعات کو فلم بند کرنے لگا۔گاندھی جی تو خیر زم خو قسم کی شخصیت تھے لیکن سردار پٹیل اس ''فلمی حرکت'' کو دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا اور ''ٹھہر جا تری دم میں نمدا باندھوں'' قسم کے کلمات کہتا ہوا پنچولی کی طرف لپکا۔پنچولی نے غصے میں کھولتے ہوئے سردار پٹیل کو بھی عکس بند کیا اور منظر سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔اس انوکھی نوعیت کی ڈاکومنٹری فلم نے پنچولی کی زندگی کا راستہ متعین کر دیا۔ اس فلم سے پنچولی کو دس ہزار کا فائدہ ہوا۔گویا فلمی دنیا سونے کی کان تھی لہٰذا مسٹر پنچولی نے اپنی فلمیں تیار کرنے کا تہیہ کر لیا۔یہ خالص کاروباری فیصلہ تھا۔1931ء میں برصغیر کی پہلی بولتی فلم ''عالم آراء'' بن کر لوگوں کو حیرت میں گم کر چکی تھی۔ کرداروں کو عام انسانوں کی طرح ہنستے بولتے لڑتے جھگڑتے ،نفرت کرتے دیکھ کر دنیا دنگ رہ گئی تھی بہر حال اسی زمانے میں پنچولی خیبر میل پر بیٹھ کر لاہور آ گیا جہاں ایک اجنبی دنیا اس کی منتظر تھی۔برسبیل تذکرہ فلم عالم اراء کی نمائش لاہور میکلوڈ روڈ کے کیپٹل سینما میں ہوئی۔فلم عالم آراء کا پس منظر خالص اسلامی تھا۔مسٹر پنچولی اس وقت فلموں کا تقسیم کار تھا لیکن 1938ء میں اس نے پنچولی آرٹ پکچرز اور سٹوڈیو قائم کر کے اپنی پہلی فلم گل بکاؤلی کا اعلان کر دیا۔بے بی نور جہاں کلکتے سے لاہور آ چکی تھی۔پنچولی آرٹ پکچرز میں کیسے شامل ہوئی۔اس کے متعلق لوگوں نے بے پر کی بھی اڑائی ہیں لیکن اصل قصہ کچھ اور ہے۔ہم بیان کر چکے ہیں کہ نور جہاں نے یہ مقام بڑی جدوجہد کے بعد حاصل کیا۔وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ مسٹر پنچولی نے بے بی نور جہاں کو کلکتے سے بلا کر فلم گل بکاؤلی میں شامل کر لیا۔ہم ان کو جھٹلانے کی جرات نہیں کرتے لیکن اصل واقعہ کچھ اس طرح ہے۔

فلم گل بکاؤلی کا اعلان ہو چکا ہے۔ایک روز جب دل سکھ پنچولی اپنے سٹوڈیو میں آیا تو ایک بچی ایک خاتون کے ساتھ کھڑی تھی۔اس نے آنے والے شخص کا راستہ روک لیا اور بغیر کسی تمہید کے رسیلی آواز میں گانا شروع کر دیا۔بچی بے بی نور جہاں تھی اور آنے والا شخص سیٹھ دل سکھ پنچولی تھا۔وہ بچی کو اپنے ساتھ لے کر دفتر میں آ گیا اور اپنے میوزک ڈائریکٹر غلام حیدر کو بچی کا گانا سنوایا۔غلام حیدر اس قدر سحر زدہ ہوا کہ داد و تحسین دینا تک بھول گیا۔بچی نے گانا ختم کیا تو وہ پنچولی آرٹ کی ملازمت میں آ چکی تھی۔ماسٹر غلام حیدر کے میوزک ڈائریکٹر بننے کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔

سیٹھ پنچولی ایک مرتبہ دانت کے درد میں مبتلا ہوا تو ایک دندان ساز نے اسے چند منٹ آرام سے بیٹھے رہنے کو کہا تاکہ دوا کی تاثیر سے درد میں افاقہ ہو جائے۔دونوں کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔دندان ساز اپنے ہارمونیم پر کچھ گنگنانے لگا تو سیٹھ کے کان کھڑے ہو گئے۔سروں میں اتنا گداز تھا کہ مریض اپنے دانت اور درد کو بھول کر سروں کے سمندر میں کھو گیا۔دوسرے دن سیٹھ نے دندان ساز کو اپنے سٹوڈیو میں طلب کیا تو دندان

سازا اپنے مریض کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔اس طرح پنچولی آرٹ پکچرز کو وہ میوزک ڈائریکٹر میسر آ گیا جس کی بنائی ہوئی دھنوں نے برصغیر میں تہلکہ مچا دیا۔مختصراً عرض ہے کہ نور جہاں، لتا منگیشکر اور شمشاد بیگم کو صحیح معنوں میں ماسٹر غلام حیدر کی دریافت قرار دیا جاتا ہے۔آدم بر سر مطلب گل بکاؤلی ریلیز ہوئی تو عوام نے جس چیز کو سب سے زیادہ پسند کیا۔وہ بے بی نور جہاں کے گانے تھے۔اس دور میں "شالا جوانیاں مانیں، آ کھانہ موڑیں پی لے پی لے" کی دھوم مچ گئی۔یہی وہ گیت ہے جسے لے کر بے بی نور جہاں ایک بار پھر بابا بلھے شاہ کے مزار پر حاضر ہوئی۔مزار بلھے شاہ پر عرس کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔برصغیر کے نامور قوال اور گائیک وہاں موجود تھے۔استاد بڑے غلام علی خان کی موجودگی میں بے بی نور جہاں نے نغمہ سرائی کی خواہش کا اظہار کیا۔اس کے پاس سب سے بڑی سفارش یہی تھی کہ اس نے ہوش سنبھالنے سے پیشتر ہی بابا سے فیض حاصل کر لیا تھا اور جب استاد بڑے غلام علی خاں کو پتہ چلا کہ اللہ وسائی نے 41 دن کی عمر میں مزار پر حاضری تھی تو انہوں نے کمسن گلوکارہ کو سننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔بے بی نے فن کے اساتذہ کے روبرو کھڑے ہو کر گل بکاؤلی کا گیت شروع کیا۔"شالا جوانیاں مانے، آ کھانہ موڑیں پی لے پی لے۔"

گیت سنتے ہی اساتذہ نے تسلیم کر لیا کہ یہ آواز چیزے دیگر است،اور واقعی اس میں تان سین کی سروں کا پرتو ہے۔ایک دوسرے گانے کے سوز نے بھی دنیا کو تڑپا کر رکھ دیا۔

پنجرے دے وچ قید جوانی

اس زمانے میں سٹیج اور فلم دونوں کی مقبول ترین ہستی نور جہاں تھی حالانکہ ماسٹر غلام حیدر اس سے پیشتر ایک اور فلم "سورگ کی سیڑھی" میں اپنے میوزک کا جادو جگا چکے تھے مگر "وہ بات کہاں" "مولوی مدن کی سی" اب بے بی نور جہاں کو کسی سفارش یا سہارے کی ضرورت نہ تھی چنانچہ اسے "یملا جٹ" میں کاسٹ کیا گیا۔اس موضوع پر بعد میں بھی بیشمار فلمیں بنیں لیکن یملا جٹ تو یملا جٹ تھی۔اس فلم میں بے بی نور جہاں کے سارے نغمے ہٹ ہو گئے۔

"بابل میں بلہاری وے چل پنڈ نوں چلیے"

سارے پنجاب میں گراموفونوں پر اسی نغمے کی دھوم تھی۔گلی کوچوں میں بچے بچے کی زبان پر یہی گیت تھا۔ایک اور نغمہ

"کچیاں وے کلیاں تو ڑنہ موڑ مرجائیں وے مالی"

اس کے علاوہ ""سفنے وچ سفنا تکیا"" بھی اپنی مثال آپ تھا۔1942ء میں بے بی نور جہاں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہی تھی جہاں بے بی کا لفظ اس کے نام کا سابقہ تھا۔یہ فلم تھی "چودھری" جس میں مرکزی رول غلام محمد نے ادا کیا تھا۔جن لوگوں کو اس فلم کا یہ گانا یاد ہے۔

بس بس وے ڈھولنا کیہ تیرے نال بولنا
سولاں نوں اے سارنا تے موتیاں نوں رولنا
بس بس وے ڈھولنا

فن شاعری،موسیقی اور گداز میں یہ نغمہ بے مثال ولاجواب ثابت ہوا۔راقم کے ذہن میں جب یہ نغمہ گونجتا ہے تو سماعت میں کانسی کی گھنٹیاں بج اٹھتی ہیں۔چودھری فلم کے بعد نور جہاں کے نام سے بے بی کا سابقہ دور ختم ہو گیا اور اس نے عہد شباب میں قدم رکھا۔اس میں شک نہیں کہ وہ حسن وجمال کی مالک نہیں تھی صرف قبول صورت کہا جائے تو غالباً زیادہ مناسب ہو گا لیکن جو حسن خدا نے اسے وافر مقدار میں عطا کر رکھا تھا اس کے آگے حسن کی دیویاں پانی بھرتی تھیں۔اس پر شباب بھی ٹوٹ کر آیا اور ایک خاص نگاہ کے لیے تو اس کا جسمانی حسن بھی لاجواب و بے مثال تھا۔بہر حال فلم خاندان میں نور جہاں نے پہلی بار بطور ہیروئن اداکاری کے جوہر دکھائے اور اس کی ڈائریکشن کے فرائض مردانہ وجاہت کے نمونے شوکت حسین رضوی نے ادا کیے۔

پاکستان ورچوئل لائبریری کی پیشکش

برصغیر میں کسی مسلمان کا علم و ادب اور فن کی دنیا میں شہرت حال کرنا یا سرفہرست قرار دیا جانا واقعی ایک کارنامہ ہوا کرتا تھا۔ آج بھی بھارت میں صورتحال کوئی قابل ذکر حد تک نہیں بدلی۔ مسلمانوں کے لیے سخت مقابلے اور تعصب کے ماحول کی وجہ سے ترقی کی منازل طے کرنا بڑا دشوار تھا۔ اس کے باوجود سید شوکت حسین رضوی اپنی محنت، ریاضت، ذہانت اور قسمت کی خاص کرم نوازی کی بناء پر نامور شخصیت بن کر ابھرا۔ اس نے ایشیا کا بہترین فلم سٹوڈیو بنایا۔ تدوین میں اپنے جوہر دکھائے اور بطور ہدایتکار یادگار فلمیں بنائیں۔ بھارت میں اعظم گڑھ (یو پی) کا علاقہ فنی اعتبار سے بڑا مردم خیز ثابت ہوا ہے۔ اعظم گڑھ کے قریب مرزا پور کے ایک سید گھرانے میں سید شوکت حسین رضوی نے جنم لیا۔ اس شخص کا ذہن پیدائشی طور پر میکانیات کی طرف مائل تھا۔ بچپن میں اسے مکینیکل انجینئر بننے کا جنون تھا مگر طبیعت پڑھنے لکھنے کی طرف مائل نہیں تھی۔ اپنے ذوق کی تسکین وہ گھریلو گھڑیوں کو جوڑ توڑ کر کرلیا کرتا تھا۔ پرزوں کی ساخت پر غور کرنے کے بعد ان کی کارکردگی کو سمجھتا اور پرزے پرزے گھڑی کو جوڑ کر دم لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ سعادت حسن منٹو اور دیگر قلم کاروں نے اسے گھڑی ساز یا گھڑی ساز ذہن کا مالک قرار دیا۔ بعض لوگ اپنی ذہنی کدورت کی تسکین کے لیے بھی اسے گھڑی ساز کہنے لگے۔ سکول کے زمانے میں سائنس کی ابتدائی کتابیں پڑھ کر اس نے بیٹری سیل وغیرہ بنانے کی صلاحیت بھی پیدا کر لی تھی۔ الغرض گھر والے اپنے ''سپوت'' کے کارناموں سے اس قدر بیزار ہوئے کہ تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں وہ مایوس ہو گئے۔ اس زمانے میں شوکت کے ایک عزیز کی کلکتے کے فلمی حلقوں سے شناسائی تھی ویسے بھی ہر بھگوڑا فلمی دنیا کی چمک دمک سے مرعوب ہو کر اسی کا ہو جانے کو زندگی کی معراج سمجھا کرتا تھا۔ اس طرح شوکت اعظم گڑھ کے مرزا پور سے جا کلکتے پہنچا اور میڈن تھیٹر کے انگریز الیکٹریکل انجینئر مسٹر کروٹ سے اس کی شناسائی ہوگئی۔ مسٹر کروٹ نے اس کی افتادہ طبع کے مطابق ایڈیٹنگ کی طرف متوجہ ہونے کا مشورہ دیا حالانکہ شوکت حسین کا قد بت مردانہ وجاہت، فلمی ہیرو کے لیے نہایت موزوں تھی۔ میڈن تھیٹر ہی میں شوکت رضوی کا تعارف مرزا میر جیسے فلم ایڈیٹر سے ہوا۔ ادھر دیوانگی کی حد تک سیکھنے کا شوق تھا۔ ادھر سکھانے والا ہنرمندی کا سمندر تھا لہٰذا بات بن گئی۔

سیٹھ پنچولی نے فلم گل بکاؤلی کی ایڈیٹنگ کے دوران شوکت رضوی کی صلاحیتوں کو کما حقہ پہچانا۔ گل بکاؤلی میں ایک سین ایسا تھا کہ شہزادہ پھول کی تلاش میں سانپوں کے دیس میں جا پہنچتا ہے۔ مقامی وسائل ایسے نہیں تھے کہ سانپوں کی بانبیوں اور لڑائیوں کے مناظر دکھائے جاتے۔ اسی زمانے میں ہالی وڈ کی ایک فلم میں سانپ اور نیولے کی طویل لڑائی پیش کی گئی تھی۔ شوکت نے لڑائی کا یہ منظر اتنی ذہانت سے فلم گل بکاؤلی میں داخل کر دیا کہ لوگ عش عش کر اٹھے۔ جدید ساز وسامان کی عدم موجودگی میں شہزادے کو ابر پاروں کے اوپر محو پرواز دکھایا گیا۔ رفتہ رفتہ اس کی ہدایتکارانہ صلاحیتیں بھی سامنے آ گئیں۔ سیٹھ پنچولی خاموشی سے شوکت رضوی کے کارنامے دیکھ رہا تھا لہٰذا جب فلم ''خاندان'' کا اعلان ہوا تو سیٹھ پنچولی نے شوکت کو کلکتے سے لاہور بلا کر اس فلم کی ہدایتکاری کے فرائض انہیں سونپ دیئے۔ وہی ''خاندان'' جس میں نور جہاں بطور ہیروئن جلوہ گر ہو رہی تھی اور اسی قربت نے دونوں دلوں میں ایک دوسرے کی محبت کا چراغ روشن کر دیا اور یہ تعلق شادی پر منتج ہوا لیکن شادی کے بندھن کی تفصیل کافی دلچسپ ہے جس پر سعادت حسن منٹو نے نور جہاں سرور جاں میں اپنے انداز میں کافی روشنی ڈالی ہے۔

پہلی بات یہ کہ ہر کماؤ سپتری کی طرح نور جہاں کے خاندان والے بھی اس شادی کے سخت خلاف تھے۔ سیٹھ پنچولی نے شوکت کو بطور خاص کلکتہ سے بلوا کر اپنی فلم کی ڈائریکشن کے فرائض سونپے تھے۔ ایک روز ''خاندان'' کی شوٹنگ جب زوروں پر تھی، تو ہیروئن اور ڈائریکٹر دونوں غائب ہو گئے۔ سیٹھ کے کارندوں نے سارا لاہور چھان مارا مگر پریم پنچھیوں کا کہیں پتہ نہ چلا۔

اصل میں ہوا یہ تھا کہ نور جہاں کی والدہ نے شوکت حسین رضوی کے خلاف پولیس میں رپورٹ لکھوا دی تھی کہ شوکت نے نابالغ لڑکی کو ورغلا کر اغوا کر لیا ہے، لہٰذا اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے۔ اپنی پولیس اغوا کے مقدمات میں بڑی دلچسپی لیتی ہے اگر اس میں لڑکی ملوث ہو تو بڑی فعال ثابت ہوتی ہے۔ یہ رویہ بڑا پرانا ہے۔ آج کل ہمارے ہاں تو خیر ہر مثبت قدر کا جنازہ ہی نکل چکا ہے لہٰذا صورتحال تبصرے کے قابل


www.pdfbooksfree.pk

نہیں رہی۔ بہر حال شام کو سیٹھ پنچولی کو خبر ملی کہ مغویہ کو برآمد کر کے حوالات میں بند کر دیا گیا ہے۔ پنچولی کو اپنی فلم عزیز تھی۔ ادھر ہیروئن کی ماں اس شادی کے خلاف تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ڈائریکٹر کی موجودگی میں اس کی بیٹی سیٹ پر نہیں آئے گی۔ مقدمے بازی بھی ہوئی تاہم فریقین کو ٹھنڈا کیا گیا۔ ڈائریکٹر کو احتیاط اور فریق مخالف کو محتاط رہنے کی ہدایت کی گئی اور کسی نہ کسی طرح فلم خاندان نے تکمیل کے مراحل طے کیے۔ فلم کے مکمل ہوتے ہی سیٹھ دل سکھ پنچولی نے دونوں پریم پنچھیوں کو اپنے ادارے سے فارغ کر دیا لیکن وہ فلم خاندان کی خوبیوں کو اپنے ادارے سے فارغ کیسے کرتا جبکہ اس فلم نے اس کی تجوری بھرنا شروع کر دی تھی۔ فلم خاندان نے برصغیر میں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ یہی وہ فلم ہے جس کی نمائش جب کلکتہ میں ہوئی تو فلم بینوں کے مابین ٹکٹ حاصل کرنے کے جھگڑے میں ایک شخص قتل ہوا۔ "خاندان" کا سکرپٹ سید امتیاز علی تاج نے لکھا۔ نور جہاں کے مقابلے میں ہیرو کا کردار پران نے ادا کیا تھا۔ اس فلم میں نور جہاں کی آواز کے لوگ دیوانے ہو گئے۔

تو کون سی بدلی میں میرے چاند ہے آجا

تارے ہیں میرے زخم جگر ان میں سما جا

اس کے علاوہ درج ذیل گانے کا چرچا بھی گلی گلی ہوا۔

میرے لیے جہان میں چین ہے نہ قرار ہے

پیسے کمانے والوں کو کسی کی ذاتی زندگی سے غرض نہیں ہوتی اور فلمی دنیا تو ویسے بھی سیکنڈلز وغیرہ میں رسوائی کی حد تک بدنام ہے۔ "خاندان" کی کامیابی کو دیکھ کر بمبئی کے فلم ساز ایم ویاس نے دولت کی مہک کو دور سے سونگھ لیا۔ بعض لوگ محض اپنی ذہانت کے بل بوتے پر ایسے ایسے منصوبوں کی تکمیل کر لیتے ہیں جن کے لیے دولت کے انبار درکار ہوتے ہیں حالانکہ ان کی جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں ہوتی۔ اصل میں دولت کمانے کے لیے منفرد قسم کی ذہانت درکار ہوتی ہے۔ جس سے فلم ساز ایم ویاس مالا مال تھا۔ اس شخص نے اپنی زندگی کا سفر طبلچی کی حیثیت سے شروع کیا۔ یہاں سے ترقی کرتا کرتا "کیمرہ قلی" کے عہدے پر فائز ہوا اور یہاں سے چھلانگ لگا کر کیمرہ مین بن گیا اور ترقی کے زینے طے کرتے کرتے فلموں کا ہدایتکار بنا پھر ایک ہی زقند بھر کر فلمیں پروڈیوس کرنے لگا۔ دبلا پتلا مگر پھرتیلا انسان تھا اور محنتی ایسا کہ تھکن کے نام سے نا آشنا تھا لیکن فلم بنانے کے لیے دولت دوسروں کی استعمال کرنے میں اس کا ثانی نہیں تھا۔ وہ نور جہاں اور شوکت رضوی کے تعلقات اور مقدمے بازی وغیرہ سے بخوبی واقف تھا لیکن وہ دونوں کو ایک فلم میں یکجا کر کے دولت کمانے سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا یہاں اس نے ذہانت سے کام لیا۔ پہلے اس نے خاندان کی شہرت یافتہ نور جہاں سے معاہدہ کیا۔ فلم کا تا حال نام و نشان تک نہیں تھا لیکن وہ خاندان کی ہیروئن سے معاہدے کو جیب میں رکھے شوکت حسین رضوی کے پاس پہنچا اور اس سے بھی اپنی فلم کے لیے معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت تک نور جہاں یا شوکت کو خبر نہیں تھی کہ وہ دونوں ایک بار پھر اکٹھے ہونے والے ہیں۔

ایم ویاس کے پاس جب دو "دھانسو" قسم کے معاہدے آ گئے تو کسی بھی سرمایہ کار کو راضی کیا جا سکتا تھا۔ ایم ویاس نے اپنی فلم کمپنی کا نام "سن رائز" رکھا ہوا تھا اور فلمی حلقوں میں بہر حال وہ سیٹھ ویاس کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا۔ نور جہاں اور شوکت سے معاہدے دکھا کر ایم ویاس کو مطلوبہ سرمایہ فراہم ہو گیا تو فلم نوکر کا اعلان کر دیا گیا۔ کہانی کے لیے سعادت حسن منٹو کا انتخاب ہوا۔ پہلے وہ سین فلمائے گئے جن میں نور جہاں کا کردار نہیں تھا لیکن آخر ہیروئن کو ایک نہ ایک روز تو سیٹ پر آنا ہی تھا۔ اس فلم کا میوزک ڈائریکٹر رفیق غزنوی تھا۔

ڈائریکٹر اور ہیروئن جب آمنے سامنے ہوتے تو شاید بدمزگی پیدا ہو جاتی مگر یہاں سعادت حسن منٹو نے دونوں کے ملاپ میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ شوکت حسین رضوی اور منٹو کے دوستانہ مراسم تھے اور وہ بمبئی میں اڈلفی چیمبرز کلیئر روڈ پر رہائش پذیر تھا۔ نور جہاں کی تربیت کا دعویدار نظامی تھا جو کیڈل روڈ پر رہتا تھا۔ اسی زمانے میں نظامی، ممتاز شانتی کو بھی دولت کمانے کے ہتھکنڈے سکھایا کرتا تھا اور اب وہ نور جہاں کا سرپرست

بننا چاہتا تھا۔ سعادت حسن منٹو نے خود بھی اعتراف کیا ہے کہ نور جہاں اور شوکت حسین رضوی کے مدھر ملن میں اس نے ''کٹنیوں کا کردار'' ادا کیا بہر حال جب وہ شوکت سے ملتا تو اسے یقین دلاتا کہ نور جہاں کے دل میں اب بھی شوکت کی محبت کا چراغ روشن ہے اور جب نور جہاں سے ملتا تو اسی قسم کی یقین دہانیاں اسے کراتا کہ شوکت اس کی خاطر آہیں بھرتا رہتا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار تھے مگر بھرم بھاؤ اور انا کی خاطر اس کا اعتراف نہیں کرتے تھے۔ حالات نے کیا رخ اختیار کیے۔ اس کی تفصیل میں جانا مناسب نہیں لیکن ہوا یہ کہ فلم نوکر تو بری طرح فلاپ ہوگئی مگر نور جہاں اور شوکت حسین رضوی رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ایم وی اس کی دوسری فلم دہائی بھی جس میں نور جہاں نے کام کیا، فلاپ ہوئی۔

1944ء میں نور جہاں نے دو فلموں میں کام کیا۔ دوست اور لال حویلی فلم دوست کا ایک گانا مشہور ہوا۔

بدنام محبت کون کرے
اور عشق کو رسوا کون کرے

فلم خاندان کے بعد نور جہاں نے مسلسل تین برس کوئی چونکا دینے والا کارنامہ سرانجام نہ دیا۔ ہر فنکار کی زندگی میں ایسا دور ضرور آتا ہے مگر نور جہاں کو خدا نے اس نعمت سے نواز رکھا تھا جو زیادہ دیر تک کارناموں کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

دوسرا سال طلوع ہوا تو نور جہاں کی مسلسل چار فلمیں ایک سے ایک بڑھ کر اچھی ثابت ہوئیں۔ پہلی فلم ''بڑی ماں'' تھی۔ دوسری ''بھائی جان'' جس میں ہیرو کا کردار کرن دیوان نے ادا کیا لیکن موسیقی کے اعتبار سے نور جہاں کی فلم ''گاؤں کی گوری'' یادگار ثابت ہوئی۔ اس فلم کے تمام گانے عوام میں مقبول ہوئے۔ ایک گانا تو آج بھی سماعتوں میں رس گھولتا ہے۔

کس طرح بھولے گا دل ان کا خیال آیا ہوا
جا نہیں سکتا کہیں شیشے میں بال آیا ہوا

نور جہاں کے مقابلے میں اس فلم کے ہیرو نذیر تھے۔ 1945ء کے آخر میں وہ فلم ریلیز ہوئی جس نے نور جہاں کو اپنے ہم عصروں میں ممتاز مقام عطا کیا۔ اس فلم کا نام ہے ''زینت'' اس فلم میں جو قوالی پیش کی گئی وہ قابل تقلید ثابت ہوئی گویا وہ رجحان ساز قوالی تھی۔

آہیں نہ بھریں شکوے نہ کیے
کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا
ہم دل کو پکڑ کر بیٹھ گئے
جب تیرا کسی نے نام لیا

غمگین و دل گداز گیتوں میں زینت کے دو عدد نغموں نے مقبولیت کا ریکارڈ قائم کیا۔

بلبلو مت رو یہاں آنسو بہانا ہے منع

اور دوسرا گیت تھا:

آندھیاں غم کی یوں چلیں
باغ اجڑ کے رہ گیا

یہ اگرچہ مسلم سوشل فلم تھی مگر برصغیر کے ہر شخص نے اسے یکساں پسند کیا۔ میر صاحب کی موسیقی اور شوکت رضوی کی ہدایتکاری دونوں نے مل کر خوب رنگ جمایا۔ ابھی لوگ فلم زینت کی موسیقی سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ نئے سال میں ملکہ ترنم نے فلم بینوں کو لازوال تحفہ پیش کیا یعنی

''انمول گھڑی'' یہ واقعی انمول تحفہ تھا۔ کہانی تو آج بھی وہی عشق و محبت کی مثلث کے گرد گھوم رہی تھی۔ محبت کسی سے شادی کسی اور سے مگر اس فلم کے گیتوں کو شہرت دوام حاصل ہوئی۔

☆ آجا میری برباد محبت کے سہارے

☆ کیا مل گیا بھگوان تجھے دل کو دکھا کے

☆ اڑن کھٹولے پہ اڑ جاؤں

☆ تیرے ہاتھ نہ آؤں

لیکن راقم کے نزدیک فلم انمول گھڑی کا درج ذیل گیت سدا بہار ہے:

آواز دے کہاں ہے، دنیا میری جواں ہے

آباد میرے دل میں امید کا جہاں ہے

انمول گھڑی کے بعد نور جہاں کی دو درمیانے درجے کی فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''دل اور بھولی''

تقسیم برصغیر سے پہلے ملکہ ترنم نے 1947ء میں اپنی ذاتی فلم جگنو پیش کی جس میں ''جوار بھاٹا'' اور دو مزید فلموں کے ناکام ہیرو دلیپ کمار کو مرکزی کردار دیا گیا۔ اس فلم میں محمد رفیع بطور گلوکار منظر پر آئے۔ یہ فلم قیام پاکستان کے بعد ریلیز ہوئی اور اس کی کامیابی پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ مزید لکھنا غیر ضروری سا لگتا ہے۔ رفیع بحیثیت گلوکار اور دلیپ کمار بحیثیت اداکار دونوں کی شہرت دوام کا آغاز اسی فلم سے ہوا۔ برصغیر پاک و ہند کا وہ کون سا فلم بین ہے جو اس گانے کو نہیں گنگناتا۔

☆ یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے

☆ ہمیں تو شام غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی

☆ جہاں وہ ہیں وہیں اے چاند لے جا چاندنی اپنی

☆ آج کی رات ساز دل پر درد نہ چھیڑ

1942ء سے 1947ء تک نور جہاں نے کل 24 فلموں میں کام کیا اور اس کے بعد میاں بیوی دونوں پاکستان آ گئے، کیونکہ پاکستان معرض وجود میں آ چکا تھا۔

فلم جگنو کی موسیقی نے تہلکہ مچایا اور دلیپ کمار کو بھی شہرت کے بام عروج پر پہنچا دیا۔ دلیپ کمار کا نور جہاں کے مقابل فلم جگنو میں جلوہ گر ہونا بھی ایک مجبوری کا نتیجہ تھا۔ شوکت رضوی اس دور کے سپر سٹار موتی لال کو بطور ہیرو پیش کرنا چاہتا تھا مگر اس نے ایک تو معاوضہ بہت زیادہ طلب کیا، دوسرے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اس کا نام فلم کی کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے۔ شوکت رضوی کا گویا ناریل چٹخ گیا اور اس نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ڈائریکٹر جسے چاہے فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا سکتا ہے، ایک ناکام ہیرو کو سائن کیا اور بعد ازاں جو کچھ ہوا وہ دنیا نے دیکھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ فلم جگنو جو نور جہاں کی ذاتی کاوش تھی لوگوں کے لیے تو سونے کی کان ثابت ہوئی مگر شوکت خاندان کو اس کی نمائش کی اجازت بھی نہ ملی۔

شوکت اور نور جہاں جب پاکستان آ گئے تو انہوں نے حالات کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ پہلے وہ کراچی میں آئے تھے جہاں گارڈن ایسٹ کے علاقے میں ان کو ایک مکان الاٹ ہوا لیکن وہاں کا ماحول فلمسازی کے لیے سازگار نہ تھا، لہٰذا میاں بیوی نے لاہور آنے کا فیصلہ کیا ویسے بھی لاہور بلھے شاہ کی نگری قصور سے زیادہ دور نہیں تھا اور غیر مرئی سی کشش نور جہاں کو اس سرزمین کی طرف مسلسل کھینچ رہی تھی۔

لاہور میں ان کو ڈیوس روڈ پر شیش محل نامی کوٹھی الاٹ ہوئی اور انہوں نے فلم سٹوڈیو بنانے کی طرف توجہ دی۔ شوکت کا ذہن بنیادی طور پر

کل پرزوں کو درست رکھنے والا تھا چنانچہ شاہ نور سٹوڈیو کی ہر شے کیل کانٹے سے لے کر بڑی سے بڑی مشین تک اس کی ہنرمندی کا منہ بولتا ثبوت بن گیا۔

1951ء میں نور جہاں کی پہلی فلم چن وے مارکیٹ میں آئی چونکہ یہ فلم 4 سال کی طویل خاموشی کے بعد منظر عام پر آ رہی تھی، لہٰذا عوام کے جوش وخروش اور اس کے پرستاروں کا شوق دیدنی تھا۔ پنجاب کے مختلف سینماؤں کے علاوہ لاہور کے ریجنٹ سینما میں اس کی نمائش ہوئی۔ اس کی موسیقی فیروز نظامی نے دی تھی جو اہل پنجاب کے مزاج کے عین مطابق تھی لہٰذا بے حد پسند کی گئی۔ اس فلم کی خاص بات یہ ہے کہ نور جہاں نے ہدایتکاری کے فرائض بھی انجام دیے۔ اس لحاظ سے ملکہ ترنم کو پاکستان کی پہلی ہدایت کارہ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوگیا۔ اس فلم کے مقبول ترین گیتوں میں سرفہرست تو یہ نغمہ تھا:

ترے مکھڑے تے کالا کالا تل وے
میرا کڈھ کے لے گیا دل وے
وے منڈیا سیالکوٹیا

دوسرے نمبر پر یہ گیت تھا:

چن دیا ٹوٹیا وے دلاں دیا کھوٹیا

لیکن راقم کو ذاتی طور پر درج ذیل نغمہ بے حد پسند تھا:

چنگا بنایا ای سانوں کھڈونا
آپے بناؤناں تے آپے مٹاؤنا

اس فلم میں سنتوش کمار اور جہانگیر اے خان، ملکہ ترنم کے مقابل تھے۔ فلم کے اختتام پر سنتوش کمار کی موت کا منظر ابھی تک تماشائیوں کے ذہن میں موجود ہوگا۔

1952ء میں نور جہاں کی وہ فلم مارکیٹ میں آ گئی جس کی موسیقی نے ہندوستان کے موسیقاروں کو بھی چونکا کر رکھ دیا۔ یہ فلم تھی ''دوپٹہ'' سبطین فضلی کی اس فلم کے گانے گداز دلوں میں اتر جانے والے تھے اور ملکہ ترنم کی آواز کا نکھار جادو اثر تھا۔ آج نصف صدی گزر جانے کے باوجود بھی ان رسیلے گیتوں کی دلکشی میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ ایک چنچل نغمہ تھا:

میں بن پتنگ اڑ جاؤں
تیرے ہاتھ نہ آؤں

غم واندوہ میں ڈوبی ہوئی آواز میں یہ گانا کسے یاد نہیں:

تم زندگی کو غم کا فسانہ بنا گئے
آنکھوں میں انتظار کی دنیا بسا گئے

اسی انداز کے ایک اور گیت میں ملکہ ترنم نے طوفان بپا کر کے اہل دل کو تڑپا دیا:

سب جگ سوئے ہم جاگیں
تاروں سے کریں باتیں چاندنی راتیں

لیکن ہمارے نزدیک ہمیشہ زندہ رہنے والا نغمہ یہ تھا:

جگر کی آگ میں اس دل کو جلتا دیکھتے جاؤ

لٹی جاتی ہے ارمانوں کی دنیا دیکھتے جاؤ

ان نغموں کی تازگی نصف صدی گزر جانے کے بعد آج بھی ویسی کی ویسی ہے۔1953ء میں ملکہ ترنم کی ایک اچھی فلم گلنار ناکام ہوئی۔ اس کی موسیقی غلام حیدر نے دی تھی۔ یہ فلم اگرچہ اچھا بزنس نہ کر سکی مگر نور جہاں کے گائے ہوئے نغمے کم تر درجے کے نہیں تھے مثلاً:

☆ بچپن کی یادگارو

میں تم کو ڈھونڈتی ہوں

تم بھی مجھے پکارو

☆ لو چل دیے وہ ہم کو تسلی دیے بغیر

اک چاند چھپ گیا ہے اجالا کیے بغیر

فلم گلنار کا ایک نغمہ پکے راگ میں تھا جو خواص کے لیے تحفہ خاص کا مقام رکھتا ہے۔ علم موسیقی سے شغف رکھنے والوں نے اسے بے حد پسند کیا:

سکھی ری ناہیں آئے سجنوا مور

فلم گلنار کی تیاری کے دوران میں ملکہ ترنم اور شوکت رضوی کے درمیان ان بن ہوگئی۔ کرکٹر نذر محمد اس مثلث کا تیسرا زاویہ تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ میاں بیوی الگ الگ رہنے لگے۔ اصغر، اکبر دو بیٹے اور ایک بچی ظل ہما بھی تھی لیکن دلوں کے معاملات بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ گلنار کی شوٹنگ کے دوران میں جب میاں بیوی الگ الگ رہ رہے تھے تو شوکت رضوی بے حد پریشان تھا۔ گلنار کی ہیروئن نور جہاں تھی مگر شوکت رضوی نے اس کا سٹوڈیو میں داخلہ ممنوع کر رکھا تھا۔ تمام کارکن سہمے سہمے سے رہتے تھے۔ نور جہاں ان دنوں فلم ساز میاں احسان کے گھر مقیم تھی۔ میاں احسان اور مصنف وہدایتکار امتیاز علی تاج کی مساعی جمیلہ سے شوکت اس بات پر راضی ہو گئے کہ نور جہاں سیٹ پر آئے اور اپنا کردار ادا کرنے کے بعد سٹوڈیو سے واپس چلی جایا کرے۔ اس سے پہلے شوکت رضوی سیٹ پر اکثر آ جایا کرتے تھے لیکن جب سے نور جہاں کی آمد شروع ہوئی۔ ناراض میاں نے وہاں آنا چھوڑ دیا لیکن رفتہ رفتہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر شوکت صاحب حیلے بہانے سے وہاں آنے لگے۔ محرم راز حضرات کے بقول شوکت صاحب ان دنوں ساری ساری رات ادھر ادھر ٹہل کر گزار دیا کرتے تھے۔ کافی رات گئے ملکہ ترنم لان میں بچھے قالین پر لیٹی تھی اور شوکت صاحب حیلے بہانے سے لان کے گرد منڈلا رہے تھے۔ آخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر لان میں چلے گئے اور دھیمے لہجے میں کہنے لگے۔ "یہاں اس حالت میں کیا کر رہی ہو؟"

میاں بیوی میں کیا گفتگو ہوئی؟ اس پر تبصرہ حماقت کے زمرے میں آئے گا تاہم دونوں میں صلح ہوگئی اور اس رات ملکہ ترنم جہاں احسان صاحب کے ساتھ جانے کے بجائے شوکت صاحب کے ساتھ اپنے گھر چلی گئی۔ یہ علیحدگی کا آغاز تھا۔ شیشے میں بال آ جائے تو اس کا جانا ممکن نہیں ہوتا۔ اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی اور نوبت طلاق تک جا پہنچی لیکن یہ بعد کی بات ہے۔

1956ء میں ملکہ ترنم کی دو فلمیں نمائش کے لیے پیش کی گئیں۔ "لخت جگر اور حمیدہ" جی اے چشتی کی موسیقی میں نور جہاں کے گیت مسحور کن ثابت ہوئے لیکن اسی سال وہ فلم منظر عام پر آئی جس میں خورشید انور کے فن اور ملکہ ترنم کی آواز نے مل کر میلہ لوٹ لیا۔ یہ فلم تھی "انتظار" ان گیتوں کی دھنیں برصغیر کی فضاؤں میں گونجنے لگیں۔

☆ جس دن سے پیا دل لے گئے

دکھ دے گئے

☆ چاند ہنسے دنیا بسے روئے میرا پیار رے

☆ او جانے والے رے ٹھہرو ذرا رک جاؤ

لوٹ آؤ

☆ آ گئے گھر آ گئے، بلم پردیسی سجن پردیسی

☆ آ بھی جا دیکھ آ کر ذرا

مجھ پر گزری ہے کیا

تیرے پیار میں

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے کسی وصف سے بطور خاص نوازا ہوتا ہے، بعض اوقات وہ اس کی کما حقہ قدر نہیں کرتے۔ سب جانتے ہیں کہ شراب اور تلخ و ترش اشیاء گلے کی دشمن ہوتی ہیں۔ کے ایل سہگل سوز و گداز سے بھرپور آواز کا بادشاہ تھا مگر شراب نوشی میں حد اعتدال سے گزر جایا کرتا تھا۔ اس ام الخبائث کا اس نے خفیہ نام بھی رکھا ہوا تھا اور گیت ریکارڈ کرانے سے پیشتر شراب ضرور پیتا تھا۔ کسی نے اسے یقین دلا رکھا تھا کہ شراب سے اس کی آواز میں نکھار آ جاتا تھا حالانکہ یہ در قطعی اس کے اپنے تجربے سے غلط ثابت ہوگئی تھی۔ اسی طرح ملکہ ترنم ریکارڈنگ سے پیشتر پاؤ پاؤ بھر اچار کھایا کرتی تھی اور اس پر ستم یہ کہ ٹھنڈا یخ پانی بھی پی لیتی تھی۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ ترش اور ٹھنڈی اشیاء گلے کے نکھار کے لیے سود مند ہوتی ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان اشیاء سے آواز میں نکھار کا کیا تعلق ہے۔

انتظار کے بعد دوسرے برس نور جہاں کی فلم نوراں مارکیٹ میں آئی جو بری طرح ناکام ہوگئی۔ عام خیال یہی ہے کہ گھریلو ناچاقیاں اس کی شہرت کو متاثر کرنے لگی تھیں تاہم 1958ء میں چھومنتر اور انارکلی میں ایک بار پھر ملکہ ترنم نے اپنا آپ منوالیا۔ فلم انارکلی کا موضوع تو نیا ہرگز نہیں تھا۔ پاک و ہند میں اسے بار بار فلمایا جا چکا تھا اور امید ہے کہ آئندہ بھی فلمایا جاتا رہے گا مگر اس فلم کی موسیقی اتنی مسحور کن تھی کہ بس سننے سے تعلق رکھتی ہے۔

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

والی بات ہوگئی۔ ذرا سماعت پر زور دیں تو آپ کو یاد آ جائے گا۔ مثلاً:

☆ صدا ہوں اپنے پیار کی

جہاں سے بے نیاز ہوں

کسی پہ جو نہ کھل سکے

وہ زندگی کا راز ہوں

☆ باوری چکوری کرے چندا سے پیار

☆ کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں

☆ ہزاروں ہیں شکوے میں کیا کیا بتاؤں

☆ سوتے ہیں ارمان میرا دل روتا ہے

قسمت کا دستور نرالا ہوتا ہے

غرض ہر نغمہ ایک سے ایک بڑھ کر تھا۔ ہمارے خیال میں یہ فلم محض نور جہاں کے گیتوں کی وجہ سے کامیاب ہوئی اور یاد آیا اس فلم کی موسیقی رشید عطرے اور ماسٹر عنایت حسین دونوں کی مشترکہ کاوش تھی۔

ملکہ ترنم تقریباً 40 برس کی عمر کے باوجود دو تین فلموں میں جلوہ گر ہوئی حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن اس کا کیا علاج کہ ڈھلتی عمر کو رسیلی آواز نے سہارا دے رکھا تھا۔ ایک فلم "پردیسن" بری طرح پٹ گئی مگر "نیند" اور "کوئل" کے گیتوں نے ملکہ ترنم کی "عمر رفتہ کو آواز" دینے کا فریضہ انجام دیا۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں وہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی ماں بن چکی تھی۔ "نیند" کا یہ نغمہ یادگار ثابت ہوا۔

تیرے در پہ صنم چلے آئے

تو نہ آیا تو ہم چلے آئے

اس کی دھن رشید عطرے نے بنائی تھی۔ فلم "کوئل" کے موسیقار پڑھے لکھے، فن موسیقی کی آبرو خواجہ خورشید انور تھے اور انہوں نے ثابت کر دیا کہ چنگاریوں کو شعلوں کا روپ کیسے دیا جاتا ہے۔

ساگر روئے لہریں شور مچائیں

یاد پیا کی آئے نیناں بھر آئیں

لیکن جس نغمے نے تان سین کی یاد تازہ کر دی وہ یہ تھا:

دل کا دیا جلایا میں نے

تجھ کو کہیں نہ پایا

ان کے علاوہ یہ نغمہ بھی بڑا مقبول ہوا:

رم جھم رم جھم پڑے پھوار

تیرا میرا نت کا پیار

بحیثیت اداکارہ نور جہاں کی آخری فلم مرزا غالب تھی جس کی نمائش 1961ء میں ہوئی۔ فلم سازوں کی حماقت ملاحظہ ہو کہ لالہ سدھیر جس پر مار دھاڑ سے بھرپور فلموں کی چھاپ لگ چکی تھی اسے مرزا اسداللہ خان غالب کے کردار میں پیش کیا گیا۔ اس کردار کا حشر حسب توقع بہت برا ہوا۔

اسی دوران نور جہاں اور شوکت حسین رضوی کی راہیں جدا ہو گئیں اور یہ جدائی طلاق کی صورت میں دائمی تھی۔ ادھر ملکہ ترنم نے اعلان کر دیا کہ آئندہ وہ بطور گلوکارہ کام کرے گی اگرچہ یہ فیصلہ کافی دیر بعد کیا گیا تاہم دیر آید درست آمد کے مصداق نور جہاں کے حقیقی خیر خواہوں نے اسے بے حد پسند کیا۔

1961ء سے 1998ء تک نور جہاں نے فلم انڈسٹری کو ایسے ایسے گیت عطا کیے جو ہمیشہ یاد رہیں گے۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں ملکہ ترنم نے اپنے قومی گیتوں سے عوام اور فوجی جوانوں کا حوصلہ بلند کیا۔ یہ وقت کا تقاضا بھی تھا۔ یہ نغمے نئی نسل کو بھی یاد ہیں۔

☆ اے وطن کے سجیلے جوانو!

میرے نغمے تمہارے لیے ہیں

☆ رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو

ان نغمات کی افادیت اپنی جگہ مگر جو گیت نور جہاں نے پنجابی میں گائے۔ان کا واقعی جواب نہیں، مثلاً:

ایہہ پتر ہٹاں تے نہیں وکدے
توں لبھدی پھریں ادھار کڑے

ہمارے نزدیک صرف یہی ایک نغمہ ملکہ ترنم کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔صاحبان ذوق اور اہل دل حضرات کو اس نغمے نے تڑپا کے رکھ دیا۔اس کے علاوہ لہو گرمانے والے دو نغمے بڑے مشہور ہوئے۔

☆ میرا ماہی چھیل چھبیلا
کرنیل نی جرنیل نی

☆ میرا سوہنا شہر قصور نی

اس نغمے کا پس منظر گنڈا سنگھ والا محاذ تھا۔اس کے علاوہ اس نغمے میں دل کی رغبت اور روح کا میلان بھی شامل تھا جس کی وجہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ملکہ ترنم کا ایک کارنامہ ایسا بھی ہے جسے قلمکاروں نے یکسر نظر انداز کر رکھا ہے کیونکہ اس کا ذکر ہماری نظروں سے نہیں گزرا۔

نگار ایوارڈ کی فہرست میں گلوکاری کو 1959ء میں شامل کیا گیا۔تنویر نقوی کا لکھا ہوا فلم کوئل کا نغمہ" دل کا دیا جلایا" فضاؤں میں گونج رہا تھا لہٰذا پہلا نگار ایوارڈ ملکہ ترنم کو دیا گیا۔1966ء میں دوسری بار نور جہاں کو یہ ایوارڈ فلم آگ کا دریا کے ایک نغمے پر دیا گیا جسے جوش ملیح آبادی نے اپنے خاص رنگ میں تحریر کیا تھا۔

ہوا میں موتی برس رہے ہیں

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم نگار انعامات کی تفصیل پیش کر دیں۔

## 1967ء

چلو اچھا ہوا تم بھول گئے
ایک بھول ہی تھا میرا پیار

اسے فیاض ہاشمی نے فلم "لاکھوں میں ایک" کے لیے تحریر کیا تھا۔

## 1969ء

لے آئی پھر کہاں پر قسمت ہمیں پھر کہاں سے
یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے

اسے شیون رضوی نے فلم سالگرہ کے لیے لکھا تھا۔

## 1971ء

چٹھی ذرا سیاں جی کے نام لکھ دے
حال میرے دل کا تمام لکھ دے

اسے تنویر نقوی نے فلم "دوستی" کے لیے تحریر کیا تھا۔1981ء،1990ء،1991ء اور 1992ء میں بھی ملکہ ترنم کو خصوصی نگار ایوارڈ دیئے گئے۔1961ء میں ملکہ ترنم نے شوکت حسین رضوی سے طلاق لے کر ابھرتے ہوئے اداکار، خوبصورت ہیرو اعجاز درانی سے شادی کر لی۔ شازیہ، ثانیہ اور حنا اعجاز درانی کی بیٹیاں ہیں۔آخر یہ شادی بھی ناکام ثابت ہوئی اور دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔پاک و ہند کے ماحول میں کسی فنکار کی

نجی زندگی کا اس کی شہرت و مقبولیت پر اثر ضرور پڑتا ہے۔ یہ مغربی ماحول تو ہے نہیں جہاں الزبتھ ٹیلر جیسی اداکارہ شادیوں طلاقوں کو عادت ثانی بنانے کے لیے بھی مقبولیت کے بلند مقام پر بدستور فائز رہتی ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو ملکہ ترنم کی مقبولیت کو بعض حلقوں میں نقصان بھی پہنچا لیکن جہاں تک فن موسیقی کا تعلق ہے اس میں لب کشائی کی کسی کو جرات نہ ہوسکی۔ لتا منگیشکر جیسی گلوکارہ جس کے فن کو برتر تسلیم کرتے ہوئے سر نیاز خم کرے، اس کی عظمت کو مجروح کون کرسکتا ہے۔ فلم مرزا غالب کے بعد ملکہ ترنم نے پلے بیک فلمی موسیقی کو اپنا لیا اس کے بعد بھی اس نے اپنے پرستاروں کو مایوس نہیں کیا۔ نور جہاں نے جتنے فلمی و غیر فلمی گیت گائے۔ ان کا فرداً فرداً تذکرہ تو ممکن نہیں حالانکہ ریکارڈ کی خاطر کسی قلم کار کو یہ جرات مندانہ اقدام کر کے ان کو یکجا ضرور کر دینا چاہیے تاہم چند مشہور مقبول نغمات کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ تان سین نے اگر فن سے درباروں کی رونق دوبالا کی تو ملکہ ترنم نے عوام و خواص کے دلوں کی دنیا کو فتح کیا۔ سیاسی اور مفاد پرست لوگ شہنشاہوں کو بڑے بڑے خطابات سے نوازتے رہے ہیں مگر ان خطابات کی عمر مختصر ثابت ہوتی رہی ہے جیسے ہندوؤں نے مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کو "مہابلی" (بڑے کس بل والا) کہہ کر پکارا۔ اس میں چونکہ سیاسی مصلحت کار فرما تھی لہٰذا یہ خطاب تاریخ کی کتابوں تک محدود رہا۔ اس کے برعکس عوام نے اللہ وسائی عرف نور جہاں کو ملکہ ترنم کا خطاب دیا اور اس خطاب کا یہ عالم ہے کہ صرف ملکہ ترنم کہہ دینے سے ہر شخص اس ہستی خطاب کا سے واقف ہو جاتا ہے جس کی طرف کہنے والے نے اشارہ کیا ہے۔ وہ نغمات جو وقت کی قید سے آزاد ہو کر فضاؤں میں گونجتے رہیں گے ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

چلو اچھا ہوا تم بھول گئے

ایک بھول ہی تھا میرا پیار

ہوسا جتا......

یہ گیت فلم "لاکھوں میں ایک" کے لیے گایا گیا۔

تیری خاطر جل رہے ہیں کب سے پروانے

پنجابی نغموں میں فلم "ہیر رانجھا" کے سارے نغمے سپر ہٹ ثابت ہوئے اور اسی فلم میں نور جہاں نے ہیر وارث کے بول اس انداز میں ادا کیے کہ آج تک تشنگی کا احساس باقی ہے۔

اول حمد خدا او ذکر کیجیے

عشق کیتا سو جگ دا مول میاں

اس فلم کا دوسرا یادگار نغمہ یہ تھا:

سن ونجلی دی مٹھڑی تان وے

میں تاں ہو ہوگئی قربان وے

اس کے علاوہ ایک اور گیت ناقابل فراموش ثابت ہوا:

چن ماہی آ تیرا راہ پئی تکنی آں

فلم "سلطان" میں ملکہ ترنم کے اس نغمے نے میلہ لوٹ لیا:

دلدار صدقے لکھ وار صدقے

اسی طرح فلم انسان اور آدمی کا یہ نغمہ یادگار ثابت ہوا:

تو جہاں کہیں بھی جائے

میرا پیار یاد رکھنا

فلم امراؤ جان ادا نے اسی موضوع پر بننے والی بھارتی فلم کو مات کیا تو اس کی ایک وجہ ملکہ ترنم کا ترنم تھا اور خصوصاً یہ نغمہ:

جو بچا تھا وہ لٹانے کے لیے آئے ہیں

فلم موسیقار کا ایک نغمہ نور جہاں نے اس انداز میں گایا جیسے تاریخی حقیقت بیان کی جا رہی ہو:

گائے گی دنیا گیت مرے

کیا یہ حقیقت نہیں کہ نور جہاں کے گائے ہوئے گیت (اگرچہ مفہوم کچھ اور تھا) بے شمار گلوکاروں نے گا کر نور جہاں جیسا رنگ جمانے کی کوشش کی اور کتنی گلوکارائیں محض اس نقالی کی وجہ سے مقبول ہوئیں اور اب بھی ہو رہی ہیں۔ اسی فلم کے دو اور نغمے بے حد پسند کیے گئے۔

☆ یاد کروں تجھے شام سویرے

☆ تم "جگ" "جگ" جیو مہاراج رے

ہم توری نگریا میں آئے

گانے والے یا گانے والیاں ایسی "درفطنیاں" چھوڑتی ہی رہتی ہیں مگر ملکہ ترنم نے بھول کر بھی ایسا نہیں کیا۔

تان سین کے سروں کی وارث، بلھے شاہ کے وسیلے سے سُر تال کا فیض حاصل کرنے والی اللہ وسائی جتنا طویل سفر طے کرنے کے بعد مقام "نور جہاں" پر فائز ہوئی۔ اس کی تفصیل پیش کی جا چکی ہے۔ اس داستان ہوشربا کا اختتام 23 دسمبر 1999ء بروز ہفتہ بعد از دوپہر کراچی میں ہوا۔ 4 برس کی طویل علالت کے دوران ملکہ ترنم نے بیرون ملک سے بھی علاج کروایا مگر چراغ کی لو رفتہ رفتہ مدھم ہوتی چلی گئی۔ شوکت حسین رضوی سے پہلی شادی کا ثمر دو بیٹے اور ایک بیٹی ظل ہما پیدا ہوئی۔ دوسری شادی اعجاز درانی سے ہوئی تھی جس کے نتیجے میں 3 بیٹیاں تولد ہوئیں۔ ہفتے کے روز جب ملکہ ترنم کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو انہوں نے کہا "میرا آخری وقت آ گیا ہے اور میرے قریب فقط ایک بیٹی ہے۔"

60 برس تک موسیقی کی دنیا پر راج کرنے کے بعد 74 برس کی عمر میں فیصل جان کی آخری بغاوت کے بعد ملکہ ترنم کو کراچی سٹی ساؤتھ ہسپتال لے جایا گیا مگر یہ سفر طے نہ ہو سکا اور دوران سفر ہی موسیقی کی دنیا ویران ہو گئی۔ دلیپ کمار نے ایک بار کہا تھا کہ دنیا کے پاس ایک چاند اور ایک سورج ہے مگر ہمارے پاس صرف ایک نور جہاں ہے اور گزشتہ ہفتے اس نور کی لاٹ بھی بجھ گئی۔ نماز جنازہ اسی شب کو سلطان مسجد کراچی میں ادا کی گئی اور ان کے داماد حسن سردار کی رہائش کے قریب ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کے قبرستان میں ان کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

دھول اڑ کر بھی زمیں سے اور جائے گی کہاں

واپسی پر ختم ہوگا یہ سفر مٹی کا ہے

رہے نام اللہ کا......

# سحر انگیز گلوکارہ

## زبیدہ خانم

اگر نور جہاں اور لتا کو پلاٹینم وائس کہا جا سکتا ہے تو زبیدہ خانم بلاشبہ گولڈن وائس ضرور ہے، جس کے گائے ہوئے سحر انگیز نغمات آج بھی مسحور کر دیتے ہیں۔ زبیدہ خانم کا اپنا ایک مخصوص اسلوب تھا جس کے گیتوں میں فوک رنگ نمایاں ہوتا تھا۔ ہماری فلمی صنعت کے ابتدائی دور میں پہلے منور سلطانہ ہی ایک پلے بیک سنگر خاتون تھی کیونکہ اس دور میں ملکہ ترنم نور جہاں صرف اسی فلم میں گایا کرتی تھی جس میں وہ خود کام کرتی تھی۔ پچاس کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں کوثر پروین اور زبیدہ خانم فلمی سنگیت کے افق پر نمودار ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے زبیدہ خانم فلمی سنگیت پر راج کرنے لگی۔ امرتسر میں پیدا ہونے والی زبیدہ خانم کا خاندان قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے لاہور آ گیا۔ زبیدہ خانم کا سنگیت کے کسی روایتی گھرانے سے تعلق نہ تھا۔

فلمی دنیا میں زبیدہ خانم کی پہچان، شہرت اور مقبولیت کا آغاز ہدایت کار نذیر مرحوم کی ایک پنجابی فلم ''شہری بابو'' سے ہوا جس میں پہلی بار سنتوش کمار اور سورن لتا مرکزی رومانوی کرداروں میں پیش ہوئے تھے۔ اس فلم میں طفیل ہوشیار پوری کے نغمات کو موسیقار رشید عطرے نے بے حد حسین و دلنواز دھنوں سے سجایا۔ ان گیتوں کو نئی گلوکارہ (زبیدہ خانم) نے انتہائی عمدگی اور خوش اسلوبی سے گایا۔ ''شہری بابو'' تو عظیم کامیابی سے ہمکنار ہوئی لیکن اس فلم نے راتوں رات زبیدہ خانم کو مقبولیت اور شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ یہی وہ فلم تھی جس میں پہلی بار مختصر سے کردار میں عنایت حسین بھٹی مرحوم بھی پردہ سکرین پر نمودار ہوئے تھے۔ ان کی آواز میں گایا ہوا گانا ان پر ہی فلمایا گیا تھا۔ اس کے بول تھے ''بھاگاں والیو نام جپو مولا نام'' فلم کے خوبصورت اور دلکش نغمات نے تہلکہ مچا دیا اور گلی گلی ان کی گونج سنائی دینے لگی۔

زبیدہ خانم کے گائے ہوئے گیت ''اک منڈے دی چیز گواچی پلکے چیتا آوے گا''، ''گلاں سن کے ماہی وے نال میریاں دوپٹہ بے ایمان ہو گیا نی چندرا شیطان ہو گیا'' اور پھر سب سے بڑھ کر ''راتاں میریاں بنا کے رباہنیریاں نصیباں والے تارے ڈب گئے'' بے حد مقبول و معروف ہوئے۔ ہدایتکار ایم اے رشید کی بطور ہدایتکار پہلی فلم ''پاٹے خان'' میں ٹائٹل رول ظریف مرحوم نے انتہائی عمدگی اور کامیابی سے ادا کیا تھا۔ اس فلم میں ظریف نے نور جہاں کے ساتھ ایک انتہائی مقبول گیت بھی گایا تھا ''برے نصیب میرے ویری ہویا پیار میرا'' اس فلم کے مرکزی رومانوی کرداروں میں ملکہ ترنم نور جہاں کے ساتھ اسلم پرویز مرحوم تھے جن کی بطور ہیرو یہ پہلی فلم تھی۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ فلم میں ظریف (پاٹے خان) کی محبوبہ کا کردار ادا کرنے والی خوبصورت گول گول سی آنکھوں اور دلکش مسکراہٹ والی لڑکی زبیدہ خانم تھی۔

ہدایتکار ایم ایس ڈار کی مشہور فلم ''دلا بھٹی'' میں بھی زبیدہ خانم نے صبیحہ کی سہیلی کا کردار ادا کیا تھا۔ مسرت نذیر کی بطور ہیروئن پہلی پنجابی فلم ''پتن'' جس کے ہدایتکار لقمان اور موسیقار جی اے چشتی تھے، اس میں گائے ہوئے زبیدہ خانم کے گیت ''ساڈا سجرا پیار کوے بار بار کہتے ہوئے قرار بھل جائیں ناں''، ''چھڈ جاویں نہ چناں باں پھڑ کے'' اور ''رب نے کرایا ساڈا پتناں تے میل اوئے'' بہت مقبول ہوئے تھے۔ ہدایتکار انور کمال پاشا مرحوم کی یادگار اور نغمہ بار فلم ''چن ماہی'' میں ایک بار پھر موسیقار رشید عطرے اور زبیدہ خانم کے سنگم نے لازوال گیتوں کو جنم دیا۔ ان خوبصورت نغموں میں ''نی چھپیے سجناں دی اے''، ''بندے چاندی دے سونے دی تھ لے کے''، ''ساڈے انگ انگ وچ پیار نے پینگاں پائیاں نے'' اور ''پھیر لیاں چن ماہی اکھیاں ڈب گئے آس دے تارے'' شامل ہیں۔ یہ اپنے وقت کے حسین و سحر انگیز مقبول نغمات تھے۔ اپنے نغمات کے باعث یہ

فلم گولڈن جوبلی ہٹ ثابت ہوئی۔

انور کمال پاشا کی ایک کاسٹیوم فلم "سرفروش" میں رشید عطرے اور زبیدہ خانم جیسے دو عظیم فنکار پھر یکجا ہوئے۔ زبیدہ خانم نے اپنی آواز کا جادو جگاتے ہوئے یہ نغمات گائے "تیری الفت میں صنم ہم نے بہت درد سہے"، "اے چاندان سے جا کر میرا سلام کہنا" اور مینا شوری پر فلمایا جانے والا فلم کا سپر ہٹ نغمہ "میرا نشانہ دیکھے زمانہ" زبیدہ خانم کی فنی صلاحیتوں اور عظمتوں کی روشن دلیل بن گیا۔

1957ء میں فلمساز، شاعر سیف الدین سیف کی سپر ہٹ فلم "سات لاکھ" جس کے ہدایت کار جعفر ملک تھے۔ اس میں رشید عطرے کی موسیقی اور زبیدہ خانم کی دلکش آواز نے اپنے دور کا یہ حسین ترین اور انتہائی مقبول عام نغمہ بھی تخلیق کیا جو پہاڑی راگ میں گایا گیا تھا۔ "آئے موسم رنگیلے سہانے جیا نہیں مانے تو چھٹی لے کے آجا بالما" یہ نغمہ فلم میں رقص کرتی ہوئی نیلو پر فلمایا گیا تھا اور اس گانے کی مقبولیت نے ایکسٹرا نیلو کو راتوں رات ہیروئن بنا دیا۔ فلم "سات لاکھ" میں ہی زبیدہ خانم کا یہ نغمہ "گھونگھٹ اٹھالوں کہ گھونگھٹ نکالوں" بھی بے حد عمدہ اور دلنواز تھا۔

ہدایتکار اقبال یوسف کی پہلی فلم "رات کے راہی" کا یہ نغمہ بھی بڑا مقبول ہوا "اے بادلوں کے راہی" ہدایتکار آغا حسینی مرحوم کی پہلی فلم "سولہ آنے" میں زبیدہ خانم کا یہ نغمہ اپنے دور کا انتہائی مقبول اور عمدہ ترین نغمہ تھا "روتے ہیں چھم چھم نین اجڑ گیا چین میں نے دیکھ لیا تیرا پیار" ہدایتکار لقمان مرحوم کی ایک نیم تاریخی فلم "ایاز" میں محفل میلاد کے موقع پر موسیقار خورشید انور نے ایک نعتیہ کلام "صلو علیہ وآلہ" پیش کیا جسے زبیدہ خانم نے اپنی دلکش آواز سے امر بنا دیا۔ آج وہی نعت ہماری محافل میلاد اور دیگر مذہبی تقریبات کی ضرورت بن چکی ہے۔ شاعری اور آواز نے اسے باوقار اور مقدس بنا دیا ہے۔

زبیدہ خانم اپنے فنی کیریئر کے عروج پر تھی کہ اس نے ایک ماہر عکاس فلمساز و ہدایتکار ریاض بخاری سے شادی کر کے فلمی دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے کنارہ کشی کر لی اور مکمل گھریلو خاتون کا رول ادا کیا۔ فلمی دنیا سے علیحدہ ہونے کے بعد وہ کبھی کسی فلمی تقریب میں بھی شریک نہ ہوئیں۔ یہ وہ دور تھا جب گلوکارہ نسیم بیگم بھی فلمی دنیا میں داخل ہو چکی تھیں اور ملکہ ترنم نور جہاں بھی مکمل طور پر پلے بیک سنگر بن چکی تھیں۔ ریاض بخاری ہدایتکار وعکاس جعفر بخاری مرحوم کے حقیقی چھوٹے بھائی ہیں۔ اب تو زبیدہ خانم کے لیے بیٹے فیصل بخاری کا شمار بھی ذہین اور ہونہار لوگوں میں ہوتا ہے۔

1999ء میں ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں زبیدہ خانم تشریف لائی تھیں اور انہوں نے میزبان شہناز شیخ کے اصرار پر اپنے چند پرانے اور دلفریب نغمات سنائے تھے۔ انہوں نے فلم "ایاز" کا نعتیہ کلام بھی سنایا۔ 1959ء میں بننے والی سیف الدین سیف کی فلم "کرتار سنگھ" جس نے بھارت میں بھی زبردست بزنس کیا تھا۔ اس فلم کا مرکزی کردار علاؤ الدین نے ادا کیا۔ یہ فلم یقینی طور پر پاکستان کی کلاسیک فلموں میں شمار کی جائے گی۔ اس فلم میں بھی زبیدہ خانم کے گائے ہوئے نغمے "گوری گوری چاندنی دی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاں نیں" اور "ماہی چنی دیاں ریشمی تنداں"، "ریشم دالا چا لک وے"، "تیرے در تے آ کے بجاں وے"، "جوڑے والی بانہہ نہ مروڑ"، "ولا ٹھہر جا یار وا نظارہ لین دے" (فلم مکھڑا میں صبیحہ خانم پر پکچرائز ہوا) "ڈورے کھیچ کے نہ کجلا پائیے"، "جیوے ڈھولا او میرا جیوے ڈھولا"، "میرا دل چناں کچ دا کھڈاؤنا"، "چاہ ساڈے دل دا دل وچ رہ گیا"، "بابل دا ویہڑا چھڈ کے" اور بے شمار ایسے سحر انگیز نغمات ہیں جو زبیدہ خانم کی فنکارانہ عظمتوں کی یادگار ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر زبیدہ خانم آج کے الیکٹرانک میڈیا کے دور میں ہوتیں تو ان کی مقبولیت کا گراف کسی بھی بڑے سے بڑے فنکار سے کم نہ ہوتا۔ ان کے گائے نغمات آج بھی بھارت میں ری مکس کر کے گائے جا رہے ہیں جو ان کی فنی مہارت کا ثبوت ہیں۔

اس وقت سب سے اچھی خبر یہ ہے کہ زبیدہ خانم جو ماضی میں ہر دل عزیز گلوکارہ کی حیثیت سے فن کی بلندیوں پر ناز کرتی رہی ایک بار پھر اُنہوں نے گائیکی اور فن کی دنیا میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جس کا موسیقی کے شائقین خیر مقدم کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ زبیدہ خانم پہلے کی طرح موسیقی کی دنیا میں اپنی آواز، فن گائیکی سے اپنا وجود منواتی رہیں گی۔

# انتہائی کم عمری میں شہرت کی بلندیوں کو چھونے والی
# پہلی پاپ گلوکارہ نازیہ حسن

(ارشد لئیق کا یہ مضمون خبریں سنڈے میگزین میں شائع ہوا جو ان کی برسی پر لکھا گیا پیشِ خدمت ہے۔)

کالے بالوں اور براؤن آنکھوں والی گلوکارہ نازیہ حسن نے انتہائی مختصر عرصے میں موسیقی کی دنیا میں جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی وہ بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے۔ نازیہ نے نہ صرف پاکستان بلکہ بھارت میں بھی پاپ میوزک کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

نازیہ حسن 3 اپریل 1963ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں اور لندن میں تعلیم مکمل کی۔ نازیہ پولیٹیکل سائنس میں گریجوایشن اور بار ایٹ لاء کرنے کے بعد اقوام متحدہ کے ایک ادارے میں سیاسی تجزیہ نگار کے عہدے پر فائز تھیں۔ نازیہ حسن انتہائی قابل اور ذہین خاتون تھیں۔ تعلیم کا میدان ہو شعبہ گلوکاری یا اقوام متحدہ کی نوکری نازیہ نے ہر جگہ خود کو منوایا۔ جب تک وہ تعلیم کے حصول کے لیے سرگرداں رہیں ہر امتحان میں اچھے نمبروں اور اعلیٰ پوزیشن کی ساتھ کامیابی حاصل کی۔ جب گلوکاری کے میدان میں قدم رکھا تو ایسی دھوم مچائی کہ نہ صرف پاکستان بلکہ بھارت اور انگلینڈ میں اپنے چاہنے والوں کی ایک بڑی تعداد پیدا کر لی اور جب اقوام متحدہ کی نوکری کی تو منفرد کارنامے انجام دیئے۔

وہ لاکھوں افراد کی پسندیدہ گلوکارہ اور پاکستان میں بلاشبہ پاپ سنگنگ کی بلاشرکت غیرے ملکہ تھیں۔ نازیہ حسن کو اس جہاں سے رخصت ہوئے 5 سال بیت چکے ہیں مگر وہ اپنی خوبصورت آواز اور گیتوں کی بدولت آج بھی وہ اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ نازیہ حسن گلوکاری کے میدان میں کوئی منصوبہ بندی کر کے نہیں آئی تھیں۔ انہوں نے گلوکاری شوقیہ طور پر سیکھی مگر 1980ء میں ہونے والی ایک تقریب میں بھارتی اداکار فیروز خان سے ہونے والی ملاقات انہیں پروفیشنل گلوکاری کی طرف لے آئی۔ جن کی فلم ''قربانی'' کے لیے نازیہ نے اپنا مشہور گیت ''آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے تو بات بن جائے'' ریکارڈ کروایا۔ یہ گیت جب ریلیز ہوا تو اس نے ہر طرف دھوم مچا کر رکھ دی اور اس گیت کو گانے والی یہ نوعمر لڑکی دیکھتے ہی دیکھتے شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ نازیہ نے جب یہ گیت گایا تو ان کی عمر 17 برس تھی۔

پی ٹی وی کے پروگرام ''سارے دوست ہمارے'' سے نازیہ حسن نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا جس کے میزبان سہیل رعنا ہوا کرتے تھے۔ نازیہ نے اپنے بھائی زوہیب کے ساتھ بے شمار پروگراموں میں شرکت کی اور جب باقاعدہ گلوکاری کے میدان میں قدم رکھا تو جلد ہی اپنے منفرد انداز کے باعث پاکستانی نوجوانوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اپنی تمام تر شہرت اور میڈیا کی محبوب ترین شخصیت ہونے کے باوجود ان کا میڈیا سے ہمیشہ ایک فاصلہ رہا مگر جتنا وہ میڈیا سے دور رہنا چاہتی تھیں' اتنا ہی انہیں اخبارات میں جگہ ملتی۔ اسی شہرت کی وجہ سے لندن میں بھی نازیہ کا کہیں آنا جانا محال تھا۔ اسی لیے تعلیم مکمل ہوتے ہی نازیہ نیویارک چلی گئیں۔

نازیہ حسن کی کراچی کے صنعت کار اشتیاق بیگ سے شادی ہوئی۔ نازیہ کا اشتیاق بیگ کی بہن سے دوستی کے باعث ان کے گھر آنا جانا تھا مگر اس کے باوجود جب اشتیاق بیگ نے ان کے گھر شادی کا پیغام بھجوایا تو اسے نازیہ کے والدین نے مسترد کر دیا مگر جب نازیہ پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ اسے معدے کا کینسر ہے تو پورے خاندان پر گویا ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ اشتیاق بیگ نے اس حالت میں بھی نازیہ کو قبول کرنا پسند کیا

اور گھر والوں کی مخالفت کے باوجود نازیہ کے گھر رشتہ بھجوایا جسے اس کے گھر والوں نے قبول کرلیا اور یوں دونوں ایک دوسرے کے ہو گئے۔ شادی کے بعد دو سال بعد نازیہ کے گھر کے آنگن میں ایک پھول کھلا' بیٹے عارض کے اس دنیا میں آنے سے نازیہ کی دنیا سمٹ کر اپنے بیٹے تک محدود ہو گئی۔ بیٹے کی پرورش اپنے پاک وطن میں کرنے کی خواہش نے نازیہ کو لندن سے کراچی منتقل ہونے پر مجبور کیا۔

کینسر کی مریضہ کے لیے شادی اتنی خطرناک نہیں جتنی بچہ پیدا کرنا ہے۔ بھائی زوہیب کی شادی کے چند روز بعد اسے علم ہوا کہ چار سال قبل ڈاکٹروں نے جس مرض سے نجات کا مژدہ اسے سنایا تھا وہ ایک بار پھر پوری شدت سے اس پر حملہ آور ہو چکا ہے اور اس مرتبہ اس کا نشانہ معدے کے ساتھ ساتھ پھیپھڑے بھی تھے۔ لندن میں دو سال اس بیماری کے ساتھ نبرد آزما رہنے کے بعد نازیہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔

نازیہ کی وفات کے بعد ان کے شوہر اور والدین کے مابین ایک ہنگامہ سا کھڑا ہو گیا جس کے باعث مرحومہ کے دو پوسٹ مارٹم ہوئے۔ بیوی کی میت کو مزید بے حرمتی سے بچانے کے لیے اشتیاق بیگ نے مقامی عدالت میں لکھ کر دے دیا کہ اس کی بیوی کی میت اس کے والدین کو دے دی جائے تا کہ اس کی تدفین ہو سکے۔ نازیہ کو موت کے سترہ دن بعد زمین کی گود نصیب ہوئی۔

نازیہ حسن کی تیسری برسی کے موقع پر ان کے شوہر کراچی کے معروف صنعت کار اشتیاق بیگ نے "خبریں" کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں بتایا کہ نازیہ کے ساتھ جتنا بھی وقت گزرا وہ یادگار ہے۔ شادی کے بعد ابتدائی چار سال بہت خوشگوار گزرے' پانچویں سال میں ہمارے درمیان کچھ اختلافات پیدا ہوئے۔ جن کی ذمہ دار نازیہ کی والدہ تھیں' جو اپنی بیٹی کے ذہن میں شک کا بیج بوتی رہتیں۔ انہوں نے کہا کہ نازیہ جب کالج میں پڑھتی تھیں تو مجھ سمیت درجنوں نوجوان اسے ہمیشہ سچا پیار کیا۔ میں ایک 'بھنورہ' نہیں تھا جو صرف اس کی خوبصورتی کا دیوانہ ہوتا۔

اشتیاق بیگ نے کہا کہ شادی کے بعد میں نے نازیہ کو ایک ملکہ کی مانند رکھا۔ وہ ہر وقت ہیرے جواہرات میں لدی رہتیں' کبھی اسے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ کیونکہ میری خواہش تھی کہ اس کی جتنی بھی زندگی باقی ہے اسے وہ ہنسی خوشی جیے۔

ایک کینسر کی مریضہ کے لیے شادی اتنی خطرناک نہیں ہوتی' جتنا اس کے لیے ماں بننا خطرناک ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا علم تھا اس لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنی شریک حیات کی زندگی کو خطرے میں ڈالوں' مگر نازیہ کی یہ خواہش تھی کہ اسے اولاد چاہیے۔ نازیہ کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے میں نے اس کا برطانیہ کی اس ڈاکٹر سے علاج کروایا جو برطانوی شاہی خاندان کی خواتین کی ذاتی ڈاکٹر تھیں۔ میں نے کبھی پیسے کو اہمیت نہیں دی۔ نازیہ کی اولاد کی خوشی کے لیے اور بعد ازاں اس کی بیماری پر پیسہ پانی کی طرح بہایا۔ پھر بھی میں اسے موت کے چنگل سے نہ بچا سکا جس کی جدائی کا صدمہ اب بھی میرے دامن گیر ہے۔

❁❁❁


# خوفناک جنگل

دلیر مجرم کی بے پناہ پذیرائی کے بعد پیش خدمت ہے ابن صفی کی جاسوسی دُنیا سیریز کا دوسرا ناول...... خوفناک جنگل۔ ایک پراسرار اور خوفناک جنگل جہاں عجیب و غریب واقعات ہوتے تھے اور لاشیں برآمد ہو رہی تھیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بھوتوں کی کارگزاری ہے۔ حمید اور فریدی کس طرح اس راز سے پردہ اٹھاتے ہیں، معلوم کرنے کے لیے پڑھیے **خوفناک جنگل**۔

# ہردلعزیز، پرکشش اور خوبرو گلوکارہ

## حمیرا ارشد

ذاکرہ بیگم کی اس بیٹی کو آج آپ حمیرا ارشد کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اس نے ایک میوزک چیلنج پروگرام میں "صدا ہوں اپنے پیار کی" گا کر اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ اب حمیرا ارشد کا شمار ملک کی نامور گلوکاراؤں میں ہونے لگا ہے۔ اس نے چند برسوں کی ریاضت سے وہ مقام حاصل کر لیا ہے جو بعض گلوکاراؤں کو زندگی بھر کی جدوجہد کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتا۔ حمیرا کے بارے میں اگر یہ بات کہی جائے کہ اس نے ملکہ ترنم نور جہاں کے گائے ہوئے گیت گا کر زیادہ شہرت حاصل کی ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ خود بھی نور جہاں کو اپنا روحانی استاد مانتی ہے۔ بنیادی تربیت حمیرا نے اپنی والدہ ذاکرہ بیگم سے ہی حاصل کی' تاہم کچھ عرصہ تک استاد نصرت فتح علی خان کی بھی شاگردی بھی اختیار کی۔

حمیرا ارشد کے والد ارشد حسین شاعر ہیں۔ وہ اس وقت اسلام آباد میں ایک میوزک اکیڈمی چلانے کے علاوہ آرٹس کونسل میں بھی جاب کرتے ہیں اور اتنے متحرک ہیں کہ اپنی بیٹی کے گائے ہوئے گیتوں کو کمپوز کرنے کے علاوہ شاعری کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔

ان سے کیا جانے والا انٹرویو پیش خدمت ہے۔

**سوال:** آپ نے گلوکارہ بننے کا فیصلہ کیسے کر لیا؟

**حمیرا:** میں اپنی والدہ کے ساتھ مجلسوں میں پڑھتی تھی۔ میری آواز اتنی اچھی تھی کہ سکول اور کالج کی تقریبات میں بھی مجھے ہمیشہ نعت خوانی کے مقابلوں میں موقع دیا جاتا تھا لیکن میں نے کبھی گلوکارہ بننے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ مجھے گھر والے ایئر ہوسٹس بنانا چاہتے تھے۔ خود مجھے بھی گھومنے پھرنے کا بہت شوق تھا مگر اتفاقیہ طور پر میں گلوکاری کی فیلڈ میں آ گئی۔ دراصل میوزک چیلنج پروگرام میں (جو این ٹی ایم سے ہوا) "صدا ہوں اپنے پیار کی" گا کر اول پوزیشن حاصل کی تو مجھے اس فیلڈ میں مزید گانے اور آگے بڑھنے کا موقع مل گیا' اللہ کا شکر ہے کہ آج اس مقام پر ہوں' ہر شخص رشک کی نظر سے دیکھتا ہے۔

**سوال:** اس کا مطلب ہے کہ آپ اتفاقیہ طور پر اس فیلڈ میں آ گئیں؟

**حمیرا:** آپ کہہ سکتی ہیں! میرا ارادہ قطعاً گلوکاری کی طرف آنے کا نہیں تھا' میں کسی بھی خاص فیلڈ میں نام کمانا چاہتی تھی۔ مجھے اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ تھا اور جب مجھے اس فیلڈ میں آنے کا موقع دیا گیا تو میں نے ثابت کر دیا کہ محنت اور لگن کے ساتھ انسان کسی بھی جگہ ترقی کر سکتا ہے۔

**سوال:** محنت تو بہت سے لوگ کرتے ہیں مگر اس کا پھل کم لوگوں کو ملتا ہے۔ آپ کی کامیابی کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ تو نہیں؟

**حمیرا:** اور لوگوں کے بارے میں تو مجھے نہیں معلوم لیکن میرا ایمان ہے کہ محنت کا پھل خواہ دیر سے ہی کیوں نہ ملے' مل کر رہتا ہے۔ میری کامیابیوں کے پیچھے میری ماں باپ کی دعائیں شامل ہیں اور میں نے بھی یہی سوچ کر محنت کی ہے کہ اس فیلڈ میں آگے بڑھنے اور اچھی گلوکارہ بننے کے لیے شدید تگ ودو کی ضرورت ہے' سو میں کر رہی ہوں۔

سوال: شہرت حاصل کرنے کے بعد آپ میں کوئی تبدیلی آئی؟

حمیرا: اس کی گواہی تو آپ بھی دیں گی کہ جب آپ نے فون کیا اور میں گھر پر موجود تھی تو آپ سے بات کی۔ میرا رویہ سب کے ساتھ عام اور نارمل لڑکیوں جیسا ہی ہوتا ہے۔ میں نخروں پر یقین نہیں کرتی ہوں۔ جو میں تھی' ہوں اور رہوں گی۔ گلوکارہ بن جانے سے مجھے سرخاب کے پر نہیں لگ گئے کہ دوسروں کو آزمائش میں ڈالتی پھروں۔

سوال: اپنی صبح کا آغاز کس طرح کرتی ہیں؟

حمیرا: میری صبح کا آغاز درود شریف پڑھ کر ہوتا ہے۔ جب میرا شعور بیدار ہوتا ہے تو پھر میں دعا مانگتی ہوں' پھر اٹھ کر نماز ادا کرتی ہوں اور دوبارہ سو جاتی ہوں۔

سوال: کیا آپ نماز پابندی کے ساتھ پڑھتی ہیں؟

حمیرا: اللہ کا شکر ہے کہ میں نماز پنجگانہ ادا کرتی ہوں۔ کہیں بھی چلی جاؤں' اس سے غفلت نہیں کرتی۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل بھروسہ ہے اور اس کی شکر گزار ہوں کہ اس نے کم عرصہ میں مجھے اتنی شہرت اور عزت سے نوازا۔

سوال: گھر میں آپ کے معمولات کیا ہوتے ہیں' کس طرح دن گزارتی ہیں' کیا ناشتہ اپنے کمرے میں لیتی ہیں؟

حمیرا: میرا ناشتہ جوس کا ایک گلاس اور بعد میں دلیا ہوتا ہے۔ اگر رات گئے تک گھر سے باہر مصروفیت رہی ہوں تو ناشتہ اپنے کمرے میں ہی کرتی ہوں' ورنہ گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ ٹیبل پر بیٹھ کر گپ شپ کے دوران ناشتہ لیتی ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ میں سارا دن عبادت میں گزاروں۔ سوتے جاگتے میرا دل اللہ تعالیٰ کے ناموں کا ورد کرتا رہتا ہے' ایسا کرتے ہوئے مجھے بے حد سکون ملتا ہے۔ ویسے تو میرا ذہن مذہبی ہے مگر فراغت میں فلم دیکھ لیتی ہوں' کوکنگ کر لیتی ہوں۔

سوال: سٹارز پر یقین رکھتی ہیں؟

حمیرا: یقین تو نہیں رکھتی لیکن مجھے اس کے بارے میں معلومات کا شوق رہتا ہے۔ واحد ذات تو اللہ کی ہے جس پر بھروسہ کرنا چاہیے اور میں اس بھروسے کی وجہ سے شوق کے باوجود اس پر یقین نہیں کرتی۔

سوال: جھوٹ بولتی ہو؟

حمیرا: کوشش کرتی ہوں کو مصلحتاً بھی جھوٹ نہ بولوں' لیکن اس دنیا میں رہتے ہوئے کبھی کبھار مجبوراً ہی سہی بولنا پڑتا ہے۔

سوال: کبھی رشوت دے کر کوئی کام کروایا؟

حمیرا: ہرگز نہیں۔

سوال: گھر میں کیا کھانا آپ کی پسند سے پکتا ہے؟

حمیرا: مجھے اتنی اہمیت نہیں دی جاتی لیکن گھر میں جو کچھ بھی پکتا ہے میں شوق سے کھا لیتی ہوں۔ مزیدار چیزیں میری کمزوری ہیں' اس لیے دال بھی اگر مزے کی ہو تو میں شوق سے کھا لیتی ہوں۔

سوال: آپ کے لیے اچانک کام کی بھرمار ہو گئی' اس کی کوئی خاص وجہ؟

حمیرا: میں خود گلوکاری کے لیے سنجیدہ ہو گئی اور اچھا گا بھی رہی ہوں تو ظاہر ہے کام ملے گا' آج کل ویسے بھی یہ کام زیادہ ہو رہا ہے۔ ریڈیو ٹی وی اور فلم کے علاوہ پرائیویٹ طور پر بھی شوز منعقد کروائے جا رہے ہیں۔ موسموں کے حوالے سے بھی اب تو کام ملنے لگا ہے جیسے موسم بہار اور بسنت کا تہوار...... لوگ بھی میری آواز کو پسند کر رہے ہیں تو ظاہر ہے مجھے زیادہ مواقع مل رہے

ہیں۔

سوال: گھومنے پھرنے کا شوق گلوکاری کی وجہ سے پورا ہو رہا ہوگا؟

حمیرا: ظاہر ہے اندرون اور بیرون ملک کام کے دوران گھومنے پھرنے کا شوق بھی جاری رہتا ہے"

سوال: کبھی کسی کی ناراضگی سے خوف آتا ہے؟

حمیرا: ماں کی ناراضگی کا سوچ کر خوف آتا ہے۔ اس لیے کوشش کرتی ہوں انہیں مجھ سے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے۔ شوہر اور ماں کی ناراضگی سے

سوال: موڈ کب خراب ہوتا ہے؟

حمیرا: موڈ اس وقت خراب ہوتا ہے جب مجھے انتظار کرنا پڑے۔ یا جب کوئی جھوٹ بولتا ہے۔

سوال: کیا آپ سوشل ہیں؟

حمیرا: جی ہاں میں سوشل ہوں۔ تقریبات میں ہلا گلا کرنا اچھا لگتا ہے۔

سوال: کس گانے کی وجہ سے آپ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا؟

حمیرا: بے شمار ایسے گانے ہیں جو مقبول ہوئے اور عوام نے سننے کی بار بار فرمائش کی۔ "صدا ہوں اپنے پیار کی" کو تو بہت پذیرائی ملی۔ "چوڑی کچ دی" کی بھی بار بار فرمائش کی گئی۔ علاوہ ازیں "نہ کوئی جان نہ پہچان" "او پچھلے پہر رات کے" "جیبی ہیا ہیا" "آ کے سپنوں میں میرے" "گل سن ڈھولنا" وغیرہ۔

سوال: آپ کو اپنی آواز میں گایا ہوا کونسا گیت زیادہ پسند ہے؟ میں نیں بولدی

حمیرا: میں اس وقت تک گیت گاتی ہی نہیں جب تک مجھے پسند نہ ہو۔ اس لیے اپنے گائے ہوئے تمام گانے پسند ہیں۔ "وس وے ڈھولا اکھیاں دے کول" اس لحاظ سے بھی پسند ہے کہ اسے والد نے کمپوز کیا اور میں نے بھی خوب جی لگا کر گایا ہے۔ میری ایک ویڈیو اور تین البم ریلیز ہو چکے ہیں اس کے علاوہ لاتعداد گیت گا چکی ہوں اور گا رہی ہوں۔

سوال: آپ مغرور ہیں؟

حمیرا: ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں مغرور اور گھمنڈی نہیں ہوں۔ کیونکہ جو چیز خدا کی دی ہوئی ہے اُس پر غرور کیسا وہ کبھی بھی چھین سکتا ہے۔

سوال: غصہ کن باتوں پر آتا ہے؟

حمیرا: میں دھیمے مزاج کی Cool رہنے والی لڑکی ہوں' غصہ مجھے بالکل نہیں آتا۔ جب آتا ہے تو بہت زیادہ آتا ہے۔ کوئی حد سے گزر جائے تو پھر بول کر غصے کا اظہار کرتی ہوں' یعنی آپے سے باہر ہو جاتی ہوں لیکن یہ آخری حد ہے میں ہمیشہ بڑی بڑی باتیں بھی خاموشی سے پی لیتی ہوں۔ غصے والی عادت سے میرے گھر والے اور میں خود بھی خاصی ڈسٹرب ہوتی ہوں۔

سوال: کچن سے کس حد تک لگاؤ ہے؟

حمیرا: بنیادی طور پر میں ایک لڑکی ہوں' ایسی لڑکی جسے گھرداری سے زبردست لگاؤ ہونا چاہیے۔ اس لیے جب میں گھر پر ہوتی ہوں تو صفائی ستھرائی کے علاوہ کوکنگ بھی زبردست کرتی ہوں۔

سوال: کس ہستی سے متاثر ہیں؟

حمیرا: صرف اپنی والدہ سے کیونکہ ان جیسی عورت میں نے کہیں نہیں دیکھی؛ جس لاڈ پیار سے انہوں نے ہم سب بہن بھائیوں کی تربیت کی اس کی نظیر نہیں ملتی مجھے اپنے سب گھر والے عزیز ہیں لیکن ماں کی چاہت انمول جذبہ ہے۔

سوال: کس بات سے ذہنی سکون ملتا ہے؟

حمیرا: عبادت سے! اس کے علاوہ مزاروں پر حاضری دے کر...... بیرون ملک قیام کے دوران جب مجھے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کسی بزرگ یا نیک ہستی کا مزار ہے تو میں وہاں حاضری دیتی ہوں' اس سے مجھے ذہنی قلبی سکون ملتا ہے۔

سوال: تنقید برداشت کر لیتی ہیں؟

حمیرا: ہاں میرا حوصلہ بلند ہے۔ میں مثبت تنقید سن لیتی ہوں۔ میرے گھر والے میرے نقاد ہیں بلکہ بعض اوقات بے جا تنقید بھی برداشت کر لیتی ہوں۔

سوال: گلوکاری میں کس سے متاثر ہیں؟

حمیرا: ملکہ ترنم نور جہاں میری روحانی استاد ہیں۔ آپ کو تو پتہ ہوگا کہ میں نے ان کی آواز میں گائے گئے گیت گا کر مقبولیت حاصل کی۔ استاد نصرت فتح علی خاں کے مشورے بھی میرے لیے متاع حیات ہیں وہ اکثر و بیشتر مجھے موسیقی کے اسرار و رموز سے آگاہ فرماتے تھے۔ استاد نصرت فتح علی خان کے علاوہ میری استاد میری والدہ ہیں' ان سے میں بے حد متاثر ہوں۔

سوال: کبھی کسی کو کاپی کرنے کی کوشش کی؟

حمیرا: ہرگز نہیں! میں نے کبھی کسی کو کاپی نہیں کی صحیح معنوں میں وہی انسان ترقی کرتا ہے جو اپنا منفرد مقام بنائے اور اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ترقی کرے۔ میں نے میڈم کو گایا ضرور ہے لیکن ان کی کاپی کبھی نہیں کی۔

سوال: موجودہ مصروفیات کیا ہیں؟

حمیرا: نیا البم جو عید پر ریلیز ہوگا۔ مصروفیات اسی حوالے سے ہیں۔ پرائیویٹ شوز میں بھی حصہ لے رہی ہوں۔ کچھ غیر ملکی چینلز سے بھی معاہدے ہوتے رہتے ہیں۔ آج کل بھی مختلف ممالک کے چینلز نے میرے ساتھ معاہدے کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔

سوال: کتنے ایوارڈز حاصل کئے؟

حمیرا: بے شمار ایوارڈز ملتے رہتے ہیں۔ ریڈیو کی بہترین گلوکارہ کا ایوارڈ حاصل کر چکی ہوں۔ مختلف دوسرے ایوارڈز بھی ملے ہیں لیکن عوام کی محبت اور ان کی پسندیدگی میرے لیے کسی ایوارڈ سے کم نہیں۔ ایوارڈ میرے نزدیک اہمیت نہیں رکھتے' مل جائیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں' نہ ملیں تو اللہ تعالیٰ کی رضا سمجھ کر چپ ہو جاتی ہوں۔

سوال: پڑھائی میں کیسی تھیں؟

حمیرا: میں پڑھائی میں نارمل لڑکی تھی۔

سوال: شرارتیں کیں؟

حمیرا: بے حد' بے حساب! میری شرارتوں سے لوگ پناہ مانگتے تھے اور گھر والوں سے شرارتوں کی وجہ سے مار بھی کھاتی تھی۔

سوال: کوئی شرارت یاد ہے؟

حمیرا: بے شمار شرارتیں کیں آج بھی یاد کرتی ہوں تو گھنٹوں ہنستی رہتی ہوں۔ بچپن میں ہم سب بہن بھائی چھت پر آنکھ مچولی کھیل

رہے تھے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے ہم چھت سے نیچے بھی آجاتے تھے اور ایک دوسرے پر مکوں اور گھونسوں کی بارش کرتے تھے۔ ایک دن کھیلتے کھیلتے لائٹ چلی گئی اور جب روشنی ہوئی تو پتہ چلا ہم بہن بھائی ایک دوسرے کی بجائے گھر میں آئے ہوئے مہمانوں پر مکے برسا رہے ہیں۔ امی ابا کے دوست اور سہیلیاں شرم کے مارے کچھ نہیں بولے لیکن ہمیں جو شرمندگی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے' پھر امی نے ہم سب کو خوب مارا۔ دوسری شرارت یہ ہے کہ مجھے پیپسی پینے کا بہت شوق ہے۔ میں جب چھوٹی تھی اور گھر میں کوئی مہمان آتا تھا تو ندیدے بچوں کی طرح مہمان کی طرف دیکھتی رہتی اور خواہش رکھتی تھی کہ وہ کہیں گے بچے تم بھی کھالو یا اپنی بوتل مجھے دے دیں گے اور میں جھپٹ پڑوں گی لیکن یہ خواہش دل میں ہی رہ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ کچھ مہمان آئے وہ گھر کے ایک کمرے میں بیٹھے بوتلیں پی رہے تھے۔ وہ بوتل پی کر جب نیچے رکھتے تو میں جھٹ بوتل اٹھا کر دو تین گھونٹ چڑھا لیتی۔ میں چھپ کر بیٹھی یہ کام کر رہی تھی اس لیے کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا۔ ایک مہمان کی بوتل تو میں نے جھٹ سے ختم کر دی۔ وہ بیچارہ شرم کے مارے بول بھی نہیں سکا۔ آج سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے کہ بیچارہ کہتا ہوگا' ان کے گھر جن تھے جو بوتلیں جھٹ ختم کر گئے۔

سوال: کیا آپ فضول خرچ ہیں؟

حمیرا: نہیں۔

سوال: باہر جاتی ہیں تو گھر والوں کے لیے گفٹ لاتی ہیں؟

حمیرا: ہمیشہ۔

سوال: کوئی ایسی بات جو یاد رہ گئی ہو؟

حمیرا: جب امی پڑھتے ہوئے سر نہیں نکال پاتی تھیں تو میں سنبھال لیتی تھی' اس لمحے لوگ بہت تعریف کرتے تھے اور میں خوش ہوتی تھی۔

سوال: عید کی خریداری عید سے پہلے کرتی ہیں؟

حمیرا: آج کل تو خریداری سارا سال چلتی ہے ویسے بھی مجھے نت نئے ڈریسز خریدنے کا شوق ہے لیکن عید کے لیے بھی اہتمام کرتی ہوں۔

سوال: سہیلیوں سے عید ملنے جاتی ہیں؟

حمیرا: میری کوئی سہیلی نہیں ہے۔ بچپن میں جن کے ساتھ کھیلا وہ نجانے اب کہاں ہوں گی۔ شعور سنبھالتے ہی گانے لگی دوستیاں نبھانے کی فرصت نہیں مل سکی۔ میں دنیا میں کہیں بھی جاؤں گھر آ کر اپنوں میں سکون ملتا ہے اس لیے میری عیدیں بھی انہیں کے ساتھ گزرتی ہیں اور میں بھائی اور بھانجوں کے ساتھ خوب انجوائے کرتی ہوں۔ عید کے پکوان پکاتی ہوں اور سب مل کر کھاتے ہیں۔

سوال: سب سے زیادہ خوشی کس وقت محسوس کرتی ہیں؟

حمیرا: جب میرے گائے ہوئے کسی گیت کو عوامی سطح پر پسند کیا جاتا ہے۔

سوال: کبھی گھر والوں نے آپ کو گلوکاری بند کرنے کا مشورہ دیا؟

حمیرا: شروع میں گھر والوں نے کہا تھا کہ اگر مجھے اس فیلڈ میں کام کرنا ہے تو سنجیدگی سے کرو ورنہ چھوڑ دو۔ امی کہتی تھیں' گانا ہے تو

سنجیدگی سے گاؤں تا کہ اس میں Perfection نظر آئے۔

سوال: موسم کونسا اچھا لگتا ہے؟

حمیرا: مجھے سبھی موسم پسند ہیں کیونکہ ہر موسم کا اپنا الگ مزہ ہے۔ سردیوں میں سردیوں کا' بہار میں بہار کا اور برسات کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ مجھے گرمیوں سے بھی لگاؤ ہے۔

سوال: خوشبو کونسی پسند ہے؟

حمیرا: مجھے ساری خوشبوئیں اچھی لگتی ہیں۔ بس تیز نہ ہوں کہ دماغ پر چڑھے۔ میں ہلکی خوشبو پسند کرتی ہوں۔

سوال: پھول کونسا پسند ہے؟

حمیرا: آئی ایم سوری۔ مجھے پھولوں سے لگاؤ نہیں ہے' میرا مطلب ہے اتنا شوق نہیں کہ پھولوں کو اپنے کمرے میں سجاؤں' گجرے پہنوں یا بالوں میں لگاؤں۔ کوئی محبت سے دے تو قبول کر لیتی ہوں اور استعمال بھی کر لیتی ہوں لیکن شوق نہیں ہے۔

سوال: فروٹ کون سا پسند کرتی ہو؟

حمیرا: تربوز، کیلا ، مسمی وغیرہ۔ سارے رس بھرے پھل پسند ہیں۔

سوال: گھر میں کونسا ڈریس پسند کرتی ہو؟

حمیرا: میں شلوار قمیض گھر میں استعمال کرتی ہوں مگر جین شرٹ فیورٹ لباس ہے۔

سوال: کوئی بات جو ذہن میں آتی ہے لیکن کہہ نہیں سکی؟

حمیرا: مغربی ممالک میں جانوروں سے محبت کا رجحان زیادہ ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اس کے ساتھ ساتھ انسانوں کا بھی اتنا ہی خیال رکھا جائے۔

سوال: دعائیں قبول ہوتی ہیں؟

حمیرا: میں سمجھتی ہوں خلوص نیت سے کی گئی دعائیں ضرور قبول ہوتی ہیں۔ خلیل جبران کا کہنا ہے دعا' روح اور آرزو کے مابین ہم آہنگی کا نام ہے۔ دینے اور لینے والے کے درمیان ایک ایسے لمحے کی تخلیق کا پیش لفظ ہے' جس میں خواہشوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ دعا نہ مانگنے والے ہاتھ ان ریگستانوں کی طرح رہتے ہیں جن پر پانی کی بوندیں برسائے بغیر بادل تیزی سے گزر جاتے ہیں۔

سوال: کس گلوکار نے سب سے پہلے متاثر کیا؟

حمیرا: میری ماں کی آواز تھی دوسری میڈم نور جہاں کی نور جہاں میری روحانی استاد بھی ہیں ان سے متاثر ہو کر میں نے ان کے گانے گائے جس سے مجھے پہچان بھی ملی۔ میری والدہ اکثر میڈم نور جہاں کے ہاں مجالس اور میلاد پڑھنے جایا کرتی تھیں۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتی تھیں پہلی بار جب میڈم نے میری آواز سنی تو انہوں نے پیش گوئی کر دی کہ ایک دن میں سری دنیا میں ضرور نام کماؤں گی اسی دن ہی انہوں نے میری والدہ سے کہا اسے میری شاگرد بنا دو میں اس کی تربیت کروں گی۔

سوال: کس موسیقار کے ساتھ کام کرنا اچھا لگتا ہے؟

حمیرا: الطاف اے حیدر صاحب' میرے والد ارشد صاحب اور اویس ملک ان کے دوگانے میں نے ابھی گائے ہیں جس کا ان دنوں ویڈیو چل رہا ہے" دس وے ڈھولا اکھیاں دے کول۔"

سوال: ریکارڈنگ کے دوران کوئی اہم واقعہ جو ہمیشہ یاد رہا ہو؟

حمیرا: اس دوران بڑے بڑے واقعات ہوئے ہیں لیکن ایک واقعہ جو ابھی تک یاد ہے کہ جب پہلی دفعہ میں فلم کا گانا کرنے گئی تھی تو میرے لیے بڑی ایکسائیٹمنٹ تھی تو سٹوڈیو جا کر ایک دم سے پریشان سی ہوگئی کیونکہ میں نے کبھی ایسا ماحول نہیں دیکھا تھا۔ جب اندر گئی اور دروازہ کھولا تو ایک دم اندر سے سگریٹ کا بہت زیادہ دھواں نکلا۔ اس سے میں اتنا پزل ہوگئی کہ میں نے وہاں اسلام وعلیکم کہنے کی بجائے اندر جاتے ہی سب کو خدا حافظ خدا حافظ کہہ دیا۔ یہ واقعہ مجھے نہیں بھولتا۔

سوال: کلاسیکل موسیقی اور پاپ میں کیا فرق ہے؟

حمیرا: کلاسیکل میوزک کی اپنی پہچان ہے اور پاپ کی اپنی۔ کلاسیکل میوزک کو ہم بہت ہی سلجھا ہوا میوزک کہہ سکتے ہیں بہت بڑا میوزک ہے بہت امپیکٹ والا میوزک اور پاپ میوزک ایسا میوزک کہ جس بندے کی تھوڑی سی بھی آواز اچھی ہو یا وہ چیخیں وغیرہ مار سکتا ہو تو وہ کہے گا کہ میں پاپ سٹار بن گیا یا پھر اس کی شکل صورت تھوڑی بہت اچھی ہو میرا خیال ہے کہ کلاسیکل اور پاپ میوزک کا آپس میں کوئی میل جول نہیں ہے۔ ہاں یہ بات ہے کہ اگر کلاسیکل اور پاپ کو مکس کر کے پرفارم کیا جائے تو پھر میرا خیال ہے پاپ میوزک ہی ہوگا۔

سوال: آج کل موسیقی کو اتنا مشکل کیوں بنا دیا گیا؟

حمیرا: میرا خیال ہے کہ اب موسیقی مشکل کی بجائے آسان ہوگئی ہے ہر بندہ گھر سے اٹھ کر باہر آ کر گانا شروع کر دیتا ہے اور اپنے آپ کو سپر سٹار کہلوانا پسند کرتا ہے۔ اور کمپیوٹر نے گانے کو بہت آسان کر دیا ہے۔

سوال: آپ کا خیال ہے کہ گانے کو سمجھنے والے پیچھے اور نئے لوگ آگے آ رہے ہیں؟

حمیرا: کچھ ایسا بھی ہے اور کچھ شرم کی بات بھی ہے کچھ لوگ بہت زیادہ ٹیلنٹڈ ہیں وہ پیچھے جا رہے ہیں ننانوے فیصد اس شعبے میں تعلقات کی وجہ سے وارد ہوئے ہیں انہوں نے خود ہی گانا شروع کر دیا ویڈیو بنا دیا اور بس اپنے آپ سنگر بن گئے اگر بدقسمتی سے کوئی چل گیا تو ایک دو نئے ویڈیو بن گئے ورنہ بس۔

سوال: پاکستان میں پاپ میوزک کا کیا مستقبل ہے؟

حمیرا: دیکھنے میں تو ایسا لگ رہا ہے جیسے اس کا یہاں برائٹ فیوچر ہے بہت زیادہ لوگوں کا پاپ میوزک کی طرف رجحان ہو رہا ہے نیو جنریشن تو پاپ میوزک کی طرف ہی مائل ہو رہی ہے۔ بہت کم لوگ میوزک کی حقیقت کو سمجھتے ہیں۔

سوال: میڈم نور جہاں کے گائے ہوئے گانے آج بھی پسند کئے جاتے ہیں لیکن آج کل کے سنگروں کے گانے ادھر آئے ادھر چلے گئے ایسا کیوں؟

حمیرا: اس لیے کہ وقت بہت تیزی سے بدل رہا ہے ٹی وی چینل بہت زیادہ آ رہے ہیں لوگوں کو بہت زیادہ پروموٹ کیا جا رہا ہے ایک آرٹسٹ آتا ہے دس دن ایک ویڈیو چلاتا ہے اور دس دن کے بعد نیا ویڈیو لے آتا ہے اسی طرح اگر کوئی اچھا گانا جو لوگوں کے دلوں میں اثر کرے گا وہ کبھی بھی پس منظر میں نہیں جائے گا لیکن اگر اسی طرح جو صورت حال جاری ہے تو پھر کوئی بھی نہیں ٹھہر سکے گا جہاں تک میڈم نور جہاں کے گانوں کا تعلق ہے تو آج تک دنیا میں ان جیسا سنگر اور سریلی آواز والا پیدا ہی نہیں ہوا اور نہ پاکستان میں ان کی جگہ کوئی لے سکے گا۔

سوال: جن سنگروں نے پرانے گانوں کو ری مکس کر کے گایا ہے انہوں نے ان کے ساتھ انصاف کیوں نہیں کیا؟ اگر کیا ہے تو کس حد

تک؟

حمیرا: مختلف سنگر ہیں کسی نے کچھ حد تک انصاف بھی کیا ہے لیکن جن لوگوں نے میڈم نور جہاں کے گانوں پر پرفارم کیا ہے وہ ان جیسی ادائیگی نہیں کر سکے کہاں میڈم اور کہاں یہ سنگر ان کے ساتھ کسی کو بھی کمپیئر نہیں کیا جا سکتا۔

سوال: اپنے کام سے مطمئن ہیں؟

حمیرا: میں ابھی تک کہیں بھی نہیں پہنچی ابھی منزل کا نشان ملا ہے اس تک پہنچنے کے لیے مسلسل محنت اور ریاض کی ضرورت ہے (قہقہہ لگاتے ہوئے) آپ یوں کہہ لیں کہ ابھی میں سیکھ رہی ہوں کرنا بعد کی بات ہے ویسے بھی ساری زندگی انسان سیکھتا ہی رہتا ہے جو یہ سوچ لے کہ میں مکمل ہو گیا تو ناکامی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ مسلسل جدوجہد ہی منزل تک لے جاتی ہے۔

سوال: آپ کی منزل ہے کیا؟

حمیرا: میری منزل میڈم نور جہاں کی وہ پیش گوئی ہے جو انہوں نے میرے متعلق کی تھی کہ ایک دن میں بہت بڑی سنگر کہلاؤں گی اس کے لیے انہوں نے ہمیشہ محنت کو ہی شعار بنانے کا مشورہ دیا تھا میرے بارے میں آپ یہ سوچ لیں کہ میں ابھی نرسری میں ہوں مزید منزلیں ابھی طے کرنی باقی ہیں۔

سوال: آپ کا کلاسیکل موسیقی کے بارے میں کیا نظریہ ہے؟ جبکہ خود آپ پاپ سنگر ہیں؟

حمیرا: میرا نظریہ ہے کہ آنے والے دور میں جب چینل کی بہتات ہوگی اور لوگوں کے سننے کے لیے اتنا کچھ ہوگا بہت سارے لوگ اس میں گڈمڈ ہو جائیں گے وہی لوگ ہوں گے جن کے پاس کچھ ہوگا اور وہی سنگر اوپر آئے گا جس کی بات اور جس کے گانے میں دم ہوگا۔ چونکہ کلاسیکل موسیقی دیرپا ہے اس میں ٹھہراؤ ہے کلاسیکل موسیقی کو ایک الاؤ بھی کہہ سکتے ہیں جبکہ پاپ موسیقی ایک چنگاری ہے چنگاری ایک دم ابھرتی ہے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے اسے پاپ میوزک کہا جا سکتا ہے۔

سوال: ہر کوئی گلوکار بن سکتا ہے؟

حمیرا: (قہقہہ لگائے ہوئے) ٹیکنالوجی نے اس شعبے کو خاصا آسان کر دیا ہے ویسے بھی آج کل ہر کوئی گلوکار ہے۔

سوال: اچھا گلوکار بننے کے لیے کن چیزوں کا ہونا ضروری ہے؟

حمیرا: میرے نزدیک ایک اچھا سنگر بننے کے لیے آواز اور ریاض ضروری ہے اس کے بعد والدین اور بزرگوں کی دعا۔ اور اچھی شکل

سوال: خود بھی گانے سنتی ہیں؟

حمیرا: جی ہاں

سوال: کس سنگر کے؟

حمیرا: میں جب بھی سنتی تو قوالیاں ہی سنتی ہوں کیونکہ قوالیوں میں جو صوفی ازم ہے جو شاعری کی گہرائی ان میں ہے وہ کسی میں نہیں خصوصاً میرے استاد نصرت فتح علی خان کی جو بات ان کی قوالی میں ہوگا مثلاً میوزک کا اتار چڑھاؤ یا جو لے ان کی قوالی میں ہے وہ عام کسی کے ہاں نہیں یا پھر کلاسیکل کوئی راگ سن لیں کوئی بندش سن لیں اس میں وہ چیز مل سکتی ہے۔

سوال: مستقبل قریب میں آپ خود بھی قوالی کی طرف آئیں گی؟

حمیرا: میں خود تو نہیں آ سکتی قوالی میں ہاں اپنے گانے کو قوالی والا سٹائل ضرور دے سکتی ہوں۔

سوال: محفل میں گاتے ہوئے کبھی خوف طاری ہوا ہے؟

حمیرا: ہر محفل میں گاتے ہوئے خوف ہی طاری ہوتا ہے کیونکہ گانا ایک ایسا شعبہ ہے جس میں آپ کسی بھی سٹیج پر پرفارم کر رہے ہوں وہاں آپ یہ سمجھ کر گا رہے ہوتے ہیں کہ یہ آج میرا پہلا شو ہے۔ ہر جگہ عزت بے عزتی کا مسئلہ ہوتا ہے یہ وہی عوام ہے جس کے سامنے آپ گا رہے ہیں اور اس نے آپ کو ہزاروں بار سنا ہے۔ سنگر کی لائف بہت مشکل ہے وہ براہ راست اپنے سننے والوں کا سامنا کر رہا ہوتا ہے اس کی لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ہیں وہ دیکھ رہا ہے کہ فلاں بندے کا اس کے بارے میں کیا ردعمل ہے لیکن ایکٹنگ میں ایسا نہیں ہے۔ لائیو شو میں ایسا نہیں ہے ایک منٹ میں عزت و بے عزتی ہو جاتی ہے۔

سوال: آپ کے ساتھ ایسا کبھی ہوا ہے؟

حمیرا: میرے ساتھ بہت سارے واقعات رونما ہوئے ہیں لوگ فنکار کو دیکھ کر بہت زیادہ پرجوش ہو جاتے ہیں ان کا دل کرتا ہے کہ فنکار کو کھا جائیں پتہ نہیں کیا کر دیں ایسے سین سے اکثر پالا پڑتا رہتا ہے۔

سوال: گاتے ہوئے خود بھی شائقین کی طرف متوجہ ہوتی ہیں؟

حمیرا: میرے سمیت کوئی آرٹسٹ یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتا کہ سننے والے کیا چاہ رہے ہیں لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ جن کے لیے آپ گانا گانے آئے ہیں ان کے موڈ کو تو ضرور دیکھیں گے۔

سوال: آپ لائیو گاتی ہیں یا سی ڈی پر؟

حمیرا: اگر شو لائیو ہو تو وہاں میں لائیو ہی گاتی ہوں سی ڈی نہیں لگاتی لیکن اگر ٹی وی کا کوئی پروگرام ہو تو اس وقت سی ڈی کا بھی سہارا اس لیے لینا پڑتا ہے کہ اس میں کوالٹی کا بہت بڑا فرق آتا ہے جب ٹی وی کے لیے شعر آرینج ہوتا ہے اس میں وہ رزلٹ کبھی بھی نہیں آ سکتا جو ریکارڈنگ سٹوڈیو میں ہوتا ہے۔

سوال: اب تک کتنے البم ریلیز کئے ہیں؟

حمیرا: تین البم ریلیز کر چکی ہوں جن میں ایک سرخ چوڑی کچ دی' اور اب حال ہی میں گل سن ڈھولنا۔

سوال: آج کل کیا مصروفیات ہیں؟

حمیرا: میں ایک نئے البم کی تیاریوں میں ہوں شائقین کی فرمائش پر نئے ویڈیو بھی تیار کر رہی ہوں۔

سوال: نئے البم کا کوئی نام رکھا ہے؟

حمیرا: نہیں ابھی تک اس کا فیصلہ نہیں ہوا ہاں البتہ اس میں کام ضرور ہو رہا ہے۔

سوال: فلم کی طرف کیوں نہیں آتی؟

حمیرا: میں گانے سے فلم کی طرف اس لیے نہیں گئی کیونکہ میں سنگر ہی بننا چاہتی تھی فلم کے بارے میں میرا کوئی شوق نہیں۔ ہاں فلم کا میوزک دیا ہے۔

سوال: کتنے ایوارڈ ملے ہیں؟

حمیرا: کافی ملے ہیں جن میں نیشنل ایوارڈ' گریجویٹ ایوارڈ' بولان ایوارڈ' لکس ایوارڈ' اور باہو ایوارڈ اس کے علاوہ دوسرے چھوٹے چھوٹے بے شمار ہیں۔

سوال: کن باتوں پر غصہ آتا ہے؟

حمیرا: جھوٹ' غلط بیانی سے اور ہٹ دھرمی سے

سوال: اس کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟

حمیرا: جس بندے کے ساتھ ناراض ہوں اسے اس وقت تک نہیں بلاتی جب تک اسے اپنی غلطی کا احساس نہ ہو جائے پھر خود بخود کول ہو جاتی ہوں سوچتی ہوں کہ بہتر ہے اسے معاف کر دوں۔

سوال: خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟

حمیرا: خوشی کے عالم میں بچوں جیسی حرکتیں کرتی ہوں بہن بھائیوں کو پیار سے ماروں گی ڈیک لگا کر ڈانس کروں گی یا پھر اچھے اچھے کھانے بنا کر انہیں کھلاؤں گی۔

سوال: پریشانیاں کن سے شیئر کرتی ہیں؟

حمیرا: جب کبھی بھی پریشان ہوں تو فوراً اپنی ماں سے رابطہ کرتی ہوں بہت زیادہ حساس ہوں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جاتی ہوں۔

سوال: پیدائش کہاں ہوئی اور کتنے بہن بھائی ہیں؟

حمیرا: میرے پانچ بھائی اور ہم تین بہنیں ہیں۔ میری جائے پیدائش گوجرانوالہ کے نواحی شہر فتح والا میں ہوئی جب میں ڈیڑھ سال کی تھی تب امی' ابو لاہور آ گئے اور تب سے لاہور میں ہی رہ رہے ہیں۔

سوال: پسندیدہ گانا؟

حمیرا: نصرت فتح علی خان کی ایک قوالی "منوں یار دی نماز پڑھ لین دے" میرا دل چاہتا ہے کہ ہر وقت اسے ہی گاتی رہوں۔

سوال: شادی کے بعد فنی زندگی میں کوئی تبدیلی تو نہیں آئی؟

حمیرا: خدا کا شکر ہے کہ میرے شوہر احمد بٹ بہت ہی محبت کرنے والے انسان ہیں۔ انہوں نے کبھی میری فنی زندگی میں مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہر سطح پر ہم دونوں کے درمیان اعتماد' محبت اور چاہت کا رشتہ ہمیشہ برقرار رہا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ میرے لئے اور میں اُس کے لئے ہی اس دنیا میں آئی ہوں۔

❁❁❁


## رشتوں کے ریشم

رفعت سراج کے بہترین اور خوبصورت افسانوں کا مجموعہ......رشتوں کے ریشم......جس کی سطر سطر محبت خلوص یگانگت، اور بھائی چارہ کا درس دیتی ہے۔ انسانی زندگی میں سب رشتے خوبصورت ہیں، ہر رشتہ ریشم سے زیادہ خوبصورت اور مضبوط ہے۔ افسانوں کا یہ مجموعہ بہت جلد کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا، جسے **افسانے** سیکشن میں پڑھا جا سکے گا۔

# پاپ کی معروف گلوکارہ

## فریحہ پرویز

فریحہ پرویز نے اپنے فنی کیرئیر کا آغاز 1989ء میں منی سکرین پر اداکاری سے کیا۔ "انوکھا سفر" ان کا پہلا ڈرامہ تھا۔ اس کے بعد زہر باد، سورج مکھی، دلدل، گھر گلیاں اور راستے سمیت کئی مقبول ڈرامے ٹی وی ناظرین کو دیئے۔ پی ٹی وی پر اداکاری کے ساتھ ساتھ انہوں نے بچوں کے پروگرام آنگن آنگن تارے میں گلوکاری بھی شروع کر دی۔ اس کے علاوہ کچھ کمرشلز میں بھی گلوکاری کی۔ فریحہ پرویز نے اگرچہ فنی کیرئیر کا آغاز اداکاری سے کیا مگر ان کا رجحان اور دلچسپی اداکاری کی نسبت گلوکاری کی طرف زیادہ تھی۔ آنگن آنگن تارے اور کچھ کمرشلز میں ان کی گلوکاری کو لوگوں نے بے حد پسند کیا۔ اسی دوران انہوں نے پہلا آڈیو البم شروع کر دیا۔ اس البم کا پہلا گانا "پتنگ باز سجناں" ہی ہٹ ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے اداکاری چھوڑ دی اور مکمل طور پر گلوکاری شروع کر دی۔ اب تک ان کے پانچ البمز ریلیز ہو چکے ہیں اور اب چھٹے البم کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ ان کے گانے فلموں میں بھی شامل کیے گئے۔ ان کا پہلا گانا فلم "سنگم" میں شامل کیا گیا جو اداکارہ ریشم پر عکسبند ہوا۔ دوسرا گانا فلم چیف صاحب میں شامل کیا گیا پھر گانا اداکارہ میرا پر عکسبند ہوا۔ یہ گانا بہت مقبول ہوا۔ ایک گانا فلم گھونگھٹ میں گایا۔ دوگانے فلم انتہا میں شامل ہوئے۔ ایک دوگانا فلم شرارت میں گایا۔ اس گانے میں ان کے ساتھ استاد حامد علی خاں بھی تھے۔

فریحہ پرویز نے غزل، فوک، پاپ ہر حوالے سے اپنے آپ کو منوایا اور اس وقت وہ صف اول کی گلوکاروں میں کھڑی نظر آتی ہیں۔ ان سے کیا جانے والا انٹرویو پیش خدمت ہے۔

سوال: آپ گلوکاری کی طرف کیسے آئیں؟

فریحہ پرویز: میں نے فنی زندگی کا آغاز اگرچہ اداکاری سے کیا مگر میرا اصل شوق گلوکاری ہی تھا۔ میرے والد بہت اچھا گاتے تھے۔ اس حوالے سے وہی میرے آئیڈیل تھے۔ شاید ان کی وجہ سے مجھے ورثے میں اچھی آواز ملی ہے۔ ماضی میں ہمارے معاشرے میں موسیقی کی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میرے دادا یا پردادا نے میرے والد کو گانے کی اجازت نہ دی۔ جس کی وجہ سے ان کا شوق ان کے اندر دب کر رہ گیا۔ پھر وہ اپنے خواب کی تعبیر میری صورت میں دیکھنے لگے۔ بچپن میں میرے ابو میرے ساتھ دوگانے گایا کرتے مجھے ان کے ساتھ گا کر بہت خوشی ہوتی تھی۔ میں چھٹی جماعت کی طالبہ تھی جب میں نے پہلی مرتبہ سکول میں گانا گایا۔ اس کا موضوع سن فلاور تھا۔ اس وقت ابو نے مجھے گاتے ہوئے دیکھا تو انہیں یقین ہو گیا کہ میں گا سکتی ہوں اور پھر گانے کا سلسلہ کسی نہ کسی حوالے سے جاری رہا لیکن یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ پروفیشنل سنگر بھی بن جاؤں گی مگر آہستہ آہستہ سر کی کوشش کے سبب مستقل طور پر اس راہ پر آ گئی اور پروفیشنل سنگر بن گئی۔ میں نے ماڈلنگ اور اداکاری تو شغل کے طور پر کی کیونکہ میری ساری فیملی کا بیک گراؤنڈ ایکٹنگ والا تھا۔ اس لیے سب کا خیال تھا کہ میں بھی ایکٹنگ کرلوں گی اس لیے ٹی وی والوں کو انہوں نے بلایا۔ 1989ء میں میں نے روحی اعجاز کے ڈرامے "انوکھا سفر" سے اداکاری کا سفر شروع کیا پھر راشد ڈار کی سیریل میں کام کیا۔ زہر باد عینک والا جن اور گھر گلیاں اور راستے میرے مقبول ترین ڈرامہ

کہلائے۔ گلوکاری کا شوق ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ گھر گلیاں اور راستے کی ریکارڈنگ کے دوران ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب مجھے محسوس ہوا کہ ایکٹنگ میرا کام نہیں ہے چنانچہ میں نے سنجیدگی کے ساتھ گلوکاری کی طرف توجہ دینا شروع کردی۔ پھر 96ء میں میرا پہلا البم نائس اینڈ نائی جس کا ایک گانا "پتنگ باز سجناں" ہے ریلیز ہو گیا یہ البم ایسے موقع پر ریلیز ہوا کہ اس نے ہر طرف دھوم مچادی اور میں اپنی منزل کے قریب ترین آ گئی۔

سوال: آپ نے اداکاری کیوں چھوڑ دی؟

فریحہ پرویز: ایکٹر بننا میری کبھی خواہش نہیں تھی۔ جو کچھ آج ہوں میں یہی بننا چاہتی تھی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اب اگر ایکٹنگ کرتی ہوں تو میری گائیکی متاثر ہوگی۔ میں اس وقت جو کچھ بھی اپنی گائیکی کی وجہ سے ہوں۔ گلوکاری میرا شوق ہے میرا جنون ہے میں گانا گا کر بہت سکون محسوس کرتی ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں گانے کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرتی ہوں۔ سب سے پہلے دیکھتی ہوں کہ یہ گیت میری شخصیت سے مطابقت رکھتا بھی ہے کہ نہیں۔ کہیں یہ گانا میرے امیج کو خراب تو نہیں کرے گا کیونکہ میں اپنا کالج گرل والا امیج زیادہ سے زیادہ دیر تک قائم رکھنا چاہتی ہوں۔

سوال: آپ کو شہرت کیسی لگتی ہے؟

فریحہ پرویز: گھر سے باہر نکلوں تو لوگ پہچان لیتے ہیں۔ یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا ہے۔ بہت خوشی ہوتی ہے اور اپنے آپ کو بہت خوش قسمت تصور کرتی ہوں۔

سوال: کیا آپ مکالمہ کرتی ہیں؟

فریحہ پرویز: مجھے بہت زیادہ مکالمے کا شوق نہیں ہے مگر اچھی کتاب یا میگزین ملے تو ضرور پڑھتی ہوں فلم دیکھتی ہوں کوئی گیت اچھا لگے تو کیسٹ خرید لیتی ہوں اب تک سیاست بالکل اچھی نہیں لگتی سیاسی حوالے سے پڑھنا دیکھنا اور سننا قطعی اچھا نہیں لگتا۔

سوال: اس معاشرے میں جھوٹ بہت زیادہ ہے مگر میری زندگی میں جھوٹ بہت کم ہے۔

فریحہ پرویز: طلعت حسین اور عظمیٰ گیلانی میرے پسندیدہ اداکار ہیں۔

سوال: آپ کے پسندیدہ گلوکار؟

فریحہ پرویز: ملکہ ترنم نور جہاں' فریدہ خانم اور سجاد علی میرے پسندیدہ گلوکار ہیں۔

سوال: آج کل آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟

فریحہ پرویز: آج کل چھٹے البم کی تیاریوں میں مصروف ہوں۔

سوال: آپ کا کوئی گانا پتنگ باز سجنا جتنی مقبولیت حاصل نہیں کر سکا۔ کیا وجہ ہے؟

فریحہ پرویز: میرا گانا "پتنگ باز سجناں" اتنا مقبول ہو چکا ہے کہ میں خود اس کا ریکارڈ نہیں توڑ سکی۔ یہ گانا بسنت کے ساتھ نتھی ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ کائٹ فلائنگ ایسوسی ایشن نے مجھے اپنے اجلاسوں میں بلانا شروع کردیا۔ میں بھائیوں کے ساتھ خود بھی پتنگ بازی کرتی رہی ہوں۔

سوال: کیا آپ فلموں میں اداکاری کریں گی؟

فریحہ پرویز: اداکاری میں اپنے آپ کو فٹ نہیں سمجھتی پھر فلم میں اداکاری کے لیے تو بالکل فٹ نہیں سمجھتی۔ فلم "سنگم" میں شاوالا رول سید نور نے مجھے آفر کیا جب میں فلم کی اوپننگ پر اپنا پہلا سین عکس بند کرانے گئی تو وہاں پر رش دیکھ کر گھبرا گئی۔

❁❁❁

# مدھر آواز کی منفرد گلوکارہ

## شبنم مجید

گائیکی کی دنیا میں ان دنوں بحران چل رہا ہے اس کی بڑی وجہ ایسے خودرو پودے نما گلوکار ہیں جنہوں نے پرنٹ اور الیکٹرانک کا سہارا لے کر گانے کے ویڈیو آڈیوز اور سی ڈیز تو ریلیز کرا کر نام بنا لیا مگر سریلی اور مدھر دھنوں کے حوالے سے وہ آج بھی ماضی کے نامور سنگرز کے مقابلے میں صفر ہیں مگر اس رش کے باوجود کچھ گلوکارائیں ایسی ہیں جنہوں نے باقاعدہ موسیقی سیکھ کر ریاضت کر کے بتدریج اپنے آپ کو فنی دنیا میں آگے بڑھایا۔ ان میں ایک نام گلوکارہ شبنم مجید کا ہے' ماضی میں نور جہاں' نیرہ نور' مالا' نسیم بیگم کے بعد اگر سریلی اور مدھر آواز فلم پلے بیک سنگر کی میسر آئی ہے تو شبنم مجید اس معیار پر پوری نظر آتی ہے۔

شبنم مجید نے تقریباً آٹھ برس قبل ریڈیو لاہور اور ٹیلیویژن سے گائیکی کا آغاز انتہائی کم عمری میں کیا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد استاد مجید سے ہی حاصل کی۔ پھر اختر حسین انکھیاں' مجاہد حسین' محسن رضا اور میوزک کے دیگر نامور لوگوں سے سیکھتی رہیں' ان کے کام کا بغور مشاہدہ بھی کیا پھر فلم میں اس آواز کو پہلی مرتبہ استعمال موسیقار روبن گھوش نے کیا تھا۔ اس کے بعد موسیقاروں کے ہمراہ متعدد ہٹ گانے گا کر شبنم مجید کا شمار بڑی گلوکاراؤں میں ہونے لگا۔

شبنم مجید ان دنوں بھی ٹیلیویژن اور اسٹیج کے علاوہ فلموں اور ڈراموں کے لیے گا رہی ہیں۔ گزشتہ دنوں انہوں نے ایک بیان دیا تھا جس میں کہا کہ آج کل ہر گلوکار رفاحی کاموں کے حوالے سے ہسپتال بنوانے میں مصروف ہے اور یوں لگتا ہے کہ ساری قوم بیمار ہے نیز جن گلوکاروں مہدی حسن' مجیب عالم اور دیگر کلسیک گائیک کو گانا آتا ہے وہ ہسپتال میں پڑے ہوئے ہیں جبکہ جنہیں گانا نہیں آتا وہ ہسپتال بنوا رہے ہیں۔ شبنم مجید کے اس بیان پر موجودہ سنگرز کی کثیر تعداد نے بہت برا منایا۔ ویسے بھی موجودہ شوبز دنیا میں جو ذرا سا بھی کڑوا سچ بولے اس کے خلاف محاذ کھل جاتا ہے۔ بہر حال شبنم مجید سے جب اس بارے میں بات چیت ہوئی تو انہوں نے کہا میرے بیان کا مقصد کسی سنگر کی توہین کرنا ہرگز نہیں تھا۔ مگر میرے خیال میں ملک میں فلاحی کاموں کے حوالے سے ہسپتال سے ہٹ کر اور بھی بہت سے منصوبے شروع کیے جا سکتے ہیں انہوں نے کہا ہمارے ملک میں بوڑھی عورتوں اور مردوں کے بے شمار مسائل ہیں۔ روز بروز ہماری گرتی ہوئی اخلاقی گراوٹ نے موجودہ نوجوانوں کی اکثریت کو اپنے والدین کے احترام' بزرگوں کے خیال رکھنے سے بیگانہ کر دیا ہے۔ لہٰذا معاشرے میں اولڈ ہاؤس قائم کر کے بڑھاپے میں داخل ہونے والوں کو ضروری آسائش فراہم کرنے کے لیے کام کرنا بہت ضروری ہے۔ اس طرف اگر مجھے میرے وسائل نے موقع دیا تو ضرور کام کروں گی۔ شبنم مجید نے ایک اور سوال کے جواب میں بتایا کہ ان کے گلوکارہ بننے میں ان کی مرحومہ والدہ کا بہت ہاتھ ہے۔ انہوں نے مجھے نا صرف ایک اچھی گلوکارہ بلکہ ایک با اخلاق اچھا انسان بننے میں بھی بہت مدد کی۔ جب سے ان کا انتقال ہوا ہے میری زندگی میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ گانے کا انہیں بچپن سے شوق تھا اور اسکول لائف میں وہ نعتوں میں بھی حصہ لیا کرتی تھیں جب شعور بڑھا تو باقاعدہ گائیکی سیکھنے کی طرف توجہ دی۔ میڈم نور جہاں میری آئیڈیل تھیں۔ نیرہ نور' تصور خانم' ترنم ناز اور لتا منگیشکر کو بغور سنا۔ ٹیلی ویژن پر مجھے پروڈیوسر حفیظ طاہر نے بچوں کے پروگرام میں گوایا بھی اور اداکاری کرائی مگر اداکاری سے زیادہ دلچسپی نہ تھی' اس لیے گلوکاری کی طرف چل پڑی۔

موجودہ میوزک کے انحطاط پر بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ آج کا موسیقار' شاعر اور گلوکار تینوں اپنے راستے سے ہٹ گئے ہیں محنت کیے بغیر راتوں رات کئی برس کا سفر طے کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے جو الٹا سیدھا ذہن میں آتا ہے اسے فنی دنیا میں پھیلا رہے ہیں' رہی سہی کسر ہمارے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے پوری کردی ہے' بے شمار ایسے گلوکار اور گلوکاراؤں کی تصاویر اور بیانات وغیرہ اخبارات میں پڑھتی ہوں تو حیران ہو جاتی ہوں کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جنہیں میں فیلڈ میں رہنے کے باوجود جاننے سے قاصر ہوں۔ انہوں نے کہا موجودہ میوزک میں بحران کی بڑی وجہ باقاعدہ میوزک اکیڈمی اور ماہر اساتذہ کا نہ ہونا بھی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اچھی موسیقی کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ پڑھے لکھے گھرانوں کے نوجوان بھی مستند اساتذہ سے سیکھ کر باقاعدہ ریاضت کرکے فنی دنیا میں آئیں اس سے صاف اور مدھر میوزک شائقین کو ملے گا۔ فلم کے میوزک پر بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے کہا جب سے بے مقصد گجروں بدمعاشوں کی فلموں نے زور پکڑا رومانٹک گانے اور معیاری شاعری فلم انڈسٹری سے رخصت ہوگئی۔ انہوں نے کہا اس کی ذمہ داری ہمارے فلمسازوں ہدایت کاروں کے علاوہ ان فلم بینوں پر بھی عائد ہوتی ہے جنہوں نے فحش گانوں والی فلموں کو کمرشل حوالے سے کامیابی دے کر ان کے حوصلے بلند کیے۔ انہوں نے کہا اس وقت شور شرابے والے میوزک کا پھر بتدریج خاتمہ ہو رہا ہے اور لوگ پھر میٹھی اور مدھر دھنوں اور معیاری شاعری پر مبنی گانوں کو پسند کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا میوزک کا ہر 10/5 برس بعد دور بدلتا ہے۔ لہٰذا اب پھر واپسی ہو رہی ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا اس وقت دنیا بھر کے مختلف چینلز پر چلنے والی موسیقی سن کر ہمارا سامع بہت ہوشیار ہوگیا ہے' ایک دور تھا جب ہمسایہ ملک بھارت کے گانے چربہ کرکے ہمارے فلمساز آنکھوں میں دھول جھونکتے تھے۔ جواب میں بھارت کے بھی موسیقار ندیم شیروان نے ہمارے پرانے گانوں اور دھنوں کو چرا کر کروڑوں روپے اور نام کمایا مگر اب دور بدل گیا ہے' اب وہی کمپوزیشن ہٹ ہوتی ہے جس میں کوئی جان ہو البتہ کبھی کبھار وہ چند غیر معیاری شاعری سے مزین گانے بھی ہٹ ہو جاتے ہیں جنہیں نجی ٹی وی چینلز گھڑی گھڑی دکھا کر خواہ مخواہ ذہنوں پر سوار کردیتے ہیں۔ شبنم مجید نے کہ میری نصابی تعلیم اگرچہ زیادہ نہیں مگر جوں جوں شعور بلند ہوا میں نے نامور شعراء کے کلام پڑھ کر اپنی شاعری کے ذوق کو بلند کرنے کی بہت کوشش کی ہے۔ مجھے علامہ اقبال' مرزا غالب' فیض احمد فیض کے کلام پڑھنے اور گانے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے ان نامور شعراء کے کلام سے بہت کچھ سیکھا۔

میوزک کے بارے میں بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کئی برس سے یہاں اچھا اور نیا میوزک اس لیے تخلیق نہیں ہو رہا کہ میوزک کے پروگرام نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں' انہیں نے کہا وزیر افضل' سلیم حیدر' مجاہد حسین اور دیگر باصلاحیت موسیقاروں نے ماضی میں بہت اچھا کام کیا مگر اب ان کے لیے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لیے پی ٹی وی کو میوزک کے حوالے سے نت نئے پروگرام بڑھانے کی ضرورت ہے' ایک غزل سرائے پروگرام لاہور ٹی وی سے چلتا تھا وہ بھی بند ہوگیا حالانکہ اس پروگرام سے غزل گائیکی سننے اور گانے والوں کی بھرپور تسکین ہوتی تھی۔ پروڈیوسر آغا ذوالفقار خان اور بعد ازاں محمد سلیم طاہر نے اس میوزک پروگرام کی خوبصورتی میں بھرپور اضافہ کیا' انہوں نے کہا اس وقت جیو ٹی وی دبئی سے ''گائے گی دنیا گیت میرے'' پروڈیوس کرکے ہندوستان اور پاکستان کی پرانی مدھر موسیقی سے نوجوان نسل کو متعارف کرا رہا ہے۔ پی ٹی وی بھی اس نوعیت کے زیادہ سے زیادہ پروگرام شروع کرکے نہ صرف سینئر گلوکاروں بلکہ نئے سنگرز کو بھی بہتر مواقع فراہم کرسکتا ہے مگر نہ جانے پی ٹی وی پر کون پالیسی ساز بیٹھے ہیں جو میوزک کو پھلنے پھولنے نہیں دیتے۔

اپنے گائے ہوئے گانے جن فلمی ہیروئنوں پر پکچرائز ہوئے ان میں پسندیدہ فنکاراؤں کے بارے میں بات چیت کرتے ہوئے شبنم مجید نے فلمسٹار ریما کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اس کے گانوں پر مکمل تاثرات کا مظاہرہ ریما نے بہت موثر انداز سے کیا خاص طور پر ایک فلم ''دل تو پاگل ہے'' میں موجود گانا ''میں ہوں چاند اور تو میری چاندنی'' بہت خوبصورت پکچرائز کرایا۔ انہوں نے کہا فنکارہ کے صحیح گانا عکس بند کرانے سے گلوکارہ کو بہت خوشی ہوتی ہے کیونکہ وہ سچویشن اور اس کے بھرپور تاثرات کے ہمراہ گانے کی پوری کوشش کرتی ہے۔

❁❁❁

# مشہور لوک اور فوک گلوکارہ

## شازیہ خشک

نامور فوک گلوکارہ "شازیہ خشک" نے جامشورو سندھ یونیورسٹی کے پروفیسر فاروق احمد کے گھر میں آنکھ کھولی پروفیسر ابراہیم خشک سے شادی کی 2 جڑواں بچوں علی شیر اور شیر علی کی ماں شازیہ خشک کو موسیقی سے بے حد لگاؤ ہے اور زیادہ تر صوفیا کے کلام کو گاتی ہیں والدین نے بہت کم عمری میں شادی کردی تھی شادی کے بعد ہی پڑھائی مکمل کی اور بعد میں ہی گلوکاری شروع کی شازیہ کو شادی سے قبل گانے کا بہت شوق تھا شازیہ کے مطابق ان کی والدہ کو گانے سے دلچسپی نہیں تھی مگر میرے شوہر پروفیسر ابراہیم کو گانے سے عشق تھا ان کی میوزک لائبریری بہت اچھی تھی اچھی اچھی غزلیں اور گیت ان کی لائبریری میں موجود تھے شادی کے بعد ماحول بھی مل گیا شوہر نے حوصلہ دیا اور کہا کہ تم میں ٹیلنٹ ہے پھر انہوں نے آگے بڑھایا میرے دونوں بچے جڑواں ہونے کی وجہ سے میرے لیے کئی مرتبہ پریشانی پیدا کرتے تھے دونوں کی شکلیں ملتی جلتی تھیں جس کی وجہ سے میں بھی پہچان نہیں سکتی تھی بعض اوقات ایک بچے کو دو دو مرتبہ دودھ پلا دیتی تھی لیکن اب وہ بڑے ہوگئے ہیں شازیہ نے کہا کہ مجھے شروع سے ہی فوک گیت گانے کا بہت شوق تھا لوک گیت گانے کے بعد میں نے میوزک کی تعلیم حاصل کی انہوں نے کہا کہ صوفیا کے کلام گانے کا اپنا ہی مزہ ہے لیکن میں نے غزلیں بھی گائی ہیں متعدد نامور شعراء کا کلام گایا ہے شازیہ خشک نے کہا کہ میں جیسی باہر ہوں ویسی ہی اندر سے بھی ہوں چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہوجاتی ہوں انہوں نے کہا کہ میرے ساتھ میوزیشن تو ہوتے ہی ہیں مگر ڈھول اک تارا وغیرہ جو ہمارے کلچر کا حصہ ہیں عوام نے اسٹیج پر دیکھے تو بہت تعریف کی اور اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ترتیب شدہ ہے لیکن یہ قدرتی طور پر ایسا ہوگیا ہے شازیہ کے مطابق ان کے فنی کیرئیر میں ان کے شوہر ابراہیم کا بہت بڑا عمل دخل ہے ہمارے معاشرے میں اکیلی عورت کے لیے شوبز میں مقام بنانا بہت مشکل ہوتا ہے میں دنیا میں جہاں بھی جاتی ہوں اپنے شوہر کو ساتھ رکھتی ہوں اور اس جگہ سے میوزک کے حوالے سے کتابیں خریدتی ہوں ہم دونوں کو ادب اور شاعری سے بہت لگاؤ ہے اور میں اس معاملے میں خود کو خوش قسمت سمجھتی ہوں شازیہ نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھ کو دو بچے اکٹھے ہی دے دیئے وہ دونوں میری لائف کو سمجھتے ہیں جب کبھی باہر سفر کرنا ہوتا ہے تو اگر بچوں کو چھٹیاں ہوں تو ان کو ساتھ لے جاتی ہوں والد کا انتقال ہوچکا ہے والدہ میں ساس اور سسر ہیں ان کے لیے وقت نکالتی ہوں مگر پھر بھی شکائتیں ہوتی ہیں کہ شازیہ کم ملتی ہے باہر کے ملکوں میں کئی مرتبہ پاکستان کی نمائندگی کرنے سے بہت عزت اور بے تحاشا پیار ملتا ہے لیکن اس مٹی کی ایک خاص بات ہے کہ یہاں سے باہر جا کر ہمارا دل نہیں لگتا ہمارے لوگوں میں اتنی خود غرضی نہیں ہے جتنی باہر کے ملکوں میں ہے انہوں نے کہا کہ شو کے دوران اپنے کپڑے خود ڈیزائن کرتی ہوں کلام کا انتخاب میں اور میرے شوہر کرتے ہیں نئے والیم پر میں نے بہت محنت کی ہے اس میں سارے گانے بہت ہی اچھے ہیں سننے والے ہزاروں لوگ ناچتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ میرے بہت قریبی ہیں اور مجھے بہت زیادہ جاننے والے ہیں شازیہ نے کہا کہ اللہ نے بہت کم عرصے میں مجھے بہت کچھ دے دیا اچھے ماں باپ اچھے بچے نام پیسہ شہرت سب کچھ ملا ہے اب اللہ سے دعا ہے کہ عزت سے موت آئے۔

1992ء میں پی ٹی وی کے ذریعے شوبزنس کی رنگین دنیا میں قدم رکھنے والی فطری فنکارہ شازیہ خشک نے شہرت، دولت، عزت، بلکہ ہر

فن مولا فنکارہ بننے اور اس فیلڈ میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے کے لیے دن رات محنت کی اور اس کے نتیجے میں آج وہ شہرت کی ان بلندیوں تک جا چکی ہیں جہاں تک دیگر فنکاروں کا جانا بہت مشکل ہے۔ شازیہ کے تقریباً تیرہ البم ریلیز ہو چکے ہیں اور یہ شازیہ کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے ریلیز ہونے والے ہر البم کو شاندار پذیرائی ملتی ہے نئے البم میں تقریباً مختلف زبانوں میں گیت ریکارڈ کیے گئے ہیں جو یقیناً ایک منفرد نوعیت کا کام ہے۔

آیئے فنی زندگی کے حوالے سے ان سے بات کریں۔☆

سوال: شازیہ سب سے پہلے تو آپ اپنے پس منظر کے بارے میں کچھ بتائیں؟

شازیہ: ہمارا گاؤں اچھوتھر (سندھ) ہے جس کا مطلب ہے سفید ریت والا، یہ لباس جو میں پہنتی ہوں یہ ہمارے شہر کی خانہ بدوش عورتوں کا ہے جو ہماری زمینوں پر آ کر کام کرتی تھیں ان کے ساتھ میرا اٹھنا بیٹھنا بھی تھا میں ان سے بہت متاثر تھی جبکہ میرے والد صاحب سندھ یونیورسٹی کے پروفیسر تھے انہیں میوزک سے صرف سننے کی حد تک تو بہت لگاؤ تھا مگر وہ میرے گانے کے شوق کو وہ باقاعدہ پرفارم کرنے سے خوش نہیں تھے اس لیے میں نے گانے کا شوق پورا کرنے کے لیے کئی بار اپنے والد صاحب سے گزارش کی مگر وہ نہیں مانے پھر میں نے اپنے اسکول کی تقریبات میں نعتیں، گانے، ترانے وغیرہ پڑھنے اور گانے شروع کر دیے جب میں میٹرک میں تھی میری شادی کر دی گئی شادی میں نے گھر والوں کی مرضی سے کی تھی لیکن گانے کا شوق اندر ہی اندر پروان چڑھ رہا تھا میرے شوہر جو کہ ایک لکھاری بھی ہیں انہوں نے سندھی افسانے وغیرہ بھی لکھے ہیں اور شاعری بھی کی ہے اسی سلسلے میں انہوں نے ایک ٹی وی پروگرام میں شرکت کی تھی اور میں بھی ان کے ہمراہ تھی وہاں ہماری ملاقات پی ٹی وی پروڈیوسر سلطانہ صدیقی سے ہوئی انہوں نے مجھے اداکاری کی آفر کی مگر میں نے کہا کہ مجھے تو صرف گانے کا شوق ہے اس پر انہوں نے مجھے سنا اور میری گائیکی کو بھی پسند کیا پھر بعد میں انہوں نے ہمیں بلوایا اور میرا گیت ریکارڈ کیا۔ یوں میں شوبزنس کی دنیا میں آئی اور یہ گیت بہت ہٹ ہوا تھا، ''آ ؤ نہ ہمارے دیس اڑتا پکھیرا''۔

سوال: آج کل آپ کی کیا مصروفیات ہیں؟

شازیہ: ان دنوں میں اپنے نئے البم کی تیاریوں میں مصروف ہوں اس کے علاوہ فنکار دوستوں کی ہی بدولت میوزیکل پروگراموں کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے باقی وقت میں اپنے گھر، شوہر اور بچوں کے ساتھ گزارتی ہوں۔

سوال: شازیہ یہ اس البم کی کوئی خاص بات جو آپ شیئر کرنا چاہتی ہیں؟

شازیہ: یہ البم ہر لحاظ سے خاص ہے کیونکہ اس میں اردو، سندھی، پنجابی اور سرائیکی زبان میں گیت ریکارڈ کیے گئے ہیں اور اس حوالے سے یہ میرا پہلا البم ہوگا جس میں، میں نے بیک وقت چار زبانوں میں گیت گائے ہیں اور یہ میرے پچھلے تمام البم سے ہٹ کر ثابت ہوگا۔

سوال: اس البم کی شاعری کے بارے میں بتائیں؟

شازیہ: نئے اور جدید شعراء کا کلام اس میں شامل کیا گیا ہے صوفیانہ کلام کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے اور اس میں کچھ فوک گیت بھی ہیں جنہیں میں نے سندھی میں گایا، کچھ صوفیانہ انداز کے کلام بھی ہیں جو پنجابی اور سرائیکی زبان میں گائے ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ یہ ایک نئے ڈھنگ کا البم ہوگا۔

سوال: اس البم کے گیت کیا واقعی منفرد نوعیت کے ثابت ہوں گے؟

شازیہ: کیوں نہیں میری موجودہ پرفارمنس دیکھنے کے بعد آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں آج کل کس طرح اپنی گائیکی اور خود چینج لا

رہی ہوں اس کے علاوہ میرا اس البم میں منفرد گیت جو سرائیکی زبان میں (میں رورو وقت گزراتو ناں) جسے سن کر آپ خود کہیں گے کہ یہ گیت شازیہ کا نہیں کسی اور کا ہے اور یہی گیت میرا فیورٹ بھی ہے اس البم کا نام "شازیہ خشک کا نیا انداز" ہے جو واقعی مختلف اور منفرد ہے۔

سوال: آپ صرف لوک موسیقی میں ہی کیوں طبع آزمائی کرتی ہیں؟

شازیہ: سب سے اہم بات یہ ہے کہ مجھے اپنی ثقافت سے بہت پیار ہے میری خواہش ہے کہ میں گائیکی کے ذریعے اپنی ثقافت میں مزید رنگ بھر دوں اور سب سے بڑھ کوشش کی ہے اور ہمیشہ یوں ہی کوششیں کرتی رہوں گی۔

سوال: آپ نے اپنے فن کا مظاہرہ کن کن ممالک میں کیا؟

شازیہ: (امریکہ، برطانیہ) جاپان، فرانس، سری لنکا، ہالینڈ، ترکمانستان، چین اور عرب امارات وغیرہ میں پرفارم کر چکی ہوں ان سب جگہوں پر میرے فن کی قدر کی گئی یہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں کہ وہاں میری گائیکی کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔

سوال: آپ کا سب سے زیادہ یادگار دورہ کون سا رہا؟

شازیہ: دنیا کے یہ ممالک جو اپنی خوبصورتی اور خصوصیات کی وجہ سے بے انتہا مشہور ہیں مگر میرے دل کو جو بھایا وہ ہے ہمارا دوست ملک چین اس ملک کی اپنی خصوصیات کسی بھی سطح پر کسی سے کم نہیں ہیں میں سب سے زیادہ چین ہی گئی ہوں۔ یہاں کے لوگ بے حد محبت کرتے ہیں اور اپنے مہمانوں سے بے پناہ پرخلوص و پیار محبت سے پیش آتے ہیں مجھے خاص طور پر وہاں کی چائے بہت پسند ہے وہاں تقریباً ہر کھانے کے وقت اور اس کے علاوہ بھی چائے بڑے ذوق وشوق کے ساتھ پی جاتی ہے جو مجھے یہاں یاد آتی ہے۔

سوال: وہ کون سے اہم اعزازات ہیں جو آپ نے حاصل کیے؟

شازیہ: سب سے پہلے مجھے جاپان میں فوک میوزک کا ایوارڈ ملا اس کے بعد امریکی سینیٹر بیرل موئ نے مجھے ایک ایوارڈ اور ایک سرٹیفکیٹ دیا اس موقع پر وہاں پاکستانی وزیر جناب مشاہد حسین اور جناب لیاقت علی جتوئی بھی موجود تھے یہ ایوارڈ مجھے واشنگٹن میں ہونے والے ایک میلے میں ہزاروں کے مجمع میں دیا گیا تھا یہی نہیں ایک جاپانی ٹیم نے میری گائیکی اور حالات زندگی پر ایک دستاویزی فلم بھی بنا ڈالی یہ سب دیکھ کر مجھے بے حد خوشی محسوس ہوئی ہے کہ پاکستانی فنکاروں اور ان کی گائیکی کو بین الاقوامی سطح پر بھی سراہا جاتا ہے۔

سوال: اس کا مطلب ہوا کہ اردو نہ سمجھنے والے بھی آپ کو سنتے اور پسند کرتے ہیں؟

شازیہ: مغربی ملکوں کے لوگ میوزک کو بہت پسند کرتے ہیں اور میوزک پسند کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ اسے سمجھیں بھی اس لیے کہا جاتا ہے کہ میوزک کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔

سوال: آپ اپنے گیتوں کو لاجواب اور بے مثال بنانے کے لیے ریاض پر کتنی توجہ دیتی ہیں؟

شازیہ: ہمارے یہاں یہ عجیب وغریب دستور چل پڑا ہے کہ ہر کوئی گلوکار بن جاتا ہے۔ جہاں تک میری بات ہے تو میں آپ کو بتا دوں کہ میں باقاعدگی کے ساتھ ریاض کرتی ہوں کیونکہ جس نوعیت کی میں گائیکی کا مظاہرہ کرتی ہوں اس کے لیے ضروری ہے کہ میں گائیکی کے تمام رموز سے آگاہی حاصل کروں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جن گلوکاروں نے ریاض نہیں کیا ہوتا ان کی آواز اونچے سروں میں ان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور سننے والوں کو باآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ گلوکار کتنے سفارش زدہ

ہیں۔

سوال: شازیہ آپ نے چند پاکستانی فلموں میں اپنی آواز کا جادو جگایا مگر اب آپ فلموں سے دور ہیں کیوں؟

شازیہ: میں نے فلم "خاندان"، "منڈا اگبڑا جائے" اور "پرندہ" جیسی فلموں کے گیت گائے ہیں پاکستانی فلموں میں گانے کے لیے سب سے بنیادی مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ فنکار کو لاہور میں ہی بسیرا کرنا ہوتا ہے جبکہ میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں جام شورو (سندھ) سے لاہور شفٹ ہو جاؤں میں اپنے گھر کو زیادہ اہمیت دیتی ہوں اگر کراچی میں کسی پروگرام میں شرکت کے لیے آتی ہوں تو میں منتظمین سے کہہ دیتی ہوں کہ وہ میرے آئیٹمز جلد کرا دیں تا کہ میں فوری طور جام شورو لوٹ جاؤں میری نگاہ میں میرے بچے سب سے اہم اور عزیز ہیں جب بھی مجھے غیر ملکی ٹور پر جانا ہوتا ہے تو ایسی صورت میں، میں اپنے بچوں کو ساتھ لے جاتی ہوں میں اپنے بچوں کو احساس محرومی کا شکار نہیں دیکھنا چاہتی ہوں بس یہی وجہ ہے کہ جس کے باعث میں پاکستانی فلموں سے دور ہوں دیکھتے ہیں یہ دوری کب تک رہتی ہے۔

سوال: جام شورو میں بھی فنکشنز وغیرہ کرتی ہیں آپ؟

شازیہ: وہاں تو فنکشنز وغیرہ ہوتے رہتے ہیں اور یہ ہمیں اچھا بھی لگتا ہے طلبہ کے فنکشنز میں جان ہوتی ہے اور زندگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔

سوال: آپ کی ایک گھریلو زندگی ہے ایک پروفیشنل لائف ہے دونوں کے لیے بہت وقت درکار ہے آپ کس طرح ان میں توازن برقرار رکھتی ہیں؟

شازیہ: میں آپ کو ایک بات بتاؤں کہ میں نے لٹریچر میں ایم اے کیا ہے اور مزید آگے پڑھ رہی ہوں مگر پرائیویٹ کیونکہ میں ریگولر نہیں پڑھ سکتی ہوں میرے شوہر بھی درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہیں اس لیے بھی بہت زیادہ وقت نہیں نکال سکتی البتہ جب ہم شہر سے باہر جاتے ہیں تو پروگرام ختم ہوتے ہی جلد سے جلد واپس جام شورو لوٹ جاتے ہیں ظاہر ہے کہ مجھے گھر بھی دیکھنا پڑتا ہے اور باہر کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے اس لیے ہم زیادہ وقت شہر سے باہر نہیں گزار سکتے ہیں۔

سوال: شازیہ آپ کے فنکشنز کے معاملات کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟

شازیہ: میں تو گھر سے اکیلی باہر نہیں نکلتی ہوں میں اپنی ساری توجہ اپنے گانے ریاض اور شاعری پر مرکوز رکھتی ہوں فنکشنز کی دیکھ بھال میرے شوہر ابراہیم کرتے ہیں میں سمجھتی ہوں کہ پروگرام آرگنائز کرنا بہت مشکل کام ہے آرٹسٹ کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ اس قسم کے معاملات کی دیکھ بھال خود کرے میرے شوہر نے اس شعبے میں میری بہت مدد کی ہے آج میں اس مقام تک انہی کی کوششوں سے پہنچی ہوں بعض اوقات تو میرے پروگراموں کے چکر میں وہ اپنے کام بھی چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔

سوال: شازیہ خشک گانا مشکل ہے یا آسان آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

شازیہ: ویسے تو دنیا کا کوئی کام بھی آسان نہیں ہے کچھ کرنے سے ہی پتہ چلتا ہے کہ سمندر کے کنارے پر بیٹھ کر اس کی گہرائی کا اندازہ کرنا مشکل ہے بہادر شکاری وہ ہوتا ہے جو سمندر کے بیچ جا کر شکار کرتا ہے گانا روحانی کام ہے روح کا رچاؤ انسان کے اندر کے موسم کی بات ہے جذبہ ہے وقت کی قربانی ہے گانا آپ کے اندر کا اطمینان ہے کسی نے کیا خوب کہا "پیار نہیں ہے سر سے جس کو وہ مورکھ انسان نہیں ہے" گانا ایک چیلنج کا نام ہے ہوا میں گرہیں باندھنا شرط ہے ایک گہرے سمندر کی طرح انسان

جتنا آگے جاتا ہے وہ گہرائی میں ڈوبتا جاتا ہے اور یہاں تک کہ پھر ڈوب جاتا ہے گانا ان کے لیے آسان ہے جو گانا نہیں جانتے اور جو جانتے ہیں ان کے لیے بہت مشکل کام ہے۔

سوال: کیا آپ دوسرے گلوکاروں کو سنتی ہیں؟

شازیہ: آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ میں ہر طرح کی گلوکارہ سے لطف اندوز ہوتی ہوں چاہے وہ کلاسیکل ہو یا پاپ میوزک ہو یا نیم کلاسیکل یا لوک موسیقی ہو، میں سب کو سنتی ہوں میرا خیال ہے گلوکاروں کو کسی مخصوص دائرے میں نہیں رہنا چاہئے بلکہ گلوکاری کی ہر صنف پر توجہ رکھنی چاہیے میں بھی یہ چاہتی ہوں کہ میں اپنی خداداد صلاحیتوں سے خود کو ہر فن مولا گلوکارہ کہلواؤں۔

سوال: آپ بھی تو اسی لوک موسیقی کے دائرے میں قید ہیں؟

شازیہ: میں اب بھرپور کوششیں کر رہی ہوں کہ اپنی گائیکی میں کچھ تبدیلی لاؤں اور ساتھ دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کروں۔ میں نے ایک غزل (میں تلخی حیات کو گھبرا کے پی گیا) ریکارڈ کروائی ہے جس سے آپ کو با آسانی اندازہ ہو جائے گا اب میں بہت کچھ کرنے کے موڈ میں ہوں۔

سوال: آپ نے غزل باقاعدگی کے ساتھ نہیں گائی اس کی کوئی خاص وجہ؟

شازیہ: میں نے معروف و نامور شاعر ساغر صدیقی کی لکھی ہوئی ہے غزل گائی۔ اس کے علاوہ میں نے پروین شاکر کا کلام بھی گایا ہے غزل گانا بہت ہی مشکل کام ہے جسے ہر گلوکار نہیں گا سکتا میوزک بھی بہت زیادہ محنت طلب ہے ہم بے شمار گیت گاتے ہیں تو اس میں سے کوئی ایک گیت ہی ایسا نکلتا ہے جو لوگوں کے دلوں کو چھو لیتا ہے آپ اگر روز ریاض نہیں کرتے تو گا ہی نہیں سکتے۔

سوال: آپ کو زیادہ مزا گیت میں آتا ہے یا غزل میں؟

شازیہ: گانے کا تو خود اپنا ایک مزا ہے اچھی چویشن انسان کے ایکسپریشن کو ابھارتی ہے اچھا گیت بھی غزل لگتی ہے، غزل زندگی کے مختلف شیڈز کا احاطہ کرتی ہے گانے میں دونوں ہی اچھے لگتے ہیں۔

سوال: آپ کے خیال میں گانے سے زیادہ کمپوزیشن مشکل کام ہے؟

شازیہ: گانا واقعی ایک مشکل فن ہے اور گانا کمپوزیشن کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ گلوکار تو ریاض کر کے خود کو پکا کر لیتا ہے لیکن میوزک کمپوز کرنے والوں کو سروں میں وہ سر ڈھونڈنے پڑتے ہیں جن کا آپس میں ملاپ ہو اور وہ دل پر اثر بھی کریں یوں کمپوزیشن ایک تخلیقی کام ہے۔

سوال: جب آپ گاتی ہیں تو دنیا آپ کو سنتی ہے مگر آپ خود کیسے سنتی ہیں؟

شازیہ: میں تو تقریباً سب ہی کو سنتی ہوں ان میں انڈین بھی ہیں پاکستانی بھی ہیں اور کلاسک بھی ہیں میں نے دنیا کے بیشتر گلوکاروں کو سنا ہے میں جب پاکستان سے باہر جاتی ہوں تو وہاں سے کیسٹ لیتی ہوں یا پھر میوزک کے بارے میں کتابیں اپنے ساتھ لاتی ہوں جو کہ میرے پاس کافی تعداد میں موجود ہیں۔

سوال: فوک تو بے شمار لوگوں نے گایا ہے لیکن آپ خود کو ان سے کس طرح مختلف تصور کرتی ہیں؟

شازیہ: یہ فیصلہ کرنا تو میرے سننے والوں کا ہے جو مجھے دوسروں سے مختلف تصور کرتے ہیں کیونکہ مجھے نہیں لگتا کہ مجھ میں کوئی خاص

بات ہے میں بالکل نیچرل آرٹسٹ ہوں میں نے خود کو بنایا نہیں ہے جیسی تھی آج بھی ویسی ہوں گانا بھی میرا ویسا ہے جیسا عورتیں گھروں یا شادی بیاہ کی تقریبات میں گاتی ہیں لیکن اب اپنے چاہنے والوں کی خواہش پر میں اپنی پرفارمنس میں کچھ تبدیلی لائی ہوں امید ہے میرے پرستار اسے پسند کریں گے۔

سوال: آج کل ہر گلوکار سیٹلائٹ چینلز کے لیے مختلف گیت اور ان کی ویڈیوز تیار کر رہا ہے آپ نے اس طرف توجہ نہیں دی؟

شازیہ: ایسے گیت اور ویڈیوز کی تیاری کے لیے ایک کثیر سرمایہ خرچ ہوتا ہے اور میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے کہ میں اس عالی شان منصوبے پر عمل کر سکوں جب میرے پاس اتنا سرمایہ ہوگا تب میں بھی ویڈیوز وغیرہ بنواؤں گی۔

سوال: آپ جو مخصوص لباس پہنتی تھیں اس کا آپ کی مقبولیت میں بڑا ہاتھ ہے اب آپ نے اپنا انداز و اسٹائل تبدیل کیا ہے اس کا آپ کی مقبولیت پر تو اثر نہیں پڑے گا؟

شازیہ: یہ جو مجھ میں تبدیلی آئی ہے یہ میرے مداحوں کی وجہ سے آئی ہے کیونکہ موجودہ دور میں ہماری فیلڈ کا ہر آدمی تبدیلی کی بات کر رہا ہے میں نے بھی تبدیلی دینے کی کوشش کی ہے میرے چاہنے والے اس تبدیلی سے بہت خوش ہیں ویسے بھی ہمارے یہاں چینلز کی بھرمار نے لوگوں کے مزاج کو تبدیل کر دیا ہے۔ جس طرح سننا چاہتے ہیں اسی طرح دیکھنا بھی چاہتے ہیں آج کل اس چیز کو کوئی نہیں دیکھتا کہ گانے والے نے کیا پہنا ہے اور کیا نہیں پہنا۔

سوال: آپ اتنی مصروفیات میں ریاض کرنے کا وقت کیسے نکال پاتی ہیں؟

شازیہ: میں روزانہ باقاعدگی سے ریاض کرتی ہوں اور یہ بات بھی سو فیصد درست ہے کہ اگر فنکار ریاض نہ کرے تو تنقید نگاروں کو پتہ چل جاتا ہے گر گلوکار کے لیے ریاض کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ایک ایتھلیٹ کے لیے روزانہ ورزش کرنا ضروری ہے۔

❁❁❁


## میرے خواب ریزہ ریزہ

جو چلے تو جاں سے گزر گئے جیسے خوبصورت ناول کی مصنفہ ماہا ملک کی ایک اور خوبصورت تخلیق۔ میرے خواب ریزہ ریزہ کہانی ہے اپنے "حال" سے غیر مطمئن ہونے اور "شکر" کی نعمت سے محروم لوگوں کی۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں، وہ زمین سے آسمان تک پہنچ کر بھی غیر مطمئن اور محروم رہتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار زینب بھی ہمارے معاشرے کی ہی ایک عام لڑکی ہے جو زمین پر رہ کر ستاروں کے درمیان جیتی ہے۔ زمین سے ستاروں تک کا یہ فاصلہ اس نے اپنے خوش رنگ خوابوں کی راہ گزر پر چل کر طے کیا تھا۔ بعض سفر منزل پر پہنچنے کے بعد شروع ہوتے ہیں اور انکشافات کا یہ سلسلہ اذیت ناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے رستوں کا تعین بہت پہلے کر لینا چاہیے۔

یہ ناول کتاب گھر پر جلد آ رہا ہے، جسے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

# صوفیانہ کلام گانے والی شہرہ آفاق گلوکارہ

## عابدہ پروین

یوں تو عابدہ پروین نے سب طرح ہی گایا ہے مگر ایک مقبولیت اور مصروفیت ایسی ہے جس نے عابدہ کی پہچان کو دوسروں سے جداگانہ بنا دیا، صوفیوں کا کلام گانے میں وہ ایسی سرخوشی حاصل کرتی ہیں کہ گاتے ہوئے انہیں کچھ یاد ہی نہیں رہتا، بقول عابدہ "میں تو پلی بڑھی ہی مزاروں پر ہوں۔ درگاہوں کی ہواؤں نے مجھے سانس لینا سکھایا ہے اور اب یہ سب کچھ میری روح میں اس طرح رچ بس گیا ہے کہ میں اور کہیں نکل بھی جاؤں تو میری روح نہیں جائے گی۔ بس یوں عابدہ پروین اور صوفیانہ کلام لازم وملزوم ہو گئے، صوفیانہ کلام وہ ہوتا ہے جو اللہ کے برگزیدہ بندوں نے کہا ہو، سلطان باہوؒ، شاہ حسینؒ غلام، فریدؒ، شاہ لطیف بھٹائیؒ اور بابا بلھے شاہؒ نے تو اس سفر میں استاد لاؤ ویز اور ہمیشگی والا کلام چھوڑا ہے کہ عابدہ پروین اور دیگر نے ان اشعار کو گا کر ایک نئی دنیا موسیقی کے میدان میں تعمیر کر دی، صوفیا کی باتوں میں جو حکمت اور عظمت ہوتی ہے اس کی تو بات ہی کیا، ان کے تو رمز اشارہ کنایوں میں بھی ایسی ایسی پتے کی باتیں زندگی کے اسرار رموز اور دل کی کہانیاں انگڑائیاں لیتی ہیں کہ بندے کے وجود میں ایک سرے سے دوسرے تک ہلچل مچ جاتی ہے۔ اسی طرح اللہ اور بندے کے درمیان جو ایک طول پیچیدہ سفر ہے اسے بھی صوفیا نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ اس کی لے پر اس کی دھن پر اور ان بولوں پر وجد طاری جاتا ہے، وجد میں گیان ہے اور گیان میں نجات ہے اور نجات!

یہ بھلا کب کس کو ملی، جو پائے وہی نصیبوں والا ہے باقی سب دکھوں کے گھور اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں، پتا نہیں عابدہ کو کیا ملا کیا ملتا ہے، شاید وہ بتا بھی نہ سکیں گی مگر وہ جو کچھ کرتی ہیں اس کی بابت پوچھا جائے تو وہ کہتی ہیں۔ "ہمیں تو اور کچھ نہیں معلوم بس ہم تو صوفیائے کرامؒ کے کام کو آگے بڑھاتے ہوئے مسلسل کیے جا رہے ہیں بظاہر تو ہمارا ایک ہی مقصد ہے کہ ساری دنیا میں اس کلام کو لے جائیں، اس سلسلے میں ہم نے لندن میں ایک ریکارڈنگ کمپنی سے معاہدہ کیا ہے اور جو کچھ بھی میرے اندر ہے اسے میں بس گائے چلی جا رہی ہوں یہ ایک ایسا سلسلہ ہے کہ مختلف صوفیائے کرام کے کلام کی پوری پوری سیریز ہم انہیں دیں گے، وہ ہر تین مہینے بعد ایک البم ریلیز کریں گے اب تک بابا بلھے شاہؒ کی کیسٹ آ چکی ہے، دیگر پر کام جاری ہے ایک اور کامیابی یہ ہوئی ہے کہ ورلڈ چارٹ میں ہماری ایک کیسٹ شامل ہوئی ہے جو "فیض بائی عابدہ" ہے اور یہ اس طرح کا اعزاز ہے کہ پورے ہندوستان اور پاکستان سے صرف یہ ایک کیسٹ ہے جو ورلڈ چارٹ کا حصہ بنی ہے، فیض کی شاعری تو ہے ہی دلوں کو چھو لینے والی اور لوگ بھی ان کا کلام گا چکے ہیں میں نے بھی گایا بس لوگوں کو ایسا پسند آیا کہ ان کی پسندیدگی نے اس کیسٹ کو ورلڈ ریکنگ میں شامل کرا دیا ہالی ووڈ والوں نے کمپنی کو مبارکباد کا خط بھیجا تھا۔ پھر "کبیر بائی عابدہ" ہے یہ بھی میں نے پہلی مرتبہ گایا ہے ان کے دوہے تو میں پہلے سے گا رہی تھی مگر باقاعدہ اب گایا، اس طرح سے سب ہی صوفیا کرام نے اپنے کلام میں اللہ کے رازوں کی بات کی اب ان کے بات کرنے کا انداز ہے وہ عام آدمی کو خصوصاً آج کے عام آدمی کو کیسے سمجھ آئے، پھر انہوں نے عام آدمی کو ان ہی کی زبان میں بات کی جیسے وہ بولا کرتے تھے چنانچہ شاعری نے پوری انسانیت کے لیے کام کیا۔ جیسے شورکوٹ میں سلطان باہوؒ ہیں ان کا اپنا رنگ ہے سب صوفیا کا رنگ اپنا ہے کلام میں ندرت اور الگ پہچان تو ہوتی ہی ہے اور موسیقی کا بھی الگ خاص انداز ہے۔ حضرت بھٹائیؒ کی درگاہ میں جائیے تو انہوں نے نئی موسیقی ایجاد کی ہے، حضرت سلطان العارفین کے بھی

اپنے ابیات ہیں مگر موسیقی! اس میں نئے آہنگ ملتے ہیں جو اپنے اپنے علاقے میں مقبولیت کی منزلیں طے کرتی ہے حضرت غلام فرید کی کافیاں تو اتنی مشہور ہیں کہ آپ جانتے ہیں لوگ کس طرح انہیں سنتے ہیں"۔ موسیقی کے بارے میں عابدہ کہتی ہیں۔

"میں سمجھتی ہوں موسیقی ان ہی صوفیا کرام کی ایجاد ہے یہ کسی موسیقار نے ایجاد نہیں کی تھیں بلکہ موسیقاروں نے ان کی موسیقی کو اپنایا جو دردان کے کلام میں ہے اسے کوئی اور محسوس ہی نہیں کر سکتا وہ خود ہی اسے لوگوں تک ایسے احساس سے پہنچاتے ہیں کہ بندہ غائب میں بھی خود کو ڈھونڈ نکالے، سب ہی لوگ اپنی تلاش میں مگن ہیں خود کو ڈھونڈ رہے ہیں اور یہی زندگی کا مقصد بھی ہے جسے صوفیوں نے بے حد آسان بنا دیا اگر کوئی سمجھ پائے تب"۔

عابدہ پروین کو لگ بھگ تیس برس موسیقی سے پہچان بنانے میں صرف ہوئے آج ان کی پہچان سب سے جدا اور مختلف ہے اور ایک بات جو ہم اوروں کے لیے نہیں کہہ سکتے جیسے پٹھانے خاں جو صوفیوں کے کلام گانے کی ایسی درد بھری اور ہمہ صفت آواز تھی کہ آج بھی ان کا گایا ہوا "میڈا عشق بھی تو" ایک ایسی مثال ہے جو ہمیں کہیں اور نہیں ملتی تاہم صوفیوں کی طرح ان کے چاہنے والے بھی دنیاوی مال ومتاع کی دولت اکٹھی کرنے میں بالعموم ناکام ہوئے یا پھر انہوں نے ایسا نہیں چاہا، پٹھانے خاں کو شاہوں نے سنا، حکمرانوں کے چین وقرار کی بھی سبیل بنتے رہے وہ مگر ان کی معاشی تنگ دستی اور کسمپرسی جوں کی توں رہی، عابدہ نے جدید عہد کے تقاضوں سے سیکھا ان کے ساتھ رہنے والوں نے انہیں معاشی خوشحالی کے رستے بھی بالکل ٹھیک ٹھیک سجھائے جس سے وہ قرار اور پہچان بھی جانے نہ پائے اور بات بھی بنی رہے۔ تب پھر اس سوال پر کہ اتنے برس موسیقی سے جڑے رہنے کے بعد اب وہ کیا سوچتی ہیں تو وہ کہتی ہیں۔

"کہ موسیقی ایک سمندر ہے، سمندر سے تو ایک قطرہ بھی حاصل ہو جائے تو بڑی بات ہے میں خود کو طالب علم ہی سمجھتی ہوں اور جب صوفیا کا کلام پڑھتی ہوں تب مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں تو ابھی کچھ بھی نہیں جانتی، ان گزرے برسوں میں جو کچھ میں نے کیا وہ کس کے لیے باعث اطمینان ہے مجھے نہیں معلوم میرے لیے نہیں ہے میں تو ہر پل سے سیکھتی ہوں اور میں صرف اس لمحے کو ڈھونڈتی ہوں جب میری گائیکی سن کر خود میں اور کوئی بھی خواہ لمحے بھر کو اللہ سے جا ملے، بس وہی ایک لمحہ ساری زندگی کا حاصل ہے اور یہ لمحہ صوفیا کی شاعری کو گائے بغیر کہاں سے مل سکتا ہے میں سمجھتی ہوں جو کچھ بھی میری آواز میں چمک آتی ہے سب ان ہی کی دین ہے اور بس! میں آج بھی اول دن کی طرح اس میدان میں اترتی ہوں کیونکہ موسیقی کا کوئی انت نہیں ہے"۔

مغربی ترقی نے موسیقی کے سازوں کا بھی حلیہ اور شکلیں بدلیں تب عابدہ پروین نے ان سازوں سے کس طرح ایڈجسٹ کیا یا پھر وہ انہیں قبول نہیں کر سکیں اس کا جواب وہ یہ دیتی ہیں۔

"میں سمجھتی ہوں موسیقی تصوف سے نکلی ہے تصوف ہی بنیاد ہے تو بنیاد تو کسی بھی صورت بدل نہیں سکتی خواہ ساز کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ سب چیزیں اسی بنیاد سے نکلی ہیں، اصل چیز تو تڑپا دینے والا احساس ہے اگر وہ احساس موجود ہے کسی بھی ساز میں سے نکلے تو اصل تو ہے نا! یہ احساس کسی بھی ساز میں سے نکلے اصل تو ہے نا! یہ احساس کسی بھی وجہ سے نہ رہے تو پھر ایسی چیز دیر تک ٹھہر نہیں سکتی۔ شروع سے ہی انسانوں نے گھر بنائے ان کی شکلیں بدلتی رہیں مقصد تو وہی تھا جو ہزاروں سال سے ایک ہی چلا آتا ہے"۔

گزشتہ دنوں صوفیانہ کلام کو تجارتی انداز سے گانے اور مقبول بنانے کی کوشش بھی سامنے آئیں آپ ان کاوشوں کے بارے کیا کہتی ہیں؟

"فنکار جب تک کمرشل ازم سے نہیں نکلے گا میں سمجھتی ہوں وہ اپنی روح کے ساتھ ہونے والی پہچان سے دور رہے گا"۔ "جو اللہ والوں سے دوستی رکھتا ہے اسے اللہ ہی سے ملتا ہے آپ جیسی دوستی رکھیں گے ویسا ہی ملے گا، تو میں کہتی ہوں بندے میں سے لالچ نکل جائے تو وہ اللہ کا بندہ بن جاتا ہے"۔

اک تارا عابدہ پروین کا پسندیدہ ساز۔

یہ صرف ایک تار کا قدیم ساز ہے۔اس میں بانس کا گز بھر ڈانڈ تو بنے سے لگا ہوتا ہے۔تو بنے کے وسط میں گھڑچ ہوتی ہے جس پر سے تار گزر کر ڈانڈ کے سرے میں لگی ہوئی کھونٹی تک پہنچتا ہے۔گانے والا اسے ایک انگلی سے لے میں اپنے ساتھ چھیڑتا رہتا ہے۔لاہور کے سائیں مرنا نے اس میں ایک قابل تحقیق جدت پیدا کی۔وہ اس ستار کی طرح کندھے سے لگا کر باجے کے تار کو چھیڑتے اور بائیں ہاتھ میں لکڑی کا ایک ٹکڑا لے کر تار پر کھسکاتے۔یوں اس ساز پر چتر دنیا کے سر پیدا ہو جاتے۔سائیں مرنا کا اکتارا قدیم اکتارے سے کچھ بڑا تھا اور انہوں نے باجے کے ایک تار کے ساتھ آس دینے کے لیے چند تار بڑھائے تھے مگر اسے بھی اکتارا ہی کہا جاتا ہے۔

## بھٹ شاہ! جہاں عابدہ پروین پلی بڑھیں:

ایک گاؤں ہے جس کی آبادی اب کافی ہو چکی ہے شاید لاکھوں تک جا پہنچی ہو۔ ضلع حیدر آباد ہے، یہاں شاہ عبداللطیف بھٹائی کا مقبرہ ہے جو بہت عظیم صوفی شاعر تھے ان کا شاہ جو سالوں ایک ایسی شاعرانہ تخلیق ہے جس کی مثال دنیا کے بڑے بڑے شعری نادر نمونوں سے مماثل کہی جاتی ہے، ان کی وجہ سے یہ علاقہ پورے سندھ میں مشہور مقبول ہے اور اس مقام کو متبرک مقام بھی سمجھا جاتا ہے۔شاہ صاحب کا مقبرہ پتھری کی بنیاد پر پکی اینٹوں سے تعمیر ہوا ہے اور اندرونی حصہ روغنی ٹائلوں سے آراستہ ہے ہر سال صفر کے مہینے میں یہاں کئی دن تک (تین دن لازمی) عرس کی تقریبات ہوتی ہیں ان کے چاہنے والے دور دور سے یہاں آتے ہیں۔ یہاں ایک ثقافتی مرکز بھی ہے، سندھی ادبی کانفرنس کا اجلاس بھی یہی ہوتا ہے، شاہ عبداللطیف بھٹائی سے ایک عالم متاثر ہے انہوں نے ساری زندگی رب کی محبت اور عوام سے پیار خلوص میں گزاری، دنیا سے دور ایک ویران علاقے میں جا کر قیام کرنے والے بھٹائی آج دیکھتے ہوں گے کہ ان کی درگاہ میں کیسی کیسی رونقیں براجمان ہیں۔ عابدہ پروین نے اپنی زندگی کا روحانی سفر یہیں سے شروع کیا۔

❁❁❁

**محبتوں کے ہی درمیاں**

خواتین کی مقبول مصنفہ **نگہت عبداللہ** کے خوبصورت ناولٹوں کا مجموعہ، **محبتوں کے ہی درمیاں** جلد کتاب گھر پر آرہا ہے۔اس مجموعہ میں انکے چار ناولٹ (تمہارے لیے تمہاری وہ، جلاتے چلو چراغ، ایسی بھی قربتیں رہیں اور محبتوں کے ہی درمیاں) شامل ہیں۔ یہ مجموعہ کتاب گھر پر **ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

# مقبول ترین سُریلی گلوکارہ

## حمیرا چنا

حمیرا چنا عہد حاضر کی معروف و مقبول ترین گلوکارہ ہیں۔ اور ان کو اپنی آواز کے زیر و بام پر قدرت حاصل ہے فن گائیکی میں حمیرا چنا ایک مستند نام ہے جنہوں نے اپنی سریلی آواز کے ذریعے شوبز کی دنیا میں ایک منفرد مقام حاصل کیا اور ڈھیر ساری شہرت اپنے دامن میں سمیٹی، حمیرا چنا فن گائیکی کے حوالے سے کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ بلند مقام حاصل کرنے کے بعد بھی ان کی شخصیت میں عاجزی ہے۔ وہ اپنی جونیئر فنکاروں کو بڑی اپنائیت سے ملتی ہیں۔

حمیرا چنا نے پہلی بار پاکستان ٹیلی ویژن (کراچی مرکز) کے مشہور اسٹیج شو سلور جوبلی میں ہدایت کار نذیر کی ایک کامیاب پنجابی فلم ''ہیرا'' کا نغمہ اساں جان کے میٹ لئی اکھ وے، جھوٹی موٹی دا پالیا ایک لکھ دے' گا کر مہمانان گرامی اور حاضرین و ناظرین سے داد تحسین حاصل کی۔ مہمانان میں ماضی کے معروف فنکار سورن لتا ان کے شوہر نذیر (مرحوم) منی بیگم اور باکمال فنکار سلیم ناصر (مرحوم) شامل تھے۔ یوں گلوکارہ ناہید اختر کی فلمی دنیا سے علیحدگی سے جو خلا پیدا ہوا تھا اسے حمیرا نے پر کیا اور وہ فلمی سنگیت کے افق پر نمودار ہوئیں۔

حمیرا چنا نے متعدد فلموں میں گیت گائے اور ان کے درجنوں گانے مقبول ہوئے۔ انہوں نے بیرون ممالک میں درجنوں میوزیکل شو کیے اور غیر ملکیوں سے خوب داد وصول کی۔ آج حمیرا فن گائیکی کے حوالے سے بین الاقوامی شناخت رکھتی ہیں۔ انہوں نے استاد نصرت فتح علی خان (مرحوم) کے ساتھ بھی گایا انہوں نے اپنی سریلی آواز کی بدولت درجنوں ایوارڈ بھی حاصل کیے جن میں نیشنل ایوارڈ، گریجوایٹ ایوارڈ، اور بولان ایوارڈ قابل ذکر ہیں۔

گلوکارہ حمیرا اپنی بھرپور پروفیشنل زندگی کے ساتھ ساتھ ازدواجی زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کی شادی 2002ء میں ہوئی ان کی ایک ننھی منی سی بیٹی اقراء بھی ہے جسے وہ بہت پیار کرتی ہیں اور اپنا فارغ وقت اس کے ساتھ ہی گزارتی ہیں۔

آیئے ان سے گفتگو کرتے ہیں۔

سوال: شادی کب ہوئی؟

حمیرا چنا: (مسکراتے ہوئے) ہماری شادی 27 ستمبر 2002ء کو ہوئی۔

سوال: شادی خاندان میں ہوئی؟

حمیرا چنا: جی ہاں۔ میری شادی پھوپھو کے بیٹے سے ہوئی۔

سوال: شادی آپ کی پسند سے ہوئی؟

حمیرا چنا: ہماری شادی والدین کی پسند سے ہوئی۔ میں نے شادی کا فیصلہ والدین پر چھوڑ دیا تھا۔ ویسے میرے والدین نے مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ اپنی پسند کے بارے میں بتاؤ تو میں نے ان سے کہا آپ کو اپنے بچوں کی طبیعت کا پتہ ہے انہوں نے کہا

اسلام میں اس کی اجازت ہے تو میں نے کہا یہ بات درست ہے مگر میں آپ کی پسند کو ترجیح دوں گی۔

سوال: رشتہ کا پیغام ان کی طرف سے آیا؟

حمیراچنا: جی ہاں میری پھوپھو نے کئی بار میرے والد سے اس خواہش کا اظہار کیا اور کئی بار کہا۔ پھر امی ابو نے اس بارے میں سوچ کر فیصلہ کر کے مجھ سے پوچھا پہلے تو میں نے کوئی خاص رسپانس نہیں دیا اتنا کہا کہ آپ سوچ لیں امی نے کہا ہم نے سوچ کر فیصلہ کیا ہے تمہاری پھوپھو رشتہ مانگ رہی ہیں میں نے کہا جیسے آپ کی مرضی۔

سوال: آپ کے پھوپھوزاد تھے کیا منگنی سے پہلے گپ شپ ہوئی؟

حمیراچنا: ہاں کزن ہونے کے ناطے وہ ہمارے گھر آتے تھے۔ اور جب بھی وہ اسلام آباد جاتے تو ہمارے گھر میں رکتے ان سے اچھی گپ شپ تھی مگر شادی کے حوالے سے کبھی ایک دوسرے کے ذہن میں نہیں آیا۔

سوال: منگنی کتنا عرصہ رہی؟

حمیراچنا: (ہنستے ہوئے) منگنی کے بعد تو میں ان سے پردہ کرنے لگی ہماری فیملی میں ایسا ہے کہ منگنی کے بعد لڑکی لڑکے کے سامنے نہیں آتی۔

سوال: پھر تو وہ آپ کو ٹی وی سکرین پر ہی دیکھتے ہوں گے؟

حمیراچنا: (قہقہہ لگاتے ہوئے) ہاں ایسا ہی تھا مقصود نے تو اس بات کا گلا میرے دوسرے کزنوں سے کیا تھا کہ اس کا تعلق شوبز سے ہے سب کے سامنے جاتی ہیں مگر مجھ سے پردہ کرتی ہیں اس پر میں نے کہا خاندانی روایت کو بدلا نہیں جا سکتا۔

سوال: ان کا مزاج کیسا ہے؟

حمیراچنا: بہت نرم طبیعت کے مالک ہیں دھیمے مزاج کے ہیں۔ ہمدرد قسم کے بہت خیال رکھنے والے اور ہنس مکھ انسان ہیں۔

سوال: سنا ہے سندھی مرد سخت مزاج ہوتے ہیں؟ تو آپ کو شادی سے پہلے ڈر یا خوف نہیں تھا؟

حمیراچنا: (مسکراتے ہوئے) آپ نے صحیح کہا ہے کہ سندھی مرد گھر کے معاملے میں بڑے سخت ہوتے ہیں مگر مجھے ڈر یا خوف اس لیے نہیں آیا ایک تو میرے کزن تھے اور دوسرا میں ان کے مزاج سے واقف تھی۔

سوال: منگنی کے دنوں میں کبھی انہوں نے آپ کو کوئی تحفہ دیا؟

حمیراچنا: بالکل نہیں اور ایسا ممکن بھی نہیں تھا اور ایسی چیزوں کی ہمارے ہاں حوصلہ افزائی بھی نہیں کی جاتی ہاں ویسے عید تہوار پر ان کے گھر والوں کی طرف سے تحفے تحائف آتے رہتے ہیں۔

سوال: شادی کی خریداری آپ نے خود کی؟

حمیراچنا: نہیں۔ شادی کی ساری تیاری امی اور بہنوں نے کی۔ میں تو پہلے بھی کبھی بازار نہیں جاتی۔ جب بھی خود خریداری کا شوق آتا تو میں خوب دوپٹہ لپیٹ کر جاتی۔

سوال: شادی کے اہتمام کے بارے میں کوئی خواہش تھی؟

حمیراچنا: (زیرلب مسکراتے ہوئے) جی ہاں میری خواہش تھی کہ میری شادی پر تمام رسمیں ہوں اور میں نے اپنی بہنوں کو کہہ دیا تھا کہ میری شادی پر ساری رسمیں ہونی چاہئیں۔ میری سوتیلی بہنیں حیدرآباد میں ہی رہتی ہیں۔ میرے والد نے دو شادیاں کی ہوئی ہیں اکثر سندھی مردوں میں دو شادیوں کی روایت ہے۔ خیر میری شادی پر تمام رسمیں ہوئیں اور بڑے بھرپور طریقے

سے ہوئیں۔

سوال: شادی پر آپ نے شوبز کے لوگوں کو دعوت کیوں نہیں دی؟

حمیرا چنا: اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ میرا فیملی فنکشن تھا اور پھر میری شادی حیدر آباد میں ہی ہو رہی تھی۔ ہم لوگوں نے وہاں جا کر تقریب کی۔

سوال: شادی پر رسمیں کون کون سی ہوئیں؟

حمیرا چنا: (ہنستے ہوئے) بہت مزے کی رسمیں ہیں۔ بہت ہلا گلا رہا جب بارات آتی ہے تو دلہن کی بہنیں اور کزنیں دولہا کا راستہ لال ڈوری سے روکتی ہیں۔ دولہا ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی کھڑی کر کے اپنا بازو اونچا کر لیتا ہے دلہن کی بہنوں اور کزن وغیرہ نے اس انگلی میں ڈوری ڈالنی ہوتی ہے۔ اس کے بعد دولہا پنڈال میں داخل ہوتا ہے میرے شوہر کا قد بھی اچھا خاصا لمبا تھا۔ دوسرا اس نے بازو بھی اونچا کیا ہوا تھا۔ لڑکیاں اچھل اچھل کر تھک گئیں مگر وہ لال ڈوری انگلی میں نہ ڈال سکیں۔ دوسری طرف دولہا کے دوست شور مچائیں کہ بازو اور اونچا کرو خیر دولہا کو ہی ترس آ گیا تو اس نے ہاتھ نیچا کیا۔ پھر لڑکیوں نے ڈوری انگلی میں ڈالی اور اس کو لے کر اندر آئیں۔ اس کے بعد مٹی کے کٹورے رکھے ہوتے ہیں دولہا پاؤں سے ان کو توڑتا ہے پھر جو خوبصورت کشیدہ کاری کی رنگ برنگ منفرد دریاں بچھی ہوتی ہیں اس پر جا کر بیٹھتا ہے۔ جب دولہن کو لایا جاتا ہے تو پھر دونوں کو بیٹھا کر رسمیں کی جاتی ہیں۔ ایک رسم ایسی ہے کہ ایک خاتون روٹی توڑ توڑ کر جیسے نوٹ پھینکے جاتے ہیں اس انداز میں دلہن کے سر پر پھینکتی ہے اور دولہا اس روٹی کو چنتا ہے بہت شور مچتا ہے۔ دولہا چن چن کر تھک جاتا ہے ہنس ہنس کر سب کا برا حال ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دلہن کے ہاتھ میں ایک چھوہارا رکھ کر اس کی مٹھی بند کرنے کا کہا جاتا ہے۔ دلہن پوری طاقت سے مٹھی بند کر لیتی ہے اب دولہا نے وہ مٹھی انگلیوں کی طرف سے یوں کھولنی ہوتی ہے کہ چاروں انگلیاں اکٹھی ہی کھلیں ایسے مٹھی کھولنا واقعی بہت مشکل ہوتا ہے مقصود نے بہت کوشش کی، آخر میں نے خود ہی ہاتھ ڈھیلا کر دیا مگر اس رسم کو بھی بہت انجوائے کیا پھر ایک پلیٹ چاولوں کی رکھی دولہا دونوں ہاتھوں سے چاول اٹھاتا ہے اور دلہن کے ہاتھوں میں دیتا ہے۔ پھر دلہن بھی ویسا کرتی ہے اس میں احتیاط یہ ہوتی ہے کہ چاول کا ایک دانہ بھی نہ گرے پھر دولہا دلہن کے ہاتھوں میں شیشوں والی خوبصورت ہاتھ والی پنکھی دی جاتی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو اس پنکھی سے ہوا دیتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایک رسم لاؤن ہوتی ہے اس میں دولہا دلہن کو آمنے سامنے بیٹھا دیا جاتا ہے پھر عزیز رشتے دار دوست سہیلیاں آ کر دولہا اور دلہن سر آپس میں ٹکراتے ہیں پھر ان کے چہروں پر نوٹ وارتے ہیں۔ اس موقع پر دولہا کے دوست اور دلہن کی سہیلیاں شرارت کرتی ہیں وہ خوب زور سے ایک دوسرے کا سر آپس میں ٹکراتے ہیں۔ پھر دولہا دلہن کے سامنے شیشہ رکھا جاتا ہے اور اوپر چادر تانی جاتی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے ہیں پھر دلہن کا گھونگھٹ اٹھا کر اس کو سٹیج پر بیٹھا دیا جاتا ہے۔

سوال: کیا دودھ پلائی کی رسم ہوتی ہے؟

حمیرا چنا: جی ہاں ہمارے یہاں دودھ پلائی کی رسم بھی مختلف انداز میں ہوتی ہے۔ اس میں دولہا کے علاوہ اس کے دوست بھی دودھ پی لیتے ہیں۔ وہ سب دلہن والوں سے پیسوں کی ڈیمانڈ کرتے ہیں۔

سوال: آپ نے اپنی شادی پر گانے گائے؟

حمیرا چنا: میں نے گانے تو نہیں گائے مگر نعتیں قصیدے ضرور پڑے۔ ہوا یوں جب ہم لاہور سے حیدر آباد پہنچے تو سب نے کہا ڈھولکی

لائیں وہ بجاتے ہیں رات کو تیل مہندی کی رسم تھی۔ مگر جس کمرے میں ڈھولکی تھی اس کمرے کو لاک لگ گیا اور چابی بھی گم ہو گئی بعض اوقات ایسی باتیں ہو جاتی ہیں کہ انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے چابی لگانے والے کو لینے گئے وہ بھی نہیں ملا۔ اسی دوران میری نظر دوسرے کمرے میں رکھے ہوئے مائیک پر پڑی جس کے ساتھ سپیکر کا ایک چھوٹا سسٹم تھا اصل میں ہمارے گھر کے پاس مسجد تھی اور یہ مائیک اور سسٹم مسجد میں نعتیں پڑھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا میں نے مائیک اون کیا اور بے اختیار نعتیں پڑھنی شروع ہو گئی میں نے قصیدے بھی پڑھے کمرے کے سامنے علم تھا وہاں سے اگربتیوں کی خوشبو آنے لگی پورا گھر مہک اٹھا سب لوگ خاموشی سے بیٹھ گئے اور ایک محفل سی بچ گئی جیسے عام گھروں میں شادی کی تقریب سے پہلے قرآن خوانی کرائی جاتی ہے میں نے اپنی شادی کی تقریب کا آغاز نعتیں پڑھ کر کیا مجھے یہ بات بہت اچھی لگی اور یہ سب خود بخود ہوا ایسا ذہن میں کچھ نہیں تھا۔

سوال: شادی کے حوالے سے کوئی اور خاص بات بتائیں؟

حمیرا چنا: (قہقہہ لگاتے ہوئے) جناب گرمی بہت تھی اور پھر حیدرآباد کی گرمی۔

سوال: آپ کو رونمائی کا تحفہ ملا؟

حمیرا چنا: مجھے انہوں نے ہیرے کی انگوٹھی دی تھی۔

سوال: آپ نے بھی ان کو کوئی تحفہ دیا؟

حمیرا چنا: جی ہاں میں بیرون ملک سے ٹائی کا سیٹ لے کر آئی تھی پرفیوم اور ٹائی سیٹ دیا۔

سوال: شادی کے بعد انہوں نے آپ سے گانے کی فرمائش کی؟

حمیرا چنا: (مسکراتے ہوئے) جی ہاں ولیمے کے بعد جب میں امی کے گھر سے سسرال گئی تو انہوں نے مجھ سے گانے کی فرمائش کی گانے کے بول یہ ہیں "آ پیار دل میں جاگا"

سوال: گانے کی فرمائش اکثر کرتے ہیں؟

حمیرا چنا: جی ہاں میری دو کیسٹ سندھی گانوں کی ہیں۔ اکثر ان کیسٹ کے گانوں کی فرمائش کرتے ہیں (مسکراتے ہوئے) ان کو میری آواز بہت پسند ہے۔

سوال: آپ کے علاوہ بھی کسی گلوکار کو سنتے ہیں؟

حمیرا چنا: جی ہاں ان کو نصرت فتح علی خان کی آواز بہت پسند ہے۔ اچھا میوزک شوق سے سنتے ہیں۔

سوال: کبھی آپ نے بھی ان سے گانے کی فرمائش کی؟

حمیرا چنا: جی ہاں ایک دن میں اور میرا بھائی عدنان گانے کی ٹون بنا رہے تھے مقصود بھی ہمارے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔ میں نے ان سے کہہ کر ہم نے جو ٹون بنائی ہے وہ گا کر سنائیں پہلے تو انہوں نے انکار کیا مگر ہمارے اصرار پر انہوں نے گایا اور ہم سب نے بہت انجوائے کیا۔

حمیرا چنا: مقصود بہت تعاون کرنے والے ہیں میرے مزاج اور میرے کام کی ضرورت کو سمجھتے ہیں دیر سویر سے گھر آنے جانے پر کبھی شکایت نہیں کی۔ ہلکی سی بھی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ میں نے ان کو بہت اچھا جیون ساتھی پایا کبھی کسی کام میں رکاوٹ نہیں بنے۔ کبھی روک ٹوک نہیں کی ہمیشہ میری خواہش کا احترام کیا۔ کبھی اپنی مرضی کو مجھ پر مسلط نہیں کیا مجھے ہر کام کرنے کی

مکمل آزادی ہے مگر میں ایک حد کے اندر رہ کر کام کرتی ہوں، انہوں نے کبھی غصہ نہیں کیا۔

سوال: ان کے مزاج کی خاص بات کون سی ہے؟

حمیرا چنا: (مسکراتے ہوئے) بہت شرمیلے ہیں۔

سوال: گپ شپ لگاتے ہیں؟

حمیرا چنا: جی ہاں بور کرنے والی شخصیت نہیں ہیں۔ بڑی متوازن سی شخصیت کے مالک ہیں۔ بہت خوش اخلاق ہیں۔

سوال: آپ کے میاں کیا کاروبار کرتے ہیں؟

حمیرا چنا: وہ کنسٹرکشن کا کام کرتے ہیں

سوال: جب دوسرے شہر جاتے ہیں تو فون پر آپ سے رابطہ کرتے ہیں؟

حمیرا چنا: بالکل بہت فون کرتے ہیں

سوال: آپ دونوں کی کون سی عادتیں نہیں ملتیں؟

حمیرا چنا: (مسکراتے ہوئے) میں تعریف کے معاملے میں کچھ کمزور ہوں جبکہ وہ میری بہت تعریف کرتے ہیں اور ہر اچھی چیز کی تعریف کرتے ہیں۔

سوال: بناؤ سنگھار کی فرمائش کرتے ہیں؟

حمیرا چنا: وہ بہت سادگی پسند ہیں، میرا مزاج بھی ایسا ہے میں گھر میں ملنگوں کی طرح رہتی ہوں۔

سوال: آپ دونوں کس زبان میں بات کرتے ہیں؟

حمیرا چنا: اردو اور سندھی زبان میں بات کرتے ہیں ویسے آج کل پنجابی بولنا بھی سیکھ رہے ہیں ٹوٹی پھوٹی پنجابی بھی بول لیتے ہیں۔

سوال: کھانا آپ پکاتی ہیں؟

حمیرا چنا: جی ہاں کھانا میرے ہاتھ کا پکا ہی پسند کرتے ہیں۔ اور میں ان کے لیے کھانا شوق سے پکاتی ہوں۔

سوال: کھانے میں کیا چیز شوق سے کھاتے ہیں؟

حمیرا چنا: ان کو شملہ مرچ اور گوشت کے علاوہ شامی کباب بہت پسند ہیں۔

سوال: آپ ان کو اور وہ آپ کو کس نام سے مخاطب کرتے ہیں۔

حمیرا چنا: میں ان کو تصو کہہ کر مخاطب کرتی ہوں جب کہ وہ مجھے بو کہتے ہیں میرا یہ نام میری نانی نے رکھا ہے مجھے سب چھوٹے بڑے اس نام سے ہی مخاطب کرتے ہیں جب میرے بھائی کے گھر بیٹی ہوئی تو میں نے بڑی کوشش کی کہ اس کو پھوپھو کہنا سکھاؤں مگر اس نے بھی بو ہی سیکھا۔

سوال: شوہر کا کون سا کام جو آپ شوق سے کرتی ہیں۔

حمیرا چنا: میری خواہش ہوتی ہے کہ ان کے سارے کام میں اپنے ہاتھوں سے کروں۔ میں ان کے کپڑے بھی استری کرتی ہوں۔ اپنی پسند کا لباس پہننے کو دیتی ہوں۔

سوال: ان کو کس چیز کا بہت شوق ہے؟

حمیرا چنا: ان کو کپڑوں کا بہت شوق ہے اور مجھے اچھے کپڑے پہننے کا بہت شوق ہے۔

سوال: کبھی وہ آپ کے لیے پریزائیڈنگ گفٹ لائے۔

حمیرا چنا: جی ہاں وہ میرے لیے کپڑے لے کر آتے ہیں ان کی چوائس بہت اچھی ہے جیسے رنگ میں پہنتی ہوں وہ وہی لے کر آتے ہیں، شادی سے پہلے امی میرے لیے خریداری کرتی تھیں۔ شادی کے بعد شوہر کی طرف سے یہ سہولت مل گئی۔

سوال: شادی کے بعد سیر کے لیے کہاں گئے۔

حمیرا چنا: ہم لوگ حیدرآباد میں ہی ایک سیرگاہ ہے وہاں ایک جھیل ہے ہم لوگ وہاں گئے کہیں اور جا نہیں سکے کیوں کہ میری شوبز کی مصروفیات آڑے آگئیں۔

سوال: گھریلو معاملات میں فیصلے کا اختیار کس کو ہے؟

حمیرا چنا: ہمارے گھر میں جمہوریت ہے ہم دونوں ایک دوسرے کی خواہش کا احترام کرتے ہیں۔ ویسے کوئی اہم فیصلہ ہو تو ہم دونوں کے مشورے سے ہوتا ہے۔ کبھی بات منوا لیتی ہوں کبھی ان کی مان لیتی ہوں۔

سوال: آپ ان سے جیب خرچ لیتی ہیں؟

حمیرا چنا: (قہقہہ لگاتے ہوئے) جب وہ گھر آتے ہیں میں ان کی جیب خالی کروا لیتی ہوں اور ان سے کہتی ہوں آپ کو ضرورت ہو تو مجھ سے لے لینا۔

سوال: شادی کے بعد آپ نے اپنی کون سی عادت تبدیل کی؟

حمیرا چنا: سونے کی۔ شادی سے پہلے بہت سوتی تھی اب جلدی اٹھ جاتی ہوں ایک بیٹی کی ماں بھی ہوں اس کے اٹھتے ہی میں بھی اٹھ جاتی ہوں۔

سوال: جب گھر پر ہوں تو ان کی کیا مصروفیت ہوتی ہیں

حمیرا چنا: مقصود زیادہ تر عدنان کی کمپنی میں رہتے ہیں۔ میرا بھائی شاہد تو ان کا بہنوئی ہے ان کے ساتھ بھی ان کا اچھا وقت گزرتا ہے شفقت بھائی کے ساتھ بھی بہت اچھی دوستی ہے اور اس چیز کا مجھے بہت فائدہ ہے کیونکہ جب میں ریکارڈنگ کے سلسلہ میں گھر سے چلی جاتی ہوں تو مقصود بور نہیں ہوتے، ان کا اچھا وقت گزرتا ہے۔

سوال: بیٹی کا نام کیا ہے؟

حمیرا چنا: میری بیٹی کا نام اقراء ہے اور وہ چھ ماہ کی ہے۔ میں نے اپنی بیٹی کے لیے دو نام منتخب کئے ایک اقراء اور دوسرا عشاء پھر مقصود نے کہا اقراء رکھتے ہیں میں نے اپنے مرشد جوادچ شریف کے گدی نشین ہیں ان کو بتایا تو انہوں نے اقراء کے ساتھ نصیب کا اضافہ کیا، اب اس کا نام اقرا نصیب ہے۔

سوال: آپ لوگوں کی بیٹی یا بیٹے کی خواہش تھی

حمیرا چنا: میرا تو یہ تھا کہ بیٹا ہو یا بیٹی اللہ کا عطا کیا ہوا تحفہ ہے جبکہ میرے شوہر کی خواہش تھی کہ پہلا بیٹا ہو مگر جب بیٹی ہوئی تو وہ اس پر بھی بہت خوش ہوئے۔ بیٹی تو اللہ کی رحمت ہے۔ بیٹی سے بہت پیار کرتے ہیں حالانکہ میں بھی بہت پیار کرتی ہوں۔ مگر بیٹی نے بابا کہنا پہلے سیکھا۔

سوال: بیٹی کو کتنا وقت دیتی ہیں۔

حمیرا چنا: بس یہی کمی ہے مجھ میں شوبز کی مصروفیت کی وجہ سے بیٹی کو وقت نہیں دے پاتی۔ میری بیٹی کو میری والدہ ہی پال رہی ہیں۔ وہ

بہت خیال رکھتی ہیں۔ اس عمر میں بھی وہ بچے پال رہی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ میری والدہ کی محبت ہے۔ اقراء سے بہت پیار کرتی ہیں۔ جتنا اچھا انہوں نے اقراء کو رکھا ہے۔ میں ماں ہونے کے ناطے بھی اتنا نہیں کر سکتی تھی۔ میری والدہ میرا بہت ساتھ دے رہی ہیں۔

سوال: مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا خواہش ہے؟

حمیرا چنا: اب میرا مستقبل میرے فن سے وابستہ ہے اللہ تعالیٰ نے خیال رکھنے والا اور اچھی سوچ کا مالک شوہر عطا کیا ہے عورت کے لیے اس کی ازدواجی زندگی بھی بہت اہم ہوتی ہے۔ اچھے شوہر کے ساتھ ایک بیٹی بھی اس نے عطا کر دی ہے یوں ایک عورت ہونے کے ناطے میری شخصیت کی تکمیل ہو گئی ہے۔ اب میری فیملی مکمل ہے اور ہم بہت خوش ہیں۔ اب میں اپنے فنی سفر کو ترجیح دیتی ہوں۔ اللہ نے بہت عزت اور شہرت دی ہے مگر میں اسی مقام پر ٹھہرنا نہیں چاہتی بلکہ اس سے آگے جانا چاہتی ہوں۔ میں نے اس سلسلے میں کچھ منصوبہ بندی کی ہوئی ہے۔ میری کوئی اردو کیسٹ نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں فلمی سنگر تھی۔ فلمی مصروفیات بھی بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے کیسٹ کے لیے وقت ہی نہیں ملا، مصروفیات تو اب بھی ویسی ہیں مگر کیسٹ کی تیاری کے لیے بھی وقت نکال رہی ہوں۔ بہت جلد کیسٹ کی ریکارڈنگ مکمل کر لوں گی اور پھر اس کا ویڈیو مارکیٹ میں لاؤں گی۔

❁❁❁


# کتاب گھر کا پیغام

آپ تک بہترین اردو کتابیں پہنچانے کے لیے ہمیں آپ ہی کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم کتاب گھر کو اردو کی سب سے بڑی لائبریری بنانا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے ہمیں بہت ساری کتابیں کمپوز کروانا پڑیں گی اور اسکے لیے مالی وسائل درکار ہوں گے۔ اگر آپ ہماری براہ راست مدد کرنا چاہیں تو ہم سے kitaab_ghar@yahoo.com پر رابطہ کریں۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو کتاب گھر پر موجود ADs کے ذریعے ہمارے سپانسرز ویب سائٹس کو وزٹ کیجیے، آپکی یہی مدد کافی ہوگی۔

یاد رہے، کتاب گھر کو صرف آپ بہتر بنا سکتے ہیں۔

# میلوڈی کوئین

## شاہدہ منی

میں گلوکارہ نہ بنتی تو میرا فن اور شخصیت دونوں ادھورے رہتے، شاہدہ منی نے یہ بات ایک انٹرویو کے دوران گفتگو کرتے ہوئے کہی۔ شاہدہ نے کہا کہ گلوکاری کا شوق مجھے بچپن ہی سے تھا۔ بہت چھوٹی سی تھی جب میں ملکہ ترنم کے گانے گنگنایا کرتی تھی۔ گائیکی کا شوق مجھے ٹی وی تک لے آیا ٹی وی پر گلوکاری کر کے میں شہرت اور مقبولیت حاصل کر رہی تھی کہ مجھے فلموں میں اداکاری کے مواقع حاصل ہوگئے اور میں اداکارہ بن گئی۔ فلموں میں مجھے اچھے اچھے کردار پر کام کرنے کو ملا جس سے بحیثیت ایکٹریس شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اداکارہ کی حیثیت سے شہرت و مقبولیت نے میری گلوکاری کو متاثر کیا۔ سٹوڈیوز کی تیز روشنیاں گلیمر مختلف کرداروں کی پرفارمنس کے لیے جذبات و احساسات اور تاثرات کے اظہار کے حوالوں سے انتھک محنت اور لگن نے مجھے ایک مکمل پرفارمر تو بنا دیا اس کے باوجود میرے اندر گائیکی کا جو جنون اور جذبہ تھا بدستور موجزن رہا۔ اداکاری کے باوجود گائیکی میرے شعور اور لاشعور میں پروان چڑھتی رہی۔ شاہدہ منی نے بتایا کہ جب میں اداکارہ کی حیثیت سے عروج پر تھی اس دور میں میری ذات میں چھپی ہوئی اداکارہ اور گلوکارہ کے درمیان اکثر کشمکش رہا کرتی تھی اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ گلوکاری کا جنون، اداکاری کے پروفیشن پر حاوی آ گیا اور میں نے اداکاری سے کنارہ کشی اختیار کر کے پوری توجہ گلوکاری کی طرف مبذول کر لی۔ دو تین برس تک فن موسیقی کے اساتذہ سے اس فن کے رموز سیکھنے' سخت ریاضت کی۔ میں نے جب گلوکاری کا باقاعدہ آغاز کیا تو موسیقی اور گلوکاری کی دنیا میں سخت مقابلے کا دور تھا۔ گائیکی کی مختلف اصناف کے درمیان اتار چڑھاؤ اور مسابقت جاری تھی ایک طرف فوک میوزک میں نئے نئے انداز پروان چڑھ رہے تھے تو دوسری طرف پاپ میوزک اپنی یلغار کیے ہوئے تھا۔ فوک اور پاپ کی کشمکش کے درمیان ہماری کلاسیکی موسیقی کے اساتذہ اور فنکار اس کے رچاؤ نکھار تاثرات اور اثر انگیزی کو برقرار رکھنے میں کوشاں تھے۔

شاہدہ منی نے کہا کہ ان حالات میں موسیقی کی دنیا میں قدم جمانا انتہائی مشکل اور صبر آزما تھا۔ موسیقی کی ان مختلف لہروں میں کوئی سمت اختیار کرنا بڑی سمجھ بوجھ کا کام تھا۔ میں نے اس کی لہر میں بہہ جانے کی بجائے موسیقی کے بحر بیکراں میں اپنے لیے ایسا راستہ تلاش کیا کہ موسیقی کے سمندر کی مروجہ لہروں کو ایک ساتھ لے کر چلوں، چنانچہ میں نے فوک، پاپ اور مشرقی موسیقی کے امتزاج کا راستہ اپنایا میں کوشش کرتی ہوں کہ میری گائیکی میں یہ تینوں رنگ موجود ہوں۔ اپنے پرستاروں کی چاہت کی بدولت مجھے اب تک جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں، پاپ اور کلاسیکی موسیقی کے امتزاج کی بدولت ہوئی ہیں مستقبل میں بھی میں ان تینوں اصناف کو ایک ساتھ لے کر چلنا چاہتی ہوں۔

شاہدہ منی نے کہا کہ آج کا دور ورسٹائلیٹی کا دور ہے جس طرح اداکار کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر قسم کے کردار پر فام کرنے پر عبور رکھتا ہو اسی طرح گلوکار کے لیے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ وہ گائیکی کے مختلف انداز جانتا ہو الیکٹرانک میڈیا کی ترقی اور فروغ کی بدولت اب لوگوں کو ہر قسم کی موسیقی اور گائیکی سننے کو ملتی ہے لوگ اب مختلف انداز کی گلوکاری سے محظوظ ہونا چاہتے ہیں۔ گزشتہ برسوں کے دوران کئی گلوکار اور گلوکارائیں اپنے انداز میں تبدیلی نہ لانے کی وجہ سے گمنامی کے اندھیروں میں گم ہو چکے ہیں۔ شاہدہ منی نے کہا کہ بدلتے ہوئے حالات میں گلوکاری کے معیار کو

برقرار رکھنے کے لیے محنت ریاضت اور تخلیقی عمل کو اپنانے کی اشد ضرورت ہے۔

ایک سوال کے جواب میں شاہدہ منی نے بتایا کہ اپنے فنی کیریئر کے ابتدائی دور میں گلوکاری ترک کر کے اداکاری میں قدم رکھ کر میں نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ اداکاری نے مجھے جذبات و احساسات اور تاثرات کے اظہار کا طریقہ اور سلیقہ سکھایا، میک اپ، ہیئر سٹائلز اور ڈریسز کے نئے انداز سمجھنے کے مواقع میسر آئے۔ گلیمر میں رہنے کا موقع ملا۔ فلموں میں کام کرتے وقت مجھے اس بات کا بالکل احساس اور شعور نہیں تھا کہ کل کو یہ تمام چیزیں اور پہلی گلوکارہ کی حیثیت سے میری پرفارمنس کو سنوارنے نکھارنے اور دلکش بنانے میں معاون ثابت ہوں گی۔ اداکارہ کی حیثیت سے یہ احساس نہیں تھا کہ الیکٹرانک میڈیا اتنی ترقی کر جائے گا کہ گلوکاری سننے کے علاوہ دیکھنے کا فن بھی بن جائے گا اور یوں گائیکی کے لیے بھی انہی امور اور لوازمات کی ضرورت ہوگی جو فلموں اور ٹی وی ڈراموں میں پرفارمنس کے لیے درکار ہوتے ہیں۔ اداکارہ کی حیثیت سے گلیمر بناؤ سنگھار اور جذبات و احساسات کے اظہار کے حوالوں سے میں نے جو کچھ سیکھا تھا وہ آج گائیکی میں میرے کام آ رہا ہے میں نے سٹیج اور ٹی وی پرفارمنس کو نیا انداز اور اداکارہ کی حیثیت میں آئے دن اپنے انداز اور گائیکی کے اسالیب میں مزید تبدیلیاں اور نکھار پیدا کرتی رہتی ہوں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ گلوکارائیں میرے انداز کو اپنانے اور کاپی کرنے میں کوشاں رہتی ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں شاہدہ منی نے کہا کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موسیقی کی مختلف اصناف کی مقبولیت سے ہماری مشرقی موسیقی پس پشت جاری ہے۔ صورتحال یہ ہے کہ جن گھرانوں کے نوجوان پاپ اور فوک موسیقی کی طرف راغب ہو رہے ہیں میں سمجھتی ہوں کہ یہ سب وقتی طور پر ہے۔ کلاسیکی موسیقی کی بنیادیں مضبوط ہیں اس کا فروغ بڑے بڑے اساتذہ کی برس ہا برس کی محنت اور کاوشوں سے عمل میں آیا ہے۔ اگر موسیقی کے مختلف گھرانوں کے نوجوانوں کے پاپ اور فوک نغمات کو غور سے سنا جائے تو ان میں بھی کلاسیکی انگ اور انداز سنائی دیتا ہے۔ اس عمل کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کلاسیکی موسیقی کو بنیاد بنا کر پاپ اور فوک گائیکی کو نیا پن دیا جا رہا ہے۔ اس عمل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نئی پود جو پاپ اور فوک سننے کی شوقین ہے) کے کانوں میں کلاسیکی موسیقی بھی پہنچتی رہے گی اور ایک وقت آئے گا جب کلاسیکی موسیقی اور گائیکی اپنے تاثر کی پختگی اور ہمیشگی کی بنا پر ان کے دلوں میں گھر کر جائے گی اور وہ ہر قسم کی گائیکی چھوڑ کر مشرقی موسیقی کی طرف راغب ہو جائیں گے۔ ایک سوال کے جواب میں شاہدہ نے بتایا کہ میری تو خواہش اور کوشش ہے کہ ہماری موسیقی کا کھویا ہوا مقام واپس آئے یہ مقام فنکاروں کی محنت اور فنی لگن سے ہی واپس لایا جا سکتا ہے۔ ہماری فلمی موسیقی عرصہ سے زوال پذیر ہے، ماضی میں موسیقی کی ترقی اور فروغ میں فلمی موسیقی کا اہم حصہ ہوتا تھا فلموں کے لیے ہر قسم کی موسیقی تخلیق ہوا کرتی تھی وہ ہلکے پھلکے رومانوی نغمات کے علاوہ کلاسیکی اور نیم کلاسیکی گیت بھی فلموں میں پیش کیے جاتے تھے موسیقی کے موضوع پر خصوصی فلمیں بھی بنائی جاتی تھیں ان فلموں کے ذریعے مختلف کلاسیکی راگ راگنیوں پر کمپوز کیے ہوئے گانے لوگوں کو سننے کے لیے میسر آتے تھے۔ یوں عام آدمی بھی اچھی موسیقی سے آشنا رہتا تھا اب فلموں میں سے اچھی اچھی موسیقی کا سلسلہ مفقود سا ہو کر رہ گیا ہے۔ چربہ موسیقی نے بھی فلمی موسیقی کو بہت نقصان پہنچایا ہے فلمی موسیقی کے حوالوں سے یہ تمام صورتحال افسوسناک ہے۔ شاہدہ منی نے بتایا کہ فلمی صنعت میرا ادارہ ہے اس کی بدولت مجھے عزت اور شہرت حاصل ہوئی جو آج گلوکارہ کی حیثیت سے بھی میرے کام آ رہی ہے۔

مجھے مختلف موسیقاروں اور ہدایت کاروں کی طرف فلموں کے لیے پلے بیک گانوں کی آفر ز ہوتی رہتی ہے۔ ان گانوں کا معیار چونکہ بہتر نہیں ہوتا اس لیے میں نے اب پلے بیک گلوکاری نہیں کی اگر مجھے فلموں کے لیے معیاری نغمات کی آفر ہوئی تو میں فلمی گلوکاری بھی ضرور کروں گی۔ شاہدہ نے کہا کہ جہاں تک فلموں کے لیے موسیقی کمپوز کرنے کا تعلق ہے اس حوالے سے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں ابھی میں اپنی پوری توجہ گلوکاری ہی کی طرف مبذول رکھنا چاہتی ہوں۔ اگر کبھی حالات اور دل و دماغ نے اجازت دی تو شاید میں فلموں کے لیے موسیقی کمپوز کروں۔ ابھی تو میں خود کو موسیقی کی طالبہ تصور کرتی ہوں۔ مجھے اس فن میں بہت کچھ کرنا اور سیکھنا ہے۔

ایک سوال کے جواب میں شاہدہ منی نے بتایا کہ ملکہ ترنم نور جہاں اور استاد نصرت فتح علی خان لیجنڈ فنکار تھے انہوں نے لازوال موسیقی اور

گائیکی تخلیق کی میں ان دونوں عظیم فنکاروں سے بہت متاثر اور انسپائر ہوں ان کا فن صدیوں لوگوں کو محظوظ کرتا رہے گا اور گلوکاری اور موسیقی میں آنے والی نسلیں ان کے فن سے اکتساب حاصل کرتی رہیں گی۔شاہدہ نے کہا کہ ملکہ ترنم گلوکاری میں تلفظ ادائیگی اور آواز کے زیر بام اس تاثر سے پرفارم کرتی تھیں کہ الفاظ تصاویر کی صورت میں آنکھوں کے سامنے آ جاتے تھے ایسے فنکار کسی قوم اور معاشرے کا ثقافتی ورثہ ہوتے ہیں اس ورثہ کو زوال نہیں ہوتا۔شاہدہ نے کہا کہ ملکہ ترنم اور استاد نصرت فتح علی خان کا فن تو ہمیشہ زندہ تابندہ رہے گا۔لیکن ان کے بعد سر اور لے کا سنگم سا گیا ہے اب سر لے اور نغمگی سے لبریز گانے اور گیت سننے کو دل ترستا رہتا ہے انہوں نے کہا کہ میری خواہش اور دعا ہے کہ اللہ تعالی مجھے ملکہ ترنم جیسی شہرت اور مقبولیت عطاء کرے۔

گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے شاہدہ منی نے کہا کہ میرے نزدیک فن کی دنیا میں کامیابی کے تسلسل کو جاری رکھنے کے لیے سخت محنت اور ریاضت کے ساتھ ساتھ عاجزی اور انکساری کی بھی ضرورت ہوتی ہے انسان جتنا جھکے اللہ اسے اتنی ہی بلندیوں سے ہمکنار کرتا ہے میں رفاہی اور فلاحی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہوں میری کوشش ہوتی ہے کہ ان کاموں کی غیر ضروری طور پر تشہیر نہ ہو۔دوسرے گلوکاروں کی طرح فلاح و بہبود ے ادارے قائم کرنے کا فی الحال تو مجھے کوئی شوق نہیں ہمارے ہاں فنکاروں کے حوالوں سے تو ایک روایت چل پڑی ہے میں اس قسم کے اداروں کی قائل نہیں۔

شاہدہ نے بتایا کہ میری دو البم ساسوں ماتگے ککڑی اور تیرے عشق نچایا مارکیٹ میں آ چکی ہیں ان کے لوئنچ بین الاقوامی سطح پر بھی ہوئے ہیں۔میرے نغمات کے ویڈیو بھی تیار ہوئے ہیں۔میری ویب سائیڈ بھی ہے جس میں میرے تمام نغمات موجود ہیں۔انہوں نے بتایا کہ میری محنت اور ریاضت جاری وساری ہے۔میں موسیقی کے فن میں بہت آگے جانا چاہتی ہوں۔ملکی حدود کے بعد میں اب بین الاقوامی سطح پر فن کے ذریعے ملک وقوم کی خدمت اور شناخت کے لیے کام کر رہی ہوں۔

❀❀❀

# ختم شد

❀❀❀


## اک دیا جلائے رکھنا

جو چلے تو جاں سے گزر گئے اور میرے خواب ریزہ ریزہ جیسے خوبصورت ناولوں کی مصنفہ ماہا ملک کی ایک اور خوبصورت تخلیق۔شہرہ آفاق ناول ایک دیا جلائے رکھنا بہت جلد کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا، جسے **رومانی معاشرتی ناول** سیکشن میں پڑھا جاسکے گا۔

# استفادہ

1- اسلامی تعلیمات اور موسیقی — ڈاکٹر ہمایوں عباس شمس
2- موسیقی روح کی غذا یا روح کو سزا — بنت اسلام
3- جدید موسیقی اور ہماری تہذیب وثقافت — خواجہ محمد بشیر بٹ
4- کلاسیکی موسیقی کی روایت دم توڑ رہی ہے — خالد بزاد ہاشمی
5- انٹرویو استاد سلامت علی خان — اصغر ملک

گلوکاروں اور گلوکاراؤں کے انٹرویوز کے حوالے سے جن رائٹرز کی تحریروں سے استفادہ کیا گیا ان کے نام ذیل میں درج ہیں۔
شازیہ انور' سعدیہ جمیل' ایس ایم ممتاز' طاہر انجم' عاطف اعوان' جاوید علوی' سیف اللہ سپرا' طارق حمید' ہما صدف' محسن جعفر' رضوان سیٹھی' شہلا نرگس' بابرہ رضوی' فریال رشید' خالد چودھری' اشفاق بھٹی' قرۃ العین' فرزانہ شہزاد' عاشق چوہدری' سید محمد علی' خورشید انجم' مقصود گوہر۔

❁❁❁


## فاصلوں کا زہر

طاہر جاوید مغل کا خوبصورت ناول۔ محبت جیسے لازوال جذبے کا بیان۔ دیارِ غیر میں رہنے والوں کا اپنے دیس اور وطن سے تعلق اور اٹوٹ رشتوں پر مشتمل ایک خوبصورت تحریر۔ ان لوگوں کا احوال جو کہیں بھی جائیں، اپنا وطن اور اپنا اصل ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔
ناول فاصلوں کا زہر بہت جلد کتاب گھر پر پیش کیا جائے گا، جسے **رومانی معاشرتی ناول** سیکشن میں پڑھا جا سکے گا۔